MAIS313DST

اسلامی عقائد، عبادات اور معاملات

(Islamic Beliefs, Rituals & Obligations)

ایم۔ اے۔ (اسلامک اسٹڈیز)

(تیسرا سمسٹر)

نظامت فاصلاتی تعلیم
مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی
حیدرآباد-32، تلنگانہ- بھارت

© Maulana Azad National Urdu University, Hyderabad

Course: Islamic Beliefs, Rituals & Obligations
ISBN: 978-81-974230-7-9
First Edition: June, 2024

Publisher : Registrar, Maulana Azad National Urdu University
Publication : 2024
Copies : 800
Price : 235/-(The price of the book is included in admission fees of distance mode students)
Copy Editing : Dr. Mohammad Haziq, DDE, MANUU, Hyderabad
Cover Designing : Dr. Mohd Akmal Khan, DDE, MANUU, Hyderabad
Printer : Print Time & Business Enterprises, Hyderabad

Masters in Islamic Studies
Islamic Beliefs, Rituals & Obligations
3rd Semester

On behalf of the Registrar, Published by:
Directorate of Distance Education
Maulana Azad National Urdu University
Gachibowli, Hyderabad-500032 (TS), India
*Director:*dir.dde@manuu.edu.in*Publication:*ddepublication@manuu.edu.in
Phone number: 040-23008314 Website: manuu.edu.in

© *All right reserved. No part of this publication may be reproduced or transmitted in any form or by any means, electronically or mechanically, including photocopying, recording or any information storage or retrieval system, without prior permission in writing form the publisher (registrar@manuu.edu.in)*

Editors

Prof. Syed Alim Ashraf
Head Dept. of Arabic, MANUU, Hyderabad

ایڈیٹرس

پروفیسر سید علیم اشرف
صدر شعبہ عربی، مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، حیدرآباد

Language Editors

Dr. Mohammad Haziq
Assistant Professor (Contractual)/ Guest Faculty, Islamic Studies, DDE, MANUU
Dr. Mohd. Akmal Khan
Assistant Professor (Contractual)/ Guest Faculty, Urdu, DDE, MANUU

لینگوتج ایڈیٹرس

ڈاکٹر محمد حاذق
اسسٹنٹ پروفیسر (کانٹریکچول) / گیسٹ فیکلٹی، اسلامک اسٹڈیز، ڈی ڈی ای، مانو
ڈاکٹر محمد اکمل خان
اسسٹنٹ پروفیسر (کانٹریکچول) / گیسٹ فیکلٹی، اردو، نظامت فاصلاتی تعلیم، مانو

Editorial Board	مجلس ادارت
Prof. Abdul Ali *Former Head, Dept. of Islamic Studies, AMU, Aligarh*	پروفیسر عبدالعلی سابق صدر، شعبہ اسلامک اسٹڈیز، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ
Prof. S. M. Azizuddin Husain *Former Head, Dept. of History & Culture JMI, New Delhi*	پروفیسر ایس۔ ایم۔ عزیزالدین حسین سابق صدر، شعبہ تاریخ و ثقافت، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی
Prof. Mohammad Ishaque *Prof. of Islamic Studies, JMI, New Delhi*	پروفیسر محمد اسحاق پروفیسر، شعبہ اسلامک اسٹڈیز، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی
Prof. Mohd. Fahim Akhter *Dept. of Islamic Studies, MANUU*	پروفیسر محمد فہیم اختر شعبہ اسلامک اسٹڈیز، مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، حیدرآباد
Prof. Ghazanfar Ali Khan *Prof., of Islamic Studies, Kashmir Campus, MANUU*	پروفیسر غضنفر علی خان پروفیسر، شعبہ اسلامک اسٹڈیز، کشمیر کیمپس، مانو
Dr. Abdul Majeed Qadeer Khwaja *Asst. Prof., Islamic Studies, DDE, MANUU*	ڈاکٹر عبدالمجید قدیر خواجہ اسسٹنٹ پروفیسر، اسلامک اسٹڈیز، نظامت فاصلاتی تعلیم، مانو
Dr. Mohammad Haziq *Assistant Professor (Contractual)/ Guest Faculty, Islamic Studies, DDE, MANUU*	ڈاکٹر محمد حاذق اسسٹنٹ پروفیسر (کانٹریکچول) / گیسٹ فیکلٹی، اسلامک اسٹڈیز، نظامت فاصلاتی تعلیم، مانو
Dr. Syyeda Amina *Assistant Professor (Contractual)/ Guest Faculty, Islamic Studies, DDE, MANUU*	ڈاکٹر سیدہ آمنہ اسسٹنٹ پروفیسر (کانٹریکچول) / گیسٹ فیکلٹی، اسلامک اسٹڈیز، نظامت فاصلاتی تعلیم، مانو

کورس کو آرڈی نیٹر

پروفیسر سید علیم اشرف

صدر شعبہ عربی، مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، حیدر آباد

مصنفین	اکائی نمبر
ڈاکٹر محمد ارشد، اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ اسلامک اسٹڈیز، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی	1،2،3،4،5
ڈاکٹر محمد مشتاق تجاروی، اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ اسلامک اسٹڈیز، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی	6،7،8،9،10
مولانا محمد اعظم ندوی۔	11،12،13،14،15،16

نوٹ: زیر نظر کتاب علمی مواد (Study Material) مختلف مصنفین نے لکھا ہے اور اس سے کو آرڈی نیٹر و ایڈیٹر کا متفق ہونا ضروری نہیں ہے۔

پروف ریڈرس:

اول	:	ڈاکٹر محمد حاذق
دوم	:	ڈاکٹر سیدہ آمنہ

فہرست

پیغام	وائس چانسلر	7
پیغام	ڈائرکٹر	8
کورس کا تعارف	کورس کوآرڈی نیٹر	9

بلاک 1: عقائد

اکائی 1	توحید	11
اکائی 2	رسالت	33
اکائی 3	آخرت	50
اکائی 4	فرشتے اور آسمانی کتابیں	72
اکائی 5	تقدیر	95

بلاک 2: عبادات-1

اکائی 6	نماز	110
اکائی 7	روزہ	125

بلاک 3: عبادات-2

اکائی 8	زکوٰۃ	142
اکائی 9	حج	159
اکائی 10	حقیقت جہاد	176

بلاک 4 : معاملات

اکائی 11 حقوق اللہ 188

اکائی 12 حقوق العباد: انسانی حقوق، والدین اور اولاد کے حقوق 212

اکائی 13 حقوق العباد: ازدواجی حقوق، قرابت داروں کے حقوق 227

اکائی 14 حقوق العباد: پڑوسیوں کے حقوق، جانوروں کے حقوق 242

اکائی 15 آداب زندگی (حصہ اول) 254

اکائی 16 آداب زندگی (حصہ دوم) 266

نمونہ امتحانی پرچہ 282

پیغام

مولانا آزاد نیشنل اُردو یونیورسٹی 1998 میں وطنِ عزیز کی پارلیمنٹ کے ایکٹ کے تحت قائم کی گئی۔ اس کے چار نکاتی مینڈیٹس یہ ہیں۔ (1) اردو زبان کی ترویج و ترقی (2) اردو میڈیم میں پیشہ ورانہ اور تکنیکی تعلیم کی فراہمی (3) روایتی اور فاصلاتی تدریس سے تعلیم کی فراہمی اور (4) تعلیم نسواں پر خصوصی توجہ۔ یہ وہ بنیادی نکات ہیں جو اِس مرکزی یونیورسٹی کو دیگر مرکزی جامعات سے منفرد اور ممتاز بناتے ہیں۔ قومی تعلیمی پالیسی 2020 میں بھی مادری اور علاقائی زبانوں میں تعلیم کی فراہمی پر کافی زور دیا گیا ہے۔

اُردو کے ذریعے علوم کو فروغ دینے کا واحد مقصد و منشا اُردو داں طبقے تک عصری علوم کو پہنچانا ہے۔ ایک طویل عرصے سے اُردو کا دامن علمی مواد سے لگ بھگ خالی رہا ہے۔ کسی بھی کتب خانے یا کتب فروش کی الماریوں کا سرسری جائزہ اس بات کی تصدیق کر دیتا ہے کہ اُردو زبان سمٹ کر چند ''ادبی'' اصناف تک محدود رہ گئی ہے۔ یہی کیفیت اکثر رسائل و اخبارات میں دیکھنے کو ملتی ہے۔ اُردو قاری اور اُردو سماج دورِ حاضر کے اہم ترین علمی موضوعات سے نابلد ہیں۔ چاہے یہ خود ان کی صحت و بقا سے متعلق ہوں یا معاشی اور تجارتی نظام سے، یا مشینی آلات ہوں یا ان کے گرد و پیش ماحول کے مسائل ہوں، عوامی سطح پر اِن شعبہ جات سے متعلق اردو میں مواد کی عدم دستیابی نے عصری علوم کے تئیں ایک عدم دلچسپی کی فضا پیدا کر دی ہے۔ یہی وہ چیلنجز ہیں جن سے اُردو یونیورسٹی کو نبرد آزما ہونا ہے۔ نصابی مواد کی صورت حال بھی کچھ مختلف نہیں ہے۔ اِسکولی سطح پر اُردو کتب کی عدم دستیابی کے چرچے ہر تعلیمی سال کے شروع میں زیرِ بحث آتے ہیں۔ چوں کہ اُردو یونیورسٹی کا ذریعہ تعلیم اُردو ہے اور اس میں عصری علوم کے تقریباً سبھی اہم شعبہ جات کے کورسز موجود ہیں لہٰذا اِن تمام علوم کے لیے نصابی کتابوں کی تیاری اِس یونیورسٹی کی اہم ترین ذمہ داری ہے۔

مجھے اِس بات کی بے حد خوشی ہے کہ یونیورسٹی کے ذمہ داران بشمول اساتذہ کرام کی انتھک محنت اور ماہرین علم کے بھرپور تعاون کی بنا پر کتب کی اشاعت کا سلسلہ بڑے پیمانے پر شروع ہو چکا ہے۔ ایک ایسے وقت میں جب کہ ہماری یونیورسٹی اپنی تاسیس کی 25 ویں سالگرہ منا رہی ہے، مجھے اس بات کا انکشاف کرتے ہوئے بہت خوشی محسوس ہو رہی ہے کہ یونیورسٹی کا نظامتِ فاصلاتی تعلیم از سرِ نو اپنی کارکردگی کے نئے سنگِ میل کی طرف رواں دواں ہے اور نظامتِ فاصلاتی تعلیم کی جانب سے کتابوں کی اشاعت اور ترویج میں بھی تیزی پیدا ہوئی ہے۔ نیز ملک کے کونے کونے میں موجود تشنگانِ علم فاصلاتی تعلیم کے مختلف پروگراموں سے فیضیاب ہو رہے ہیں۔ گرچہ گزشتہ دو برسوں کے دوران کووڈ کی تباہ کن صورتِ حال کے باعث انتظامی امور اور ترسیل و ابلاغ کے مراحل بھی کافی دشوار کن رہے تاہم یونیورسٹی نے اپنی حتی المقدور کوششوں کو بروئے کار لاتے ہوئے نظامتِ فاصلاتی تعلیم کے پروگراموں کو کامیابی کے ساتھ روبہ عمل کیا ہے۔ میں یونیورسٹی سے وابستہ تمام طلبا کو یونیورسٹی سے جڑنے کے لیے صمیم قلب کے ساتھ مبارک باد پیش کرتے ہوئے اس یقین کا اظہار کرتا ہوں کہ ان کی علمی تشنگی کو پورا کرنے کے لیے مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی کا تعلیمی مشن ہر لمحہ ان کے لیے راستے ہموار کرے گا۔

پروفیسر سید عین الحسن
وائس چانسلر

پیغام

موجودہ دور میں فاصلاتی طریقۂ تعلیم کو پوری دنیا میں ایک انتہائی کارگر اور مفید طریقۂ تعلیم کی حیثیت سے تسلیم کیا جاچکا ہے اور اس طریقۂ تعلیم سے بڑی تعداد میں لوگ مستفید ہو رہے ہیں۔ مولانا آزاد نیشنل اُردو یونیورسٹی نے بھی اپنے قیام کے ابتدائی دنوں ہی سے اردو آبادی کی تعلیمی ضروریات کے پیش نظر فاصلاتی طرز تعلیم کو متعارف کرایا۔ مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی کا آغاز 1998 میں نظامتِ فاصلاتی تعلیم سے ہوا اور 2004 میں باقاعدہ روایتی طرز تعلیم (Regular Courses) کا آغاز ہوا اور بعد ازاں متعدد روایتی تدریس کے شعبہ جات قائم کیے گئے۔

ملک میں تعلیمی نظام کو بہتر انداز سے جاری رکھنے میں یو جی سی کا مرکزی کردار رہا ہے۔ فاصلاتی تعلیم (ODL) کے تحت جاری مختلف پروگرام UGC-DEB سے منظور شدہ ہیں۔ UGC-DEB اس بات پر زور دیتا رہا ہے کہ فاصلاتی نظامِ تعلیم کے نصابات اور نظامات کو روایتی نظامِ تعلیم کے نصابات اور نظامات سے کماحقہ ہم آہنگ کر کے فاصلاتی تعلیم کے طلبا کے معیار کو بلند کیا جائے۔ چوں کہ مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی فاصلاتی اور روایتی طرزِ تعلیم کی جامعہ (Dual Mode University) ہے، لہٰذا اس مقصد کے حصول کے لیے یو جی سی۔ ڈی ای بی کے رہنمایانہ اصولوں کے مطابق Credit Based Credit System (CBCS) نظام متعارف کرایا گیا اور خود اکتسابی مواد (Self Learning Material) از سرِ نو، جس میں یو جی اور پی جی طلبا کے لیے چھ بلاک چوبیس اکائیوں اور چار بلاک سولہ اکائیوں پر مشتمل نئے طرز کی ساخت پر تیار کیا گیا ہے۔

نظامتِ فاصلاتی تعلیم یو جی، پی جی، بی ایڈ، ڈپلوما اور سرٹیفکیٹ کورسز پر مشتمل جملہ سترہ (17) کورسز چلا رہا ہے۔ ساتھ ہی تکنیکی ہنر پر مبنی کورسز بھی شروع کیے جا رہے ہیں۔ متعلمین کی سہولت کے لیے ملک کے مختلف حصوں میں 9 علاقائی مراکز بنگلورو، بھوپال، دربھنگہ، دہلی، کولکاتا، ممبئی، پٹنہ، رانچی اور سری نگر اور 6 ذیلی علاقائی مراکز حیدرآباد، لکھنؤ، جموں، نوح، وارانسی اور امراوتی کا ایک بہت بڑا نیٹ ورک موجود ہے۔ اس کے علاوہ وجے واڑہ میں ایک ایکسٹنشن سنٹر بھی قائم کیا گیا ہے۔ ان مراکز کے تحت سرِ دست 160 سے زیادہ متعلم امدادی مراکز (Learner Support Centres) نیز 20 پروگرام سنٹرس (Programme Centres) کام کر رہے ہیں، جو طلبا کو تعلیمی اور انتظامی مدد فراہم کرتے ہیں۔ نظامت فاصلاتی تعلیم اپنی تعلیمی اور انتظامی سرگرمیوں میں آئی سی ٹی کا بھرپور استعمال کرتا ہے، نیز اپنے تمام پروگراموں میں داخلے صرف آن لائن طریقے ہی سے دے رہا ہے۔

نظامتِ فاصلاتی تعلیم کی ویب سائٹ پر متعلمین کو خود اکتسابی مواد کی سافٹ کاپیاں بھی فراہم کی جا رہی ہیں، نیز آڈیو۔ ویڈیو ریکارڈنگ کا لنک بھی ویب سائٹ پر فراہم کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ متعلمین کے درمیان رابطے کے لیے ای میل اور وہاٹس ایپ گروپ کی سہولت فراہم کی گئی ہے، جس کے ذریعے متعلمین کو پروگرام کے مختلف پہلوؤں جیسے کورس کے رجسٹریشن، مفوضات، کونسلنگ، امتحانات وغیرہ کے بارے میں مطلع کیا جاتا ہے۔ پچھلے دو سال سے ریگولر کاؤنسلنگ کے علاوہ ایڈیشنل رمیڈیل آن لائن کاؤنسلنگ مہیا کی جا رہی ہے تاکہ طلبا کے تعلیمی معیار کو بلند کیا جا سکے۔

امید ہے کہ ملک کی تعلیمی اور معاشی حیثیت سے پچھڑی اردو آبادی کو عصری تعلیم کے مرکزی دھارے سے جوڑنے میں نظامتِ فاصلاتی تعلیم کا بھی نمایاں رول ہوگا۔ آنے والے دنوں میں تعلیمی ضروریات کے پیش نظر نئی تعلیمی پالیسی (NEP-2020) کے تحت مختلف کورسز میں تبدیلیاں کی جائیں گی اور امید ہے کہ یہ فاصلاتی نظام کو زیادہ مؤثر و کارگر بنانے میں مددگار ثابت ہوگی۔

پروفیسر محمد رضا اللہ خان
ڈائرکٹر، نظامت فاصلاتی تعلیم

کورس کا تعارف

نظامت فاصلاتی تعلیم، مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، حیدرآباد کے لیے یہ بات انتہائی باعث مسرت ہے کہ یونیورسٹی گرانٹس کمیشن (یو جی سی)، ڈسٹنس ایجوکیشن بیورو (ڈی ای بی) کے 2017 ضابطوں اور دوسرے ترمیمی ضوابط 2018 کے مطابق اسلامک اسٹڈیز کے موضوع پر اردو زبان میں درسی مواد تیار کیا گیا ہے۔ یو جی سی ہدایت کے تحت یونیورسٹی کے روایتی اور فاصلاتی نظام تعلیم کے لیے ایک ہی نصاب لازمی قرار دیا گیا ہے؛ تاکہ نہ صرف ان دونوں نظام تعلیم کے طلبہ کا معیار یکساں ہو، بلکہ حصول تعلیم کے لیے فراہم کی جانے والی مختلف سہولیات کے اس دور میں ایک نظام تعلیم کے طلبہ کے لیے دوسرے نظام تعلیم کی طرف منتقلی بھی قابل عمل ہو۔

ان ضوابط کے تحت یونیورسٹی میں فراہم کیے جارہے تمام مضامین میں روایتی اور فاصلاتی نظام تعلیم کا ایک ہی نصاب تیار کیا گیا، اور اس کے مطابق درسی مواد کی تیاری کی گئی جو بیک وقت دونوں نظام تعلیم کے طلبہ وطالبات کے لیے ذریعہ استفادہ بن سکے۔ یہ مواد بی اے کے تین سالہ (چھ سمسٹرز) کورس اور ایم اے کے دو سالہ (چار سمسٹرز) کورس کے لیے تیار کروایا گیا ہے۔ اس درسی مواد کی تیاری میں ملک بھر کے ماہرین اسلامک اسٹڈیز، دانشوران اور اسلامی علوم پر گہری نظر رکھنے والے علما کی معیاری خدمات یونیورسٹی کو حاصل رہیں، اور اس میں اسلامک اسٹڈیز کے تقریباً تمام ہی موضوعات اور پہلوؤں کا جامع احاطہ کیا گیا۔ اس طرح یونیورسٹی کے ذریعے تیار ہونے والا یہ درسی مواد ایک معیاری، ہمہ گیر اور اسلامک اسٹڈیز کے پورے کورس پر محیط بن کر تیار ہوا، جس سے نہ صرف یہ کہ اسلامک اسٹڈیز کے طلبہ وطالبات کی ایک بڑی ضرورت کی تکمیل ہوئی بلکہ اسلامی مطالعات کے میدان میں قابل قدر اضافہ ہوا۔

اس نصاب کی تیاری میں قدیم نصاب کی خوبیوں کو باقی رکھتے ہوئے ضروری حذف واضافہ اور جدید تحریر کے ساتھ مضامین کی ایسی ترتیب اختیار کی گئی جو دونوں روایتی اور فاصلاتی تعلیم کے نظام کی ضرورت بیک وقت پوری کر سکے۔

یکساں نصاب کی تیاری کے بعد اسی کے مطابق درسی مواد کی تیاری بھی مطلوب تھی جس میں نئے نصاب کے مطابق پرانے تحریر شدہ مواد میں کہیں کم اور کہیں زیادہ حذف وترمیم اور تبدیلی کی ضرورت تھی۔ کئی مقامات پر کم یا زیادہ اضافہ بھی مطلوب تھا۔ بعض ذیلی عناوین پر بالکل نئی تحریر لکھنے کی ضرورت تھی اور بعض جگہوں پر مکمل اکائی کے اضافہ کی بھی ضرورت پیش آئی۔ ان سب کے علاوہ مواد کی ترتیب کو نئے نصاب کے مطابق بنایا گیا۔ نیز ہر اکائی کے تحت اکتسابی نتائج اور متنوع قسم کے سوالات کے تفصیلی نمونے شامل کیے گئے۔ ان تبدیلیوں کے بعد تیار ہونے والا مواد قدیم وجدید کا مجموعہ بن کر سامنے آیا ہے۔

ہمیں خوشی ہے کہ ہم ایم اے کے کورس کی یہ کتاب آپ کے لیے پیش کر رہے ہیں۔ تیسرے سمسٹر کے اس پرچہ کا عنوان "اسلامی عقائد، عبادت اور معاملات" ہے۔ یہ روایتی تعلیم کے تحت ایم اے سال دوم کے لیے ہے۔ اس پرچہ میں کل سولہ اکائیاں ہیں، جن کو چار بلاک میں تقسیم کیا گیا ہے۔ ان بلاکس میں عقائد وایمانیات، عبادات اور معاملات سے متعلق تمام معلومات کا احاطہ کیا گیا ہے۔ پہلا بلاک عقائد سے متعلق ہیں جس میں توحید، رسالت، آخرت، فرشتے اور آسمانی کتابیں اور تقدیر کی اہمیت وضرورت اور عقائد کی حقیقت پر تحریری مواد موجود ہے۔ دو بلاک عبادات سے متعلق ہیں جس میں نماز، روزہ، زکوۃ، حج اور جہاد کی حقیقت پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ اسی طرح آخری بلاک معاملات سے متعلق ہیں جس میں اللہ کے حقوق، بندوں کے حقوق اور آداب زندگی سے متعلق ہمارے لیے اسلامی تعلیمات میں کیا رہنمائی موجود ہے اس پر بھی اس کتاب میں مواد شامل ہے۔

پروفیسر سید علیم اشرف
کورس کوآرڈی نیٹر

اسلامی عقائد، عبادات اور معاملات

Islamic Beliefs, Rituals & Obligations

اکائی 1: توحید

اکائی کے اجزا:

1.0 تمہید
1.1 مقاصد
1.2 توحید کا معنی و مفہوم
1.3 حقیقت توحید
1.4 توحید کے دلائل
  1.4.1 توحید کے عقلی دلائل
  1.4.2 توحید کے دلائل قرآن میں
1.5 اللہ تعالیٰ کے اسماء و صفات
  1.5.1 اسماء و صفات جمال
  1.5.2 اسماء و صفات جلال
  1.5.3 اسماء و صفات کمال
  1.5.4 اسماء و صفات وحدانیت
  1.5.5 اسماء و صفات علم
  1.5.6 اسماء و صفات تنزیہہ
1.6 صفات کے بیان کا مقصد
1.7 عقیدۂ توحید کے تقاضے
1.8 عقیدۂ توحید کا اثر انسانی زندگی پر
1.9 اکتسابی نتائج
1.10 نمونہ امتحانی سوالات

1.10.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات

1.10.2 طویل جوابات کے حامل سوالات

1.11 تجویز کردہ اکتسابی مواد

1.0 تمہید

کسی بھی عقل وشعور کے حامل انسان کے ذہن ودماغ پر جو سوالات بار بار دستک دیتے ہیں ان میں ایک بنیادی سوال یہ ہوتا ہے کہ وہ اور اس کے ساتھ یہ لامحدود کائنات کیسے اور کیونکر وجود میں آگئے؟ ان کا مقصد وجود کیا ہے؟ کون ہے جس کی طاقت وقوت اس تمام رنگ ورعنائی کے پیچھے کارفرما ہے۔ جس نے انسان سمیت اس تمام عالم رنگ وبو کو وجود بخشا ہے وہ تنہا اور اکیلا ہے یا پھر اس کے کچھ شریک اور ساجھی دار بھی ہیں؟ یہ اور اس طرح کے دیگر سوالوں کے جواب انسان کو دو طرح سے ملتے ہیں۔ 1۔ ایک عقل کے ذریعے لیکن انسانی عقل ناقص ہے اس لیے اس راہ میں ٹھوکریں کھاتی اور گمراہ ہوتی ہے۔ 2۔ دوسرا طریقہ وحی کا ہے یعنی انسان کا خالق ومالک اپنے منتخب بندوں کے توسط سے انسانی سوالات کے جواب دیتا ہے۔ عقل کے مقابلے وحی زیادہ یقینی ذریعہ ہے۔ آخری وحی اللہ کے آخری رسول حضرت محمدؐ پر نازل ہوئی ہے اس لیے ان تمام سوالات کے جواب کے لیے سب سے معتبر اور مستند گواہی حضرت محمدؐ کی ہے۔

توحید کو حضرت محمدؐ کی تعلیم میں بنیادی اہمیت حاصل ہے۔ اس کی بنیاد کلمہ لا الٰہ الا اللہ (کوئی معبود نہیں سوائے اللہ کے) ہے۔ اس کلمے میں ہر طرح کے شرک کی نفی کرنے کے بعد کامل توحید کا اثبات ہے۔ یہ وہ کلمہ ہے جس کا اقرار یا انکار انسان کی دنیا بدل دیتا ہے۔ جو لوگ اس کا اقرار کرتے ہیں وہ حزب اللہ (اللہ کی جماعت) میں شامل ہو جاتے ہیں اور جو لوگ اس کلمے کا انکار کرتے ہیں وہ غیر اللہ کے ساتھ جا ملتے ہیں۔ توحید کے اقرار کے بعد انسان کی شان ہی بدل جاتی ہے۔ اس کے روز وشب بدل جاتے ہیں۔ وہ کسی سے ڈرتا نہیں، نہ کسی کے آگے ہاتھ پھیلاتا ہے۔ ایک خدا کے سامنے سر جھکا کر وہ در در کی ٹھوکریں کھانے سے محفوظ ہوتا ہے۔ وہ جو کچھ بھی کرتا ہے اللہ کی رضا کے لیے کرتا ہے۔ اس کی پوری زندگی بامقصد بن جاتی ہے اور وہ اپنے مقصد کے حصول کے لیے ہر وقت کوشاں رہتا ہے۔ جب کہ توحید کا انکار کرنے والا انسان ہر طرح خسارے میں رہتا ہے۔ اس کے سامنے نہ تو کوئی مقصد ہوتا ہے اور نہ ہی مقصد کے حصول کا ذریعہ اور اس کے لیے تگ ودو۔ چنانچہ ایک بے مقصد زندگی کی جتنی برائیاں اور خرابیاں ہیں وہ سب اس میں در آتی ہیں۔ وہ اپنی پوری زندگی بھٹکتا پھرتا ہے اور ناکام ونامراد اس دنیا سے رخصت ہوتا ہے۔ آیئے اس تمہید کے بعد توحید کے معنی ومفہوم اور کلمہ لا الٰہ الا اللہ کی حقیقت کو جاننے اور سمجھنے کی کوشش کی جائے۔

1.1 مقاصد

اس اکائی کا مقصد یہ ہے کہ اسلام کے تصور توحید کو اس کے تمام لوازم کے ساتھ اس طرح بیان اور واضح کر دیا جائے کہ طالب علم اس کے مطالعے کے بعد توحید اور ایک اللہ پر ایمان کے حوالے سے تمام طرح کے سوالات اور شکوک و شبہات کو نہ صرف یہ کہ خود اپنے ذہن و دماغ سے رفع کر سکے بلکہ توحید کے مختلف پہلوؤں پر جو بھی اور جس طرح کے بھی سوالات اٹھتے اور قائم ہوتے ہیں ان کے جواب دینے کا اہل ہو جائے۔ اس اکائی میں ہماری کوشش ہو گی کہ توحید کا معنی و مفہوم بتانے اور بیان کرنے کے بعد توحید کا ایک ایسا جامع و مانع تخیل پیش کریں جو قرآن و سنت سے مدلل ہوتا ہے۔ اس حوالے سے ہم یہ بھی کوشش کریں گے کہ توحید کے عقلی اور نقلی دونوں طرح کے دلائل پیش کر دیے جائیں۔ اللہ تعالیٰ کے اسماء و صفات کی بحث بہت ہی قدیم ہے۔ ہم اس بحث کے الجھاؤ میں نہ پڑتے ہوئے اللہ تعالیٰ کے اسماء وصفات اور صفات کی مختلف اقسام کا اجمالی تعارف پیش کر دیں۔ اکائی کے آخر میں یہ بتانے کی بھی کوشش کی جائے گی کہ توحید کا عقیدہ کیوں ضروری ہے اور انسانی زندگی پر توحید کے کیا اثرات مرتب ہوتے ہیں؟۔

1.2 توحید کا معنی و مفہوم

توحید عربی زبان کا لفظ ہے۔ اس کا مادہ "وحد" ہے اور اس کا لفظی معنی ایک بنانا یا یکتائی کو ثابت کرنا ہے۔ اسی لیے متکلمین اسلام کے نزدیک لفظ توحید کا اطلاق اللہ کی وحدانیت اور توحد پر کیا جاتا ہے۔ اس طرح توحید کا معنی اللہ کو ایک ماننا اور اس پر ایمان لانا ہے۔ اصطلاح میں توحید کا معنی یہ ہوا کہ اللہ کی ذات اور صفات میں کسی کو اس کا شریک نہ مانا جائے یعنی یہ عقیدہ رکھا جائے کہ الٰہ ہونے اور الوہیت کی خصوصیت میں کوئی بھی اللہ تعالیٰ کا شریک اور ساجھی دار نہیں ہے۔ گویا توحید کلمہ لا الٰہ الا اللہ کی یک لفظی تعبیر ہے یعنی اللہ تعالیٰ ایک ایسی ہستی ہے جس کی شان، جلال اور برتری ایسی ہے کہ اس کی پرستش، عبادت اور بندگی کی جائے وہی ایک ایسی ذات ہے جس کے آگے سر جھکایا جائے، وہ بے انتہا قدرت کا مالک ہے، عقل اس کی حقیقت کو سمجھنے سے قاصر ہے، وہ کسی کا محتاج نہیں اور زندگی کے معاملات میں سب اس کے محتاج ہیں اور اس سے مدد مانگنے پر مجبور ہیں۔

توحید شرک کی ضد ہے اس لیے توحید کو صحیح طریقہ پر سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ شرک کو اس کی تمام تفصیلات کے ساتھ جانا جائے۔ قرآن اور پیغمبر اسلام نے شرک کو تمام برائیوں کی جڑ بتایا ہے۔ قرآن کے الفاظ بہت واضح ہیں:

إِنَّ الشِّرْکَ لَظُلْمٌ عَظِیْمٌ۔ ترجمہ: شرک سب سے بڑا ظلم ہے۔

اللہ تعالیٰ تمام گناہوں کو معاف کر سکتا ہے لیکن شرک اسے کسی حال میں بھی برداشت نہیں اور نہ وہ شرک کرنے والے کو معاف کرے گا: إِنَّ اللّٰہَ لاَ یَغْفِرُ أَن یُشْرَکَ بِہِ وَیَغْفِرُ مَا دُونَ ذٰلِکَ لِمَن یَشَاءُ (النساء:116)

ترجمہ: یقیناً اللہ شرک کو معاف نہ کرے گا اور اس کے سوا جس کے جو گناہ چاہے معاف کر دے۔

اللہ تعالیٰ نے کائنات کو چلانے کے لیے ایک سلسلۂ اسباب قائم کیا ہے اور خود مسبب الاسباب ہے۔ شرک کا آغاز اس طرح ہوتا

ہے کہ انسان اسباب کو ہی اصل مان لیتا ہے اور پھر خدا کو چھوڑ کر انہیں کے آگے سر جھکانے لگ جاتا ہے۔ پیغمبر اسلام حضرت محمدؐ نے دنیا میں شرک کی جتنی بھی صورتیں اور شکلیں ہو سکتی تھیں سب کا استیصال کیا ہے مثلاً:

آپؐ کے زمانے میں جو قومیں بھی موجود تھیں انہوں نے متعدد خدا بنا لیے تھے مختلف کاموں کے لیے مختلف خدا تھے۔ سب سے پہلے آپؐ نے اس تصور پر ضرب لگائی اور بتایا کہ خدا ایک ہے۔ دو، تین یا اس سے زیادہ خدا نہیں ہو سکتے کیونکہ اس طرح نظام عالم ہی درہم برہم ہو جائے گا۔

شرک کا ایک بہت بڑا ذریعہ یہ ہے کہ بزرگوں اور بڑوں کی ایسی تعظیم و تکریم کی جائے جو شرک تک پہنچ جائے۔ اس کو شخصیت پرستی کہا جاتا ہے۔ عیسائیوں نے حضرت عیسیٰؑ کی ایسی تکریم کی کہ انہیں خدا بنا دیا۔ قرآن مجید میں متعدد مقامات پر اس کے لیے ان کی تنبیہ کی گئی ہے۔ خود آں حضرتؐ کے بارے میں کہا گیا:

قل انما انا بشر مثلکم یوحی إلی انما إلھکم إله واحد(الکھف:110)

ترجمہ: (اے پیغمبر) کہہ دو کہ میں تو تمہاری ہی طرح ایک آدمی ہوں لیکن یہ کہ میری طرف وحی بھیجی جاتی ہے کہ تمہارا خدا ایک خدا ہے۔

شرک یہ بھی ہے کہ خدا تک پہنچنے کے لیے درمیانی واسطے بنا لیے جائیں اور یہ جانتے ہوئے بنا لیے جائیں کہ یہ خدا نہیں ہیں لیکن خدا کے دربار میں سفارشی ہیں اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ خدا سے نہ مانگ کر سب کچھ انہیں سے مانگا جانے لگتا ہے اور جو التجائیں اور دعائیں خدا سے کی جانی چاہیے وہ ان واسطوں سے کی جانے لگتی ہیں۔ اسلام نے اس سے بھی روکا ہے اور بتایا ہے کہ جن سے حاجتیں مانگی جاتی ہیں اور جنہیں بھی حاجت روا سمجھا جاتا ہے انہیں اس دنیا میں کسی بھی قسم کا اختیار حاصل نہیں ہے۔ شرک کا ایک بڑا ذریعہ وہ غلط فہمی بھی ہے جو لوگوں میں خوارق عادات یعنی معجزات و کرامات کے حوالے سے پائی جاتی ہے اور لوگ یہ سمجھنے لگتے ہیں کہ جن سے یہ امور سرزد ہوئے ہوتے ہیں وہ خدا نہ بھی ہوں تو خدائی میں کسی قدر دخل ضرور رکھتے ہیں اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ خدا کو چھوڑ کر وہ ان سے اپنی ضرورتیں مانگنے لگتے ہیں۔ قرآن میں اس سے منع کیا گیا ہے اور جہاں کہیں بھی معجزات کا ذکر ہے وہاں باذن الله (اللہ کی اجازت سے) کے الفاظ کی قید ضرور لگائی گئی ہے۔

شرک یہ بھی ہے کہ اللہ کے جو اوصاف ہیں وہ دوسروں میں بھی تسلیم کر لیے جائیں مثال کے طور پر علم غیب اللہ کا وصف ہے۔ اب اگر کوئی یہ ماننے لگے کہ غیب کا علم اللہ کے سوا بھی کچھ لوگوں کو ہے تو یہ شرک ہے۔ قرآن نے اس سے روکا ہے:

قُل لَّا يَعۡلَمُ مَن فِي السَّمَاوَاتِ وَالۡأَرۡضِ الۡغَيۡبَ إِلَّا اللَّهُ(النمل:65)

ترجمہ: (اے پیغمبر) کہہ دو کہ خدا کے سوا آسمانوں اور زمین میں کوئی غیب نہیں جانتا۔

حضور نبی کریمؐ نے خود اپنی ذات سے بھی غیب کی نفی کی ہے۔ ایک مرتبہ اللہ کے رسولؐ ایک شادی میں موجود تھے اور انصار کی کچھ لڑکیاں گا رہی تھیں، ان کے گانے میں یہ بھی تھا:

وَفِيْنَا رَسُوْلٌ يَعْلَمُ مَا فِيْ غَدٍ

ترجمہ: اور ہم میں ایک ایسا رسول ہے جو کل کی بات جانتا ہے۔ آپؐ نے اس سے منع فرمایا۔ (بخاری، کتاب النکاح)

شرک یہ بھی ہے کہ کچھ لوگوں کے بارے میں یہ خیال رکھا جائے کہ وہ گناہوں کے باوجود شفاعت کریں گے اور جس طرح دنیوی درباروں میں سفارشیوں کے بغیر رسائی ممکن نہیں اس طرح اللہ کے دربار میں بھی سفارش کی ضرورت ہو گی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ بندہ اللہ کو چھوڑ کر ان سفارشیوں کی ہی آؤ بھگت میں لگ جاتا ہے اور انہیں کو خوش رکھنا اپنے لیے کامیابی کی ضمانت تصور کرتا ہے۔ اللہ کے رسولؐ نے اس طرح کی شفاعت کو غلط قرار دیا ہے اور لوگوں کو اس سے روکا ہے۔ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

أَمِ اتَّخَذُوا مِن دُونِ اللَّهِ شُفَعَاء قُلْ أَوَلَوْ كَانُوا لَا يَمْلِكُونَ شَيْئاً وَلَا يَعْقِلُونَ۔ قُل لِّلَّهِ الشَّفَاعَةُ جَمِيعاً لَّهُ مُلْكُ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ ثُمَّ إِلَيْهِ تُرْجَعُونَ (زمر: 43-44)

ترجمہ: کیا انہوں نے اللہ کے سوا اوروں کو شفیع بنا رکھا ہے؟ کہہ دو کہ اگر ان کو کسی چیز کا اختیار نہ ہو اور نہ ان کو سمجھ ہو تو بھی؟ کہہ دو کہ شفاعت کا کل اختیار خدا ہی کو ہے۔ اسی کا راج آسمانوں اور زمین میں ہے۔ پھر اسی کی طرف تم لوٹائے جاؤ گے۔

اس آیت میں شفاعت کے عقیدے کی کلی تردید ہے۔ جس شفاعت کی اجازت اللہ کی جناب میں ہو گی وہ حق کی گواہی ہے اور اللہ کی اجازت سے ہو گی۔ یعنی شفاعت وہی کر سکیں گے جن کو اللہ تعالیٰ اس کی اجازت دے گا اور وہ انہیں لوگوں کی شفاعت کریں گے جن کی شفاعت کرانا خود اللہ کو منظور ہو گا۔

یہ اور اس طرح کے شرک کے مختلف اور بھی ذرائع اور شکلیں ہیں جن کا احاطہ یہاں مقصود نہیں۔ بتانا صرف یہ ہے کہ شرک کی کوئی بھی شکل و صورت ہو، خواہ وہ جلی ہو یا خفی، اللہ اور اس کے رسولؐ کو ہرگز ہرگز قبول نہیں۔ وہ احد (یک و تنہا) ہے۔ وہ بے نیاز ہے (اسے کسی بھی طرح کی کوئی ضرورت نہیں)۔ نہ اس نے کسی کو جنا ہے نہ ہی وہ جنا گیا ہے۔ (یعنی نہ وہ کسی کا باپ ہے نہ کسی کا بیٹا۔ وہ آپ سے آپ ہے۔ ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گا) اور نہ ہی کوئی اس کا ہمسر ہے۔ (کائنات میں کوئی نہیں جو اس کی برابری کا دعویٰ کر سکے)۔

1.3 حقیقت توحید

توحید اور اس کی حقیقت کو صحیح معنوں میں جاننے اور سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ ایک نظر انسانی تاریخ پر ڈالی جائے۔ انسان کی معلوم تاریخ کے جو حالات بھی محفوظ رہ گئے ہیں اور جو کچھ آثار بھی زمانے کی دست برد سے محفوظ رہ گئے ہیں، ان کا مطالعہ ہمیں اس نتیجے تک لے جاتا ہے کہ دنیا میں کوئی بھی زمانہ اور دور ایسا نہیں گزرا جس میں انسان نے کسی نہ کسی کو خدا نہ مانا ہو اور کسی کی عبادت نہ کی ہو۔ انسان ہر زمانے میں خدا کو مانتا اور اس کے آگے سر جھکاتا رہا ہے۔ قدیم زمانے سے لے کر آج تک دنیا میں جتنی قومیں بھی گزری ہیں یا جو موجود ہیں، خواہ وہ تہذیب و تمدن کے کسی بھی مرحلے میں رہی ہوں ان میں خدا کا تصور ضرور پایا جاتا ہے۔ وہ اسے صرف مانتی ہی نہیں اس کی عبادت بھی کرتی ہیں۔ گویا خدا کا تصور انسانی فطرت کا حصہ ہے۔ وہ انسان ہو ہی نہیں سکتا جو خدا کو مانتا نہ ہو۔ آج بھی جب خدا کا انکار اور دہریت کا اعلان

بظاہر فیشن بن چکا ہے دنیا کی متمدن سے متمدن اقوام سے لے کر وحشی ترین قوموں تک ہر جگہ خدا کا تصور موجود ہے اور وہ کسی نہ کسی خدا کی پرستش ضرور کرتی ہیں۔ یہاں تک کہ موجودہ دور کے دہریے بھی جب مشکلات میں پڑتے ہیں تو انہیں خدا کے علاوہ کسی دوسرے کا سہارا نظر نہیں آتا۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جب خدا کی ہستی ہے اور ہر کوئی اسے ماننے اور تسلیم کرنے پر مجبور ہے تو پھر وہ خدا کیا ہے؟ وہ کیسا ہے؟ اس کی خوبیاں اور صفات کیا کیا ہیں؟ کون سی باتیں ہیں جو اس کی طرف منسوب کی جاسکتی ہیں؟ کن چیزوں اور باتوں سے اس کی ذات پاک ہے؟ وہ اپنے بندوں سے کس طرح کا تعلق رکھتا ہے؟ اگر کوئی اس کا بندہ ہے تو اسے کیسے اس کے آگے جھکنا چاہیے؟ اس خدا سے بندے کو کیا مانگنا چاہیے؟ اور کیونکر مانگنا چاہیے؟ بندے کو خدا سے کیوں ڈرنا چاہیے اور اس ڈرنے کی حقیقت کیا ہونی چاہیے؟ کیا خدا سے محبت کی جاسکتی ہے؟ اگر کی جاسکتی ہے تو اس محبت کی حقیقت کیا ہے؟ خدا کی قدرت کہاں تک ہے؟ اس کا علم کتنا ہے؟ کیا وہ ہم سے دور ہے یا قریب ہے؟ اس کے تقدس اور بڑائی کی کوئی حد بھی ہے یا نہیں؟ ہمیں خدا پر بھروسہ اور توکل کرنا چاہیے تو کیونکر کرنا چاہیے؟ کیا وہ خدا انسانوں میں سے کچھ لوگوں سے کلام بھی کرتا ہے؟ کیا اس کے کچھ احکام بھی ہیں؟ اور کیا وہ احکام واجب الاطاعت بھی ہیں؟ وہ کن باتوں سے خوش اور کن باتوں سے ناخوش ہوتا ہے؟ کیا وہ ہمارے دلوں کے چھپے ہوئے رازوں سے بھی آگاہ ہے؟ کیا اس کی اجازت کے بغیر زمین کا ایک ذرّہ بھی اپنی جگہ سے حرکت کر سکتا ہے؟ اس کی مشیت اور اس کا ارادہ کیونکر آسمان سے زمین تک ہر شے کو محیط ہے؟ کیا اس کے بنائے ہوئے قاعدے اور قانون بھی ہیں؟ کیا وہ انسانوں کی تعلیم اور اصلاح کے لیے پیغمبروں کو بھی مبعوث کرتا ہے؟ کیا ہم اس کی بارگاہ میں اپنے اعمال کے لیے جواب دہ بھی ہیں؟ ہم سے وہ کیوں اور کیونکر ہمارے اعمال کا مواخذہ کرے گا؟ یہ اور اس جیسے دوسرے اور بھی سوالات وہ ہیں، جو انسانی تمدن جیسے جیسے ترقی کرتا جاتا ہے، ان کے ذہنوں میں پیدا ہوتے ہیں اور وہ ان کے جواب بھی پانا چاہتے ہیں۔

حضور نبی پاکؐ عرب کے جس معاشرے میں مبعوث کیے گئے تھے وہ بہت ہی سادہ معاشرہ تھا، آپؐ نے عربوں کے سامنے خدا کا جو تصور پیش کیا اس میں انہیں یہ بتایا کہ خدا کی حقیقی عظمت کیا ہے؟ وہ یکا و تنہا ہونے کے ساتھ ساتھ بے مثال بھی ہے کوئی اس کی ہمسری کا دعویٰ نہیں کر سکتا۔ انہیں اس سے بھی باخبر کیا کہ دنیا میں جو کچھ بھی ہوتا ہے خدا کی قدرت اور مشیت سے ہی ہوتا ہے، اس کے ارادے اور مرضی کے بغیر زمین کا ایک پتّا بھی نہیں ہل سکتا۔ انہیں ایک ایسی ہستی کے اعتقاد کی تعلیم دی جس کی قدرت کی کوئی انتہا نہیں، جس کی وسعت غیر محدود ہے، جس کی مشیت کائنات کے ہر ذرے میں نافذ ہے۔ جس کے علم کے احاطے میں اندھیرے اور اجالے کی ہر چیز داخل ہے، دلوں کے اسرار، زبانوں کے الفاظ اور ہاتھ پاؤں کے اعمال سب ہر لحظہ اور ہر لمحہ اس کے روبرو ہیں اس کے سامنے انسان اپنے ہر عمل کا جواب دہ اور ذمہ دار ہے، انسان کو اس کے مواخذے سے ڈرنا چاہیے اور اس کی رحمت کی امید رکھنی چاہیے۔ وہ ہمیشہ سے انسانوں کا محبوب ہے اور اس کی محبت میں ہی انسان کی سربلندی و سرفرازی ہے۔ اس کا فضل و کرم بے پایاں ہے اور اس کا لطف و محبت ہر شے کو محیط ہے۔ اس کی قوت سے بڑھ کر کوئی قوت نہیں، اس کا ارادہ ہر ارادے میں نافذ ہے اور اس کا حکم ہر حکم سے بالاتر ہے۔ اس کی عبادت ہر مخلوق پر فرض ہے اور اس کی اطاعت ہر مکلف پر واجب ہے۔ اس کی ذات ہر عیب سے پاک ہے اور وہ ہر وصف کا مستحق اور اس سے متصف ہے۔ اسے یہ

بھی پتہ ہے کہ انسانی حافظہ بہت کمزور ہے، وہ بہت جلد چیزوں کو بھلا دیتا ہے چنانچہ انسانوں کی یاددہانی کے لیے اور ان کے تزکیہ و اصلاح کے مقصد سے اللہ نے رسول اور پیغمبر بھیجے۔ ان پیغمبروں کو اللہ سے ہم کلامی کا شرف بھی حاصل ہوتا رہا اور وہ اس کی ہدایات انسانوں تک پہنچاتے رہے۔ اللہ تعالیٰ نے انسانوں کو دنیوی زندگی گزارنے کے لیے کچھ احکام اور قوانین عطا کیے ہیں جن کی اطاعت نیکی اور نافرمانی گناہ ہے۔ وہ اللہ ایسا ہے جو اندھیروں کو روشن کرتا ہے، بھوکوں کو کھانا کھلاتا ہے، جو مایوس ہو چکے ہیں ان میں امید کی کرن روشن کرتا ہے، بے قرار دلوں کو تسلی کا سامان فراہم کرتا ہے اور بے کسوں کو سہارا دیتا ہے۔ وہ اللہ ایسا ہے جو ہم سے ہماری رگ گردن سے بھی زیادہ قریب ہے۔ ہم جب اور جہاں کہیں بھی اسے پکاریں وہ ہماری سنتا ہے۔ اللہ کو نیکیاں پسند اور گناہوں سے نفرت ہے۔ اسی کے دست قدرت میں ساری کائنات کا نظام ہے وہ جب چاہے زمین و آسمان سب کو فنا کر دے اور جب چاہے ان کو دوبارہ پیدا کر دے۔ کوئی بھی کام اس کی دسترس سے باہر نہیں۔ حقیقت واقعہ یہ ہے کہ اس کی یعنی خدا کی رضا و محبت ہی اس دنیوی زندگی کا حاصل ہے۔ اس کی عبادت و اطاعت ہی ہماری تمام کوششوں اور سرگرمیوں کا مرکز و محور ہونا چاہیے اور ہمارے بے بیمار دلوں کو اس کی یاد سے ہی راحت ملنی چاہیے۔

یہ ہے خدا کا وہ تصور جسے حضور نبی پاکؐ نے عرب کے ان امیوں کے سامنے پیش کیا تھا جو سادہ دل تھے، جو خدا کا کوئی واضح تصور نہیں رکھتے تھے۔ لیکن جب ان کے سامنے خدا' یہ تصور آیا اور انہوں نے اسے تسلیم کر لیا تو پھر ان کی دنیا ہی بدل گئی۔ وہ جو طاقت کی ہر علامت کے سامنے سر جھکا دیا کرتے تھے اس تعلیم کے نتیجے میں ایسے موحد اور خدا پرست بن گئے کہ کو ان کے سامنے دنیا کی تمام طاقتیں اور قوتیں ہیچ ہو گئیں۔ البتہ خدا کے اس ادراک نے انہیں دنیا سے بے زار اور بے گانہ بھی نہیں کیا۔ نہ انہوں نے گوشہ نشینی اختیار کی نہ ہی رہبانیت کا لبادہ اوڑھ کر جنگلوں کی راہ لی۔ وہ اس مادّی دنیا میں رہے لیکن اس کی آلائشوں سے ایسے محفوظ کہ انہیں دنیا کی کوئی بھی تجارت و منفعت اللہ کی یاد سے غافل نہیں کرنے پاتی تھی۔ دنیا کی ہر محبت پر اللہ کی محبت غالب تھی۔ اللہ پر ان کا توکل ایسا تھا کہ اس کی راہ میں سب کچھ لٹا دینے کے بعد بھی غنی (مالداری) کے نشے میں سرشار رہتے تھے۔ خدا کے خوف نے انہیں تمام ڈروں سے بے نیاز کر دیا تھا اور خدا کی بندگی نے انہیں تمام دنیا کی بندگی سے نجات دلا دی تھی۔

1.4 توحید کے دلائل

خدا ہے اور اس کے سامنے سرِ بندگی کو جھکانا اور خم کرنا چاہیے اس سے تو عقل کے ماروں کے علاوہ کسی کو انکار نہیں۔ لیکن اس کا جو جامع و مانع تصور اوپر کی سطور میں پیش کیا گیا کیا وہ کسی ایک ذات اور ہستی میں سما سکتا ہے؟ انسانی ذہن نے اس معاملے میں ٹھوکریں کھائی ہیں اور بار بار کھائی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جب تک انسانی معاشرہ تمدنی ترقی کی ایک خاص سطح تک نہیں پہنچ گیا بار بار اور مختلف مقامات پر اللہ تعالیٰ اپنے نبی اور رسول بھیجتا رہا اور سب سے آخر میں سیدنا حضرت محمدؐ کو خاتم الانبیاء بنا کر بھیجا۔ انسان جب اپنے آپ کو اور اپنی مجبوریوں کو دیکھتا ہے اور پھر اپنے ارد گرد اور اطراف میں بکھرے ہوئے قدرت اور طاقت کے مظاہر کو دیکھتا ہے تو خود بخود اس کے اندر کا جذبہ عبودیت عود کر آتا ہے اور وہ اپنا سر غرور خم کرنا چاہتا ہے' لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ وہ سر جھکے تو کس کے سامنے جھکے؟ طاقت کے تمام مظاہر کے سامنے جھکے۔ ان میں سے کچھ کے سامنے جھکے یا پھر کسی ایسی ماورا اور بالاتر ہستی کے سامنے جھکے جس کے تابعِ فرمان یہ سب ہیں۔ انسانی ذہن جیسے جیسے

ترقی کرتا جاتا ہے اس کا تصور خدا بدلتا جاتا ہے یہاں تک کہ ایک مرحلے میں جب وہ کائنات اور اس کے نظام پر گہرائی کے ساتھ غور و خوض کرتا ہے تو اسے محسوس ہوتا ہے کہ یہ ساری کائنات ایک لگے بندھے نظام کا حصہ ہے۔ اس میں کہیں کوئی کمی بیشی نہیں ہے اور اس منظم ترین نظام کی پشت پر کوئی ایک ہی قوت کارفرما ہو سکتی ہے اور پھر ایسے میں اگر اسے خدائی ہدایت اور رہنمائی--- جو اس نے اپنے رسولوں کے ذریعے بھیجی اور سب سے آخر میں حضرت محمدؐ اسے لے کر آئے--- بھی مل جاتی ہے وہ خدائے واحد تک پہنچ جاتا اور موحد بن جاتا ہے۔

1.4.1 توحید کے عقلی دلائل

دنیا میں کوئی چھوٹی سے چھوٹی اور معمولی سے معمولی چیز ہو، وہ خود بخود نہیں بن جاتی، کوئی نہ کوئی اس کا خالق اور بنانے والا ہوتا ہے۔ جب یہ معمولی چیزیں بھی کسی بنانے والے کے بغیر نہیں بن سکتیں تو پھر یہ زمین، یہ آسمان، یہ سورج، یہ چاند یہ پوری کائنات خود بخود تو وجود میں نہیں آئی ہو گی۔ ان کا بھی کوئی خالق اور بنانے والا ہو گا۔ اور چونکہ ان تمام تخلیقات میں ایک طرح کا توافق اور توازن ہے اس لیے ان کے خالق اور بنانے والے کئی نہیں ہو سکتے۔ کوئی ایک ہی ہستی ہے جس نے ان کی تخلیق کی ہے۔

یہ پوری کائنات جو ہمارے سامنے بظاہر بکھری پڑی نظر آتی ہے اور جس کے معمولی سے حصّے کو بھی ابھی تک انسانی عقل سمجھ نہیں پائی ہے اس میں جو یکسانی و نظم ہے۔ مخلوقات کے درمیان جو تعاون و اشتراک اور اتحاد ہے۔ وہ نہ صرف یہ کہ کائنات کی وحدت کی دلیل ہے بلکہ اس کی بھی دلیل ہے کہ کوئی ایک ہی ہستی ہے جس نے نہ صرف ان چیزوں کو پیدا کیا بلکہ انہیں ایک انتظام میں پرو دیا ہے۔ اگر وہ خدا واحد اور اکیلا نہ ہو تو پھر یہ نظام عالم قائم ہی نہیں رہ سکتا۔ غور کیجیے دنیا میں کوئی بھی چیز اس وقت تک وجود پذیر نہیں ہو سکتی جب تک اس دنیا میں کارفرما تمام قوتوں میں توافق، تعاون اور اشتراک عمل نہ ہو۔ زمین سے ایک دانہ بھی اس وقت تک نہیں اُگ سکتا جب تک کہ خود اس میں اُگنے کی صلاحیت نہ ہو، زمین میں اسے اُگانے کی صلاحیت نہ ہو، ہوا، پانی اور موسم اس کے مناسب اور موافق نہ ہوں، سورج سے اسے مناسب گرمی اور روشنی نہ ملے جب یہ تمام عناصر اور ان کی قوتیں ایک توازن کے ساتھ جمع ہوتی ہیں تب کہیں جا کر دانہ زمین سے اُگتا ہے، برگ و بار لاتا ہے اور انسانیت کے لیے سودمند ہوتا ہے، اگر خدا ایک نہ ہو، کئی خود مختار قوتیں ہوں تو پھر ایک لمحے کے لیے بھی یہ نظام عالم قائم نہ رہ پائے۔ باہم متصادم اور ٹکرا کر یہ ختم ہو جائے۔ اگر ایسا نہیں ہو رہا ہے اور بلاشبہ نہیں ہو رہا ہے تو پھر ہمیں یہ ماننا اور تسلیم کرنا پڑے گا کہ خدا ایک ہے اور خدائی میں کوئی اس کا شریک نہیں۔ وہی ہے جس نے نظام عالم اور کائنات کو قائم رکھا ہے۔

توحید یعنی خدا کے ایک ہونے کی ایک دلیل یہ بھی ہے کہ زمین و آسمان اور پوری کائنات کی ایک ایک چیز ایک نظم و ضبط اور اصول و قانون کی پابند ہے سورج چاند سے لے کر انسان، حیوان، ہوا، پانی اور جمادات و نباتات تک جہاں بھی نظر جاتی ہے یہی معلوم پڑتا ہے کہ ہر ایک مقررہ نظام اور اصول کا پابند ہے۔ وہ اس قانون سے ذرا بھی نہیں ہٹتا اور یہ قانون کی پابندی ہی اس دنیا کو قائم رکھے ہوئے ہے۔ انسان خود اپنے وجود ہی پر نظر ڈالے تو وہ خدا کی وحدانیت کا قائل ہو جائے۔ بظاہر آزاد اور خود مختار نظر آنے والا انسان کتنا پابند ہے کہ اگر اس پابندی کے بند کو وہ توڑنا چاہے تو اس کا وجود ختم ہو جائے۔ وہ آنکھ سے دیکھتا ہے، کان سے سنتا ہے، پائوں سے چلتا ہے، دماغ سے سوچتا ہے۔ اب غور کیجیے انسان اگر ان پابندیوں کو توڑنا چاہے، ان میں سے کسی عضو سے اس کے مخصوص کام کے بجائے کوئی دوسرا کام لینا چاہے تو کیا اس

کا وجود باقی رہ سکتا ہے؟ بلاشبہ ایسا نہیں ہو سکتا۔ کائنات کا ایک ایک ذرہ کچھ اصولوں اور ضابطوں کا پابند ہے اور اسے ان اصولوں اور ضابطوں کا پابند جس ہستی نے بنایا ہے وہ ایک ہے اور وہ خدائے واحد کی ہستی ہے۔

1.4.2 توحید کے دلائل قرآن میں

قرآن مجید جس زمانے میں نازل ہوا یا رسول اللہؐ کی بعثت جس زمانے میں ہوئی، شرک و بت پرستی پوری دنیا میں عام تھی۔ خدائے واحد کے نام لیوا کہیں باقی نہیں رہے تھے۔ اس وقت کی جو مشہور و معروف قومیں تھیں یا تو وہ شرک میں مبتلا تھیں یا قدرتی مظاہر کو خدا مان کر بت پرستی میں مبتلا ہو چکی تھیں۔ ان حالات میں قرآن مجید کا نزول ہوا۔ لیکن یہ نزول یکبارگی نہیں ہوا۔ ایک تدریج کے ساتھ ۲۳؍ برس کی مدت میں اللہ نے اپنے احکام و تعلیمات رسول اللہؐ کو عطا کیے۔ اس ۲۳؍ سالہ مدت میں بھی اگر غور کیا جائے تو ہم پاتے ہیں کہ نبوت کے بعد کی پوری مکی زندگی میں کامل تیرہ برس تک قرآن مجید جو کچھ بھی نازل ہوا اس میں بنیادی طور پر جو تعلیم سب سے نمایاں ہے وہ توحید کا اثبات اور شرک کا---اس کی تمام شکلوں کے ساتھ----ابطال اور تردید ہے۔ اس تمام مدت میں روزہ، زکوٰۃ اور حج جیسی اہم عبادات بھی فرض نہیں کی گئیں۔ بس لا الٰہ الا اللہ کی جڑوں کو راسخ و مستحکم کیا جاتا رہا۔ سورہ اخلاص مکہ میں نازل ہوئی۔ یہ قرآن مجید کی ایک تہائی تعلیم یعنی توحید کا خلاصہ ہے۔ اللہ سبحانہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

قُلْ هوَ اللَّهُ أَحَدٌ (1) اللَّهُ الصَّمَدُ (2) لَمْ يَلِدْ وَلَمْ يُولَدْ (3) وَلَمْ يَكُن لَّهُ كُفُواً أَحَدٌ(4)(سورہ اخلاص)

ترجمہ: کہہ دو! اللہ ایک ہے۔ اللہ بے نیاز ہے (یعنی سب اس کے محتاج ہیں وہ کسی کا محتاج نہیں) نہ اس نے کسی کو جنا ہے نہ وہ جنا گیا اور نہ کوئی اس کا ہمسر ہے۔

قرآن مجید کی یہ سورہ توحید کی تعلیم کا نچوڑ ہے۔ اس میں خدا کی وحدانیت، اس کے یکتا، بے نیاز و بے مثال ہونے کو جس خوبصورتی اور جامع انداز میں اس سورہ میں پیش کر دیا گیا ہے وہ کہیں اور نہیں ملتی۔ توحید کے اثبات اور شرک کے ابطال کے حوالے سے سورہ زمر بھی انتہائی اہمیت کی حامل سورہ ہے۔ یہ سورہ بھی مکہ میں نازل ہوئی اور پوری سورہ میں--جو ۷۵؍ آیتوں پر مشتمل ہے---شرک کی جتنی بھی صورتیں اس زمانے میں رائج تھیں سب کا ابطال کیا گیا ہے اور خدا کی توحید کو ثابت کیا گیا ہے۔ توحید و شرک کے باب میں اس سورہ کا مطالعہ انتہائی اہمیت کا حامل ہے۔ البتہ یہاں اس کا موقع نہیں (طلبہ توحید کا مطالعہ کرتے ہوئے اس سورہ کا ترجمہ ایک بار ضرور پڑھ لیں) اب ہم بغیر کسی تفصیل و تفسیر کے قرآن مجید کی توحید کے اثبات سے متعلق کچھ منتخب آیات کو نقل کرتے ہیں:

وَإِلَـهُكُمْ إِلَهٌ وَاحِدٌ لاَّ إِلَهَ إِلاَّ هُوَ الرَّحْمَنُ الرَّحِيمُ (البقرہ:163)

ترجمہ: اور تمہارا معبود اکیلا معبود ہے۔ نہیں ہے کوئی معبود مگر وہی، جو بڑا مہربان اور نہایت رحم کرنے والا ہے۔

قُلْ يَا أَهْلَ الْكِتَابِ تَعَالَوْاْ إِلَى كَلَمَةٍ سَوَاء بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ أَلاَّ نَعْبُدَ إِلاَّ اللّهَ وَلاَ نُشْرِكَ بِهِ شَيْئاً وَلاَ يَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضاً أَرْبَاباً مِّن دُونِ اللّهِ (آل عمران:64)

ترجمہ: (اے پیغمبر) کہہ دو! اے اہل کتاب آئو ایک ایسے کلمے کی طرف جو ہمارے اور تمہارے درمیان برابر (مشترک) ہے یہ کہ ہم اللہ کے سوا کسی کی بندگی نہ کریں اور اس کے ساتھ کچھ بھی شریک نہ ٹھہرائیں اور نہ آپس میں ایک دوسرے کو اللہ کے علاوہ رب بنائیں۔

اللّٰهُ لا إِلَهَ إِلاَّ هُوَ الْحَيُّ الْقَيُّومُ (آل عمران:2)

ترجمہ: اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں وہ حی اور قیوم ہے۔ (یعنی وہ ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گا۔ وہ خود قائم ہے اور پوری کائنات کو قائم رکھے ہوئے ہے)

لا إِلَـهَ إِلاَّ هُوَ يُحْيِـى وَيُمِيْتُ (الاعراف:158)

ترجمہ: اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں، وہی زندگی اور موت دیتا ہے۔

لَيْسَ كَمِثْلِهٖ شَيْئٌ وَهُوَ السَّمِيْعُ الْبَصِيْرُ۔

ترجمہ: اس جیسا کوئی نہیں اور وہ سننے والا اور دیکھنے والا ہے۔

وَلَهُ الْكِبْرِيَاء فِيْ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ (الجاثیہ:37)

اور اسی کے لیے بڑائی ہے آسمانوں اور زمین میں۔ اور وہ غالب اور حکمت والا ہے۔

1.5 اللہ تعالیٰ کے اسماء وصفات

قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

اللّٰهُ لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ لَهُ الْأَسْمَاء الْحُسْنَى (طٰہٰ:8)

ترجمہ: اللہ کے علاوہ وہ کوئی معبود نہیں۔ اس کے لیے سب اچھے نام ہیں۔

ایک دوسری جگہ ارشاد ہوا ہے:

وَلِلّٰهِ الْأَسْمَاء الْحُسْنَى فَادْعُوهُ بِهَا (الاعراف:180)

ترجمہ: اور سب اچھے نام اللہ ہی کے لیے ہیں۔ تو اسے ان ناموں سے پکارو۔

اس سے پتہ چلتا ہے کہ جو بھی اچھے نام ہیں یا ہو سکتے ہیں، سب کے سب اللہ کے ساتھ مخصوص ہیں۔ انسان اشرف المخلوقات اس لیے ہے کہ اسے اللہ تعالیٰ نے اسماء کا علم عطا کیا۔ حضرت آدم کی تخلیق کے وقت ہی اللہ تعالیٰ نے فرمایا تھا: وعلم آدم الاسماء کلھا (اور آدم کو تمام اسماء کا علم دیا یا آدم کو تمام اسماء (نام) سکھائے) اور اسی بنا پر حضرت آدم مسجود ملائکہ قرار پائے۔ لیکن انسان کا یہ علم اسماء بھی محدود ہے۔ وہ کتنی بھی تگ و دو کر لے اللہ کے اسماء کو شمار نہیں کر سکتا۔ قرآن مجید اور احادیث مبارکہ میں اللہ تعالیٰ کے جن ناموں اور اوصاف کا ذکر آیا ہے وہ سو سے زیادہ ہیں۔ اللہ تعالیٰ کے ناموں کے حوالے سے جو صحیح احادیث وارد ہوئی ہیں ان کے مطابق آپؐ نے فرمایا ”اللہ تعالیٰ کے 99

(ننانوے) نام ہیں۔ جو ان کو محفوظ رکھے یا نگاہ میں رکھے وہ جنت میں داخل ہو گا۔ خدا طاق ہے اور طاق عدد کو پسند کرتا ہے"۔ (صحیح بخاری، کتاب التوحید، صحیح مسلم، کتاب الذکر) حدیث میں آخری ٹکڑا اس بات کو واضح کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے 99 نام ہی کیوں رکھے گئے سو کیوں نہ ہوئے؟ ایسا اس لیے ہوا کہ سو پورے ہونے کی صورت میں عدد طاق نہ رہ جاتا جب کہ اللہ تعالیٰ خود طاق ہے اور طاق عدد کو ہی پسند کرتا ہے۔ صحیح حدیثوں میں اللہ تعالیٰ کے ننانوے ناموں کی تفصیل یا صراحت موجود نہیں ہے۔ ناموں کی جو تفصیل ملتی ہے اس کی حقیقت یہ ہے کہ راویوں نے قرآن مجید اور صحیح حدیثوں سے تلاش و جستجو کے بعد انہیں اکٹھا کرنے کی کوشش کی ہے۔ اور انہیں الگ الگ بیان بھی کیا ہے۔ ایک تصریح کے مطابق یہ تمام نام وہ ہیں جو یا تو بطور علم یا بطور صفت قرآن پاک میں آئے ہیں، یا افعال کی حیثیت سے خدا کی طرف منسوب ہوئے ہیں یا آں حضرتؐ نے اپنی دعائوں میں ان کی تعلیم دی ہے۔ اللہ تعالیٰ کے یہ اسماء وصفات عام طور پر تین عنوانوں کے تحت جمع کیے جاتے ہیں۔ 1) اسماء وصفات جمال یعنی اللہ تعالیٰ کے وہ نام اور صفات جن سے اس کا رحم و کرم اور عفو و درگزر ظاہر ہوتی ہے۔ 2) اسماء و صفات جلال یعنی اللہ تعالیٰ کے وہ نام اور صفات جن سے اس کے جلال و جبروت، حکومت و استیلا اور شہنشاہی کا اظہار ہوتا ہے۔ 3) اسماء و صفات کمال یعنی وہ اسماء اور صفات جن سے اللہ تعالیٰ کی تنزیہہ، بلندی، کمالات کی جامعیت اور ہر قسم کے اوصاف حسنہ اور محامد عالیہ ظاہر ہوتے ہیں۔

1.5.1 اسماء وصفات جمال

ذیل میں اللہ تعالیٰ کے وہ اسماء وصفات درج کیے جا رہے ہیں جن سے اس کے رحم و کرم اور شفقت و محبت کا اظہار ہوتا ہے۔

اللہ: یہ اللہ وحدہٗ لاشریک کا اسم ذات ہے اور اسے قرآن پاک میں ہر جگہ علم (نام) کے طور پر استعمال کیا گیا ہے۔ یعنی ایسی ہستی جو اپنی شان اور جلال و برتری کے لحاظ سے اس قابل ہو کہ اس کی پرستش کی جائے اور اس کے آگے سر جھکایا جائے۔ جو بے انتہا قدرت کا مالک ہو، جس کی پناہ حاصل کی جائے اور جو اپنی مخلوقات کے ساتھ ایسی شفقت و محبت رکھے جو ایک ماں اپنے بچوں سے رکھتی ہے۔

الرحمان: اللہ کے بعد یہ دوسرا لفظ ہے جسے علم (نام) کی حیثیت حاصل ہے۔ اس کے معنی رحم والے کے ہیں۔ وہ جس کے رحم کی کوئی انتہا نہیں ہے۔

الرحیم: رحم کرنے والا۔ وہ جس کی رحمت میں تسلسل ہے۔ اصلاً یہ لفظ رِحم سے نکلا ہے یعنی بچہ دانی جس سے کہ بچہ پیدا ہوتا ہے۔ اس لیے اس میں بھی محبت کا جذبہ نمایاں ہے۔

رحمان اور رحیم اللہ تعالیٰ کی وہ دو صفتیں ہیں جن کا ذکر قرآن مجید میں بار بار آیا ہے۔ اس کائنات میں جو کچھ بھی ہے وہ اللہ کی انہیں دو صفات کا مظہر ہے اور اس کے بعد کی زندگی میں بھی جو کچھ ہو گا اس میں بھی اس کی صفات رحمانی و رحیمی کی کارفرمائی ہو گی۔

الرب: پرورش کرنے والا۔ یعنی وہ ہستی جو وجود کے پہلے مرحلے سے لے کر آخری منزل تک ہر لمحہ اور ہر لحظہ مخلوقات کی نشوونما اور ظہور و ترقی کی ذمہ دار ہے۔

اللطیف: لطف والا۔ مہربان۔

الودود: محبوب، محبت کرنے والا، پیار کرنے والا۔

المحب: محبت والا، پیار والا، چاہنے والا۔

العفو: معاف کرنے والا۔ درگزر کرنے والا۔

السلام: امن وسلامتی، صلح و آشتی، ہر عیب سے پاک و صاف۔

الشکور: اپنے بندوں کے نیک عمل کو قبول اور پسند کرنے والا۔

المومن: امان دینے والا، امن بخشنے والا، ہر خوف سے بچانے والا اور ہر مصیبت سے نجات دینے والا۔

الغفور و الغفار: معاف کرنے والا، گناہ بخشنے والا، درگزر کرنے والا۔

الوہاب: دینے والا، عطا کرنے والا، بخشنے والا۔

الحفیظ و الحافظ: حفاظت کرنے والا، نگہبان، بچانے والا۔

الرازق و الرزاق: روزی دینے والا، نشو و نما کا سامان بہم پہنچانے والا۔

الولی: دوست، حمایتی، طرف دار۔

المقسط: انصاف والا، عادل۔

المجیب: قبول کرنے والا، دعائوں کا سننے والا۔

الحلیم: بردبار، بندوں کی برائیوں سے چشم پوشی کرنے والا۔

الرؤف: مہربان، نرمی اور شفقت کرنے والا۔

الہادی: راہ دکھانے والا، رہنما۔

الکافی: اپنے بندوں کی ہر ضرورت کے لیے کافی۔

الحنان: ماں کی طرح بچوں پر شفقت کرنے والا۔

التواب و قابل التوب: توبہ قبول کرنے والا، گنہگار کے گناہوں سے درگزر کرکے دوبارہ اس کی طرف رجوع ہونے والا۔

المنان: احسان کرنے والا۔

ذوالطول: کرم والا۔

الکفیل: بندوں کی کفالت کرنے والا۔

المقیت: روزی پہنچانے والا۔

المجیر: پناہ دینے والا۔

النصیر: مدد کرنے والا۔

ذوالفضل: فضل والا۔

الوکیل: بندوں کی ضرورتوں کا ذمہ لینے والا، سامان کرنے والا۔

المغیث: فریاد کو پہنچنے والا، فریاد سننے والا۔

المغنی: بندوں کو اپنے سوا ہر چیز سے بے نیاز کرنے والا۔

1.5.2 اسماء وصفات جلال

یعنی اللہ تعالیٰ کے وہ اسماء وصفات جن سے اس کے جلال و جبروت، بڑائی و کبریائی اور حکومت و شہنشاہی کا اظہار ہوتا ہے:

الملک والملیک: بادشاہ، فرماں روا۔

العزیز: غالب جس پر کوئی دسترس نہ پائے۔

القاہر والقہار: جس کے حکم سے کوئی باہر نہیں جاسکتا، سب کو دبا کر اپنے قابو میں رکھنے والا۔

المنتقم: سزا دینے والا، برائیوں کا بدلہ دینے والا۔

الجبار: جبروت والا، جس کے سامنے کوئی دوسرا دم نہ مار سکے، جس سے کوئی سرتابی نہ کر سکے۔

المہیمن: سب پر شاہد اور گواہ اور دلیل۔

المتکبر: اپنی بڑائی دکھانے والا، کبریائی والا۔

شدید العقاب: سخت سزا دینے والا۔

شدید البطش: بڑی گرفت والا جس سے کوئی چھوٹ نہیں سکتا۔

1.5.3 اسماء وصفات کمال

یعنی اللہ تعالیٰ کے وہ اسماء وصفات جن میں اس کی خوبی، بڑائی، بزرگی اور ہر وصف میں اس کا کامل ہونا ظاہر ہوتا ہے۔ اس طرح کے اسماء وصفات کی پانچ قسمیں ہیں: 1) ایک وہ جو اللہ کی وحدانیت سے متعلق ہیں، 2) دوسرے وہ جو اس کے وجود سے متعلق ہیں، 3) وہ جو اس کے علم سے متعلق ہیں، 4) وہ جو اس کی قدرت سے متعلق ہیں، 5) وہ جو اللہ تعالیٰ کی پاکی اور تنزیہہ سے متعلق ہیں۔ ہم ان پانچوں کی تفصیل الگ الگ بیان کرتے ہیں۔

1.5.4 اسماء وصفات وحدانیت

یعنی وہ صفات جو اللہ کی وحدانیت سے متعلق ہیں۔

الواحد: ایک، اکیلا، تنہا۔

الاحد: ایک، یکتا، یک وتنہا۔

الوتر: طاق، جس کا کوئی جوڑا نہ ہو۔

اسماء وصفات وجود

یعنی اللہ تعالیٰ کے وہ اسماء وصفات جن سے اس کا وجود، بقا، دوام، ازلیت اور لازوال ہونا ظاہر ہوتا ہے۔ انہیں صفات وجودی بھی کہتے ہیں:

الموجود: وجود والا، ہست۔

القدیم: وہ جس سے پہلے کوئی دوسرا موجود نہیں، جو ہمیشہ سے ہے۔

الحی: ہمیشہ زندہ، غیر فانی۔

القیوم: جو بذات خود قائم ہے اور اپنے سہارے تمام کائنات کو سنبھالے ہوئے ہے۔

الباقی: جس کو ہمیشہ بقا ہے۔

الدائم: ہمیشہ رہنے والا۔

الاول: وہ پہلا جس کے پہلے کوئی نہیں۔

الآخر: وہ پچھلا جو سب کے فانی ہونے کے بعد بھی ہمیشہ باقی رہے گا۔

المقدم: جو سب سے آگے ہے۔

المؤخر: جو سب سے پیچھے رہ جائے گا۔

الظاہر: جس کا وجود کھلا اور نمایاں ہے (یعنی جو اپنے کاموں اور قدرتوں کے لحاظ سے ظاہر ہے)۔

الباطن: جو چھپا اور مخفی ہے (یعنی جو اپنی ذات کے لحاظ سے پوشیدہ ہے)۔

1.5.5 اسماء وصفات علم

یعنی اللہ تعالیٰ کے وہ اسماء اور صفات جو اس کے علم، باخبر اور آگاہ ہونے کو ظاہر کرتے ہیں:

الخبیر: خبر رکھنے والا۔

علام الغیوب: جو باتیں سب سے پوشیدہ ہیں ان کو جاننے والا۔

العلیم: جاننے والا۔

علیم بذات الصدور: دلوں کے چھپے ہوئے بھید کو جاننے والا۔

السمیع: سننے والا۔
المتکلم: بولنے والا، اپنے علم اور ارادے کو ظاہر کرنے والا۔
البصیر: دیکھنے والا۔
الواجد: پانے والا، جس کے علم سے کوئی چیز گم نہ ہو۔
الشہید: حاضر، جس کے سامنے سے کوئی چیز غائب نہیں۔
الحسیب: حساب کرنے والا یعنی جن چیزوں کا علم حساب کے ذریعہ سے حاصل کیا جاتا ہے یعنی وزن اور مقدار ان کا بھی جاننے والا۔
المحصی: گننے والا، یعنی جن چیزوں کا علم گن کر حاصل کیا جاتا ہے یعنی اعداد ان کا بھی جاننے والا۔
المدبر: تدبیر کرنے والا، انتظام کرنے والا۔
الحکیم: حکمت والا، عقل والا، سب کاموں کو مصلحت سے کرنے والا۔
المرید: ارادہ کرنے والا، مشیت والا۔
القریب: نزدیک جو اپنے علم کے لحاظ سے گویا سب کے پاس ہے۔

اسماء وصفاتِ قدرت

یعنی اللہ تعالیٰ کے وہ اسماء اور صفات جن سے اس کی قدرت کی وسعت کا اظہار ہوتا ہے:

الفاتح والفتاح: ہر مشکل کو کھولنے والا۔
القدیر والقادر: قدرت والا۔
المقتدر: اقتدار والا جس کے سامنے کوئی چوں چرا نہیں کر سکتا۔
القوی: زبردست جس کے سامنے کسی کا بس نہیں چل سکتا۔
المتین: مضبوط جس میں کوئی کمزوری نہیں۔
الجامع: جمع کرنے والا، متفرق اور پراگندہ چیزوں کو اکٹھا کرنے والا۔
الباعث: اٹھانے والا، مُردوں کو قبروں سے اٹھانے والا یا دنیا میں ہر واقعے اور حادثے کا محرک اول۔
مالک الملک: سلطنت کا مالک جس کے سامنے کسی کی کوئی ملکیت نہیں۔
البدیع: نئی نئی چیزیں ایجاد کرنے والا۔
الواسع: سمانے والا، جو ہر چیز کو سمائے ہوئے ہے۔
المحیط: احاطہ کرنے والا جو ہر چیز کو گھیرے ہوئے ہے، کوئی اس کے احاطۂ قدرت سے باہر نہیں۔
المحی والممیت: جلانے والا اور مارنے والا۔
القابض والباسط: سمیٹنے والا اور پھیلانے والا۔
المعز والمذل: عزت دینے والا اور ذلت دینے والا۔
الخافض والرافع: نیچا کرنے والا اور اونچا کرنے والا۔
المعطی والمانع: دینے والا اور روک لینے والا۔
النافع والضار: نفع پہنچانے والا اور نقصان پہنچانے والا، یعنی نفع اور ضرر دونوں اسی کے ہاتھ میں ہیں۔
المبدئ والمعید: جو چیز پہلے سے موجود نہ ہو اس کو وجود میں لانے والا اور جو ہو کر فنا ہو گئی ہو اس کو دوبارہ وجود میں لانے والا۔

1.5.6 اسماء وصفات تنزیہہ

یعنی اللہ تعالیٰ کے وہ اسماء اور صفات جو اس کی بڑائی، کبریائی، پاکی اور نیکی اور ہر عیب و نقصان سے اس کی برأت کو ظاہر کرتے ہیں۔

العلی: مرتبہ والا
الکبیر: بڑا
الجلیل: بزرگ
الغنی: بے نیاز
الماجد: عزت والا
القدوس: پاک
الجمیل: اچھا، خوبصورت
العدل: عادل
الصمد: بزرگی کی ہر صفت میں کامل

العظیم: عظمت والا
الرفیع: بلند
الکریم: شریف
الصادق: سچا، راست باز
الحمید: تعریف والا
الحق: سچا اور اصلی یعنی اس کے سوا سب باطل ہیں
البر: نیک
سبوح: ہر عیب سے پاک
الرشید: سیدھی راہ چلنے والا، نہ بھٹکنے والا

اللہ تعالیٰ کے اسماء وصفات کے بارے میں یہاں یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ اس کے ناموں اور صفات کا احاطہ ممکن ہی نہیں۔ 99 کا مطلب اللہ تعالیٰ کے اسماء وصفات کی کثرت بھی لیا جاسکتا ہے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ کی جلالی صفات کے حوالے سے یہ بات بھی یاد رکھنے کی ہے کہ قرآن مجید میں جہاں کہیں بھی اللہ تعالیٰ کی صفات جلال کا ذکر ہوا ہے اس کے ساتھ ہی اس کے عدل، حکمت اور علم کی صفات کا ذکر بھی کیا گیا ہے تا کہ کسی کو غلط فہمی نہ ہو اور یہ معلوم ہو کہ اللہ کا جلال بھی عدل وانصاف اور حکمت و مصلحت پر مبنی ہوتا ہے۔ اسی طرح بعض صفتیں ایسی ہیں کہ ان میں بظاہر قبح نظر آتا ہے۔ جیسے الضار (نقصان پہنچانے والا)۔ اس طرح کی صفات کے تنہا استعمال سے غلط فہمی پیدا ہو سکتی ہے اس لیے ان کا تنہا استعمال درست نہیں بلکہ ان کے ساتھ ان کے مقابل کی صفت بھی استعمال کی جاتی ہے یعنی الضار کے ساتھ النافع کا استعمال لازمی ہے۔ اس کا مقصد خدا کی قدرت کی وسعت کا اظہار ہے یعنی اگر کسی کو نقصان پہنچانے کی قدرت ہی حاصل نہ ہو تو اس کا نفع پہنچانا کوئی کمال نہیں۔ کمال یہ ہے کہ نقصان پہنچانے کی قدرت رکھنے کے باوجود نفع پہنچائے۔

1.6 صفات کے بیان کا مقصد

ذہن میں ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ قرآن مجید میں اور احادیث مبارکہ میں بھی اس کثرت کے ساتھ اللہ تعالیٰ کے اسماء و صفات کے بیان کا مقصد کیا ہے؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ انسان کو اللہ تعالیٰ نے زمین میں اپنا خلیفہ اور نائب بنایا ہے۔ اس حیثیت میں اس کے اندر ان صفات و خصوصیات سے نسبت کا پیدا ہونا ضروری ہے جس کا کہ وہ نائب ہے۔ گویا خلیفہ فی الارض ہونے کے ناطے انسان کی یہ ذمہ

داری ہے کہ وہ ان اوصاف سے نہ صرف نسبت پیدا کرے بلکہ اپنے لیے ان اوصاف کو معیار بناتے ہوئے ان کے حصول کی کوشش کرے۔ البتہ اس حوالے سے احتیاط کا پہلو یہ ہے کہ انسان کے لیے صرف انہیں اوصاف کا اپنانا لائق ستائش ہے جن کی نقل وہ کر سکتا ہے۔ وہ صفات جو صرف اللہ تبارک و تعالیٰ کے ساتھ مخصوص ہیں اور جو انسان کی حیثیت اور طاقت سے زیادہ ہیں ان سے روکا گیا ہے۔ اوپر اللہ تعالیٰ کی صفات کی جو تین قسمیں بیان کی گئی ہیں ان میں صفات جلال کا مستحق انسان نہیں ہو سکتا بلکہ بندگی اور عبدیت کا تقاضا یہ ہے کہ ان کے مقابل کی صفات انسان کے اندر پیدا ہوں مثلاً عاجزی، تواضع، خاکساری وغیرہ۔ اسی طرح اللہ سبحانہ تعالیٰ کی صفات کمال میں سے وحدانیت اور ازلی و ابدی کو چھوڑ کر انسان بقیہ اوصاف سے نسبت پیدا کر سکتا ہے۔ البتہ خدا کی صفات جمال وہ صفات ہیں جن سے نسبت پیدا کرنے، جن کو معیار بنانے اور جن سے فیض یاب ہونے کا دروازہ ہر صاحب توفیق انسان کے لیے کھلا ہے اور وہ اخلاق انسانی کا معیار ہیں۔ زمین میں اللہ کا خلیفہ اور نائب ہونے کی حیثیت میں انسان کو انہیں اپنانا اور اختیار کرنا چاہیے۔ اور ان صفات کا سب سے بڑا مظہر عفو و درگزر کی صفات ہیں' اللہ تعالیٰ گناہوں کو معاف کرنے والا اور ان سے درگزر کرنے والا ہے انسان کو بھی چاہئے کہ وہ دیگر انسانوں کے گناہوں پر پردہ ڈالے۔

1.7 عقیدۂ توحید کے تقاضے

اللہ تعالیٰ کی صفات میں صفت توحید (واحد، احد وغیرہ) کو بنیادی اہمیت حاصل ہے۔ جس طرح اسلام کی روح عقائد ہیں اسی طرح عقائد کی روح عقیدۂ توحید ہے؛ کیونکہ دوسری تمام صفات کا نقطۂ کمال یہی صفت ہے اس لیے ضروری ہے کہ عقیدۂ توحید کے تقاضوں کو جانا اور سمجھا جائے۔ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ کے فرمان اور رسول اللہؐ کے ارشادات کے مطابق عقیدۂ توحید کے اہم اور بنیادی تقاضے درج ذیل ہیں:

1. اللہ کے سوا کوئی نہیں جو خود اپنا وجود رکھتا ہو۔ صرف اللہ کی ذات ہے جو آپ سے آپ وجود میں ہے۔ اللہ کے علاوہ کائنات کی تمام چیزیں مخلوق ہیں اور اللہ کی ہی پیدا کی ہوئی ہیں۔ سب کا مالک وہی ہے۔ یہ ساری چیزیں اس کی محتاج ہیں اور سب پر اسی کا حکم چلتا ہے۔ ان تمام اشیاء میں ان کی اپنی کوئی ذاتی خوبی نہیں ہے بلکہ جو خوبیاں بھی ان کے اندر ہیں اللہ تعالیٰ کی پیدا کی ہوئی ہیں۔ اور یہ خوبیاں اسی وقت تک ان کے اندر رہ سکتی ہیں جب تک کہ اللہ تعالیٰ چاہے۔ اس کا تقاضا ہے کہ صرف اللہ تعالیٰ کو ازلی و ابدی، خالق و پروردگار مانا جائے۔

2. کائنات میں جو چیزیں بھی موجود ہیں ان میں صرف اور صرف ذاتِ باری تعالیٰ ایک ایسی ہستی ہے جو ان تمام سے مختلف اور الگ ہے۔ کوئی نہیں جو اس کی ہمسری یا ہم جنسی کا دعویٰ کر سکے۔ **لیس کمثلہ شیئی** (شوریٰ: 11)، اس کے مثل جیسی بھی کوئی چیز نہیں ہو سکتی۔ یہ حقیقت ہم سب جانتے ہیں کہ مثل اصل کے برابر نہیں ہوتی لہٰذا اس آیت کو سمجھنا آسان ہے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ کی ذات کو کسی بڑی سے بڑی ہستی پر بھی قیاس نہیں کر سکتے کیونکہ **واللّٰہ المثل الاعلیٰ** (نحل: 60)۔

خدا نہ کسی کا باپ ہے نہ کسی کا بیٹا۔ **لم یلد و لم یولد** (اخلاص: 3) (نہ اس نے کسی کو جنا ہے اور نہ وہ جنا گیا ہے)۔ نہ وہ کسی دوسری ہستی کے ساتھ متحد ہوتا ہے اور نہ کسی شئی کے اندر حلول کرتا ہے۔ نہ اس کا کوئی جسم ہے اور نہ ہی وہ جسمانی صفات رکھتا ہے۔

3. صرف اللہ تعالیٰ ہے جس کی رضا و خوشنودی کی انسان کو فکر کرنی چاہیے اور اس کے لیے جدوجہد اور کوشش بھی کرنی چاہیے۔

انسان کے جو بھی اور جتنے بھی اعمال ہیں ان کا اصل محرک بھی رضائے رب کا حصول ہونا چاہئے اور ان کا مقصد بھی یہی ہونا چاہیے کہ کسی طرح اللہ کی رضا اور خوشنودی حاصل ہو جائے۔

4. انسان کے وہ سارے اعمال اور حرکات جو اپنی حقیقت یا صورت کے اعتبار سے عبادت و پرستش جیسے یا اس کی قسم سے ہوں، وہ سب کے سب صرف اور صرف اللہ سبحانہٗ تعالیٰ کے لیے مخصوص ہونے چاہئیں۔ سجدہ صرف اسی کو کیا جا سکتا ہے، سر صرف اسی کے آگے جھکایا جا سکتا ہے۔ نذر صرف اسی کے نام کی مانی جا سکتی ہے۔ دعا صرف اسی سے کی جا سکتی ہے۔ نادیدہ پناہ صرف اسی کی ڈھونڈی جا سکتی ہے اور غیبی امداد کے لیے بھی صرف اسی کو پکارا جا سکتا ہے۔

5. انسان کے وہ جذبات اور احساسات بھی صرف اللہ تعالیٰ کے لیے ہی خاص ہونے چاہئیں جن کے اندر بندگی و سرافگندگی کی روح پائی جاتی ہو۔ توکل اور بھروسہ صرف اللہ تعالیٰ کی ذات پر کیا جائے۔ امیدیں صرف اسی سے وابستہ کی جائیں۔ تقویٰ صرف اللہ تعالیٰ کا اختیار کیا جائے، ڈر اور خوف صرف اسی کا رکھا جائے۔ حقیقی محبت صرف اسی سے کی جائے کسی دوسرے سے نہیں۔

6. اس پوری کائنات کا، جس کا ایک چھوٹا سا حصہ ہماری یہ دنیا ہے، مقتدرِ اعلیٰ صرف اور صرف اللہ تعالیٰ ہے۔ حکم دینے کا اختیار صرف اسی کو ہے، کسی کام سے منع کرنے کا حق بھی صرف اسی کو ہے اور اگر کوئی اپنی مرضی پوری کرانے کا اصل مستحق ہے تو وہ صرف اور صرف اللہ تعالیٰ ہے۔ حقیقی شارع اور قانون ساز بھی وہی ہے۔ کون سی مخلوق کون سے اور کیا کام انجام دے گی ان کے فرائض زندگی متعین کرنے کا اختیار بھی صرف اللہ تعالیٰ کو حاصل ہے۔ کسی مخلوق کے معاملے میں کیا فیصلہ کیا جائے، اسے معاف کرنے یا سزا دینے کا اختیار بھی پورے کا پورا صرف اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے۔

7. اللہ تعالیٰ کے علاوہ کوئی بھی اس شان کا حامل نہیں کہ اس کی عبادت کی جائے، اسے پوجا جائے، اس کے آگے سر جھکایا جائے یا اس کی رضا اور خوشنودی طلب کی جائے۔ اللہ کے علاوہ کوئی اور نہیں جو اس لائق ہو کہ اس کے آگے انسان کی پیشانی جھکے، کوئی اور نہیں جس کے سامنے نذر پیش کی جائے، کوئی نہیں جس کی نعمت کا اعتراف کیا جائے۔ اللہ کے علاوہ کوئی دوسرا نہیں جسے ولی اور کارساز، حاجت روا اور مشکل کشا سمجھا جائے۔ جس سے دعائیں کی جائیں اور حاجتیں مانگی جائیں۔ کوئی نہیں جسے غیبی مدد کے لیے پکارا جائے۔ کوئی نہیں جس پر توکل اور بھروسہ کیا جائے۔ اللہ کے سوا کوئی نہیں جس کا خوف اور تقویٰ رکھا جائے، جس سے کوئی امید وابستہ کی جائے اور جس سے حقیقی محبت کی جائے۔ اللہ کے سوا کوئی اور نہیں جس کے ہاتھ میں حقیقی اقتدار کا کوئی ذرہ بھی ہو، جو بال برابر بھی کسی کو نفع یا نقصان پہنچا سکتا ہو۔ جو کسی کے لیے قانون بنانے اور اپنا حکم چلانے کا ذاتی استحقاق رکھتا ہو اور جس کی بے قید اطاعت جائز ہو۔

یہ ہیں توحید کے وہ بنیادی تقاضے جو اس عقیدے کو تسلیم کر لینے کے بعد ایک انسان پر عائد ہوتے ہیں۔ یہ تقاضے اتنے اہم ہیں کہ اگر کوئی انسان ان میں سے کسی ایک کا بھی انکار کرتا ہے تو گویا اللہ پر ایمان کا اس کا دعویٰ کھوکھلا اور بے معنی ہے۔ مطلب یہ کہ عقیدۂ توحید کے جو بھی تقاضے اوپر بیان ہوئے ہیں، عقیدۂ توحید کے مفہوم میں وہ سب کے سب شامل ہیں اور صحیح معنوں میں مومن و مسلم ہونے کے لیے ضروری ہے کہ عقیدۂ توحید کو اس کے مکمل مفہوم اور تقاضوں کے ساتھ دل سے مانا اور تسلیم کیا جائے۔

1.8 عقیدۂ توحید کا اثر انسانی زندگی پر

پہلے یہ معلوم ہو چکا کہ توحید کا عقیدہ تمام عقائد کی جان ہے۔ اس عقیدے کو اس کے تمام تقاضوں کے ساتھ تسلیم کیے بغیر کوئی مسلمان نہیں ہو سکتا۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ توحید کا عقیدہ جب اس اہمیت کا حامل ہے تو اس کو تسلیم کر لینے کے بعد وہ کون سی تبدیلیاں ہیں جو ایک انسان کے اندر واقع ہوتی ہیں یا انسانی زندگی پر اس کے کیا اثرات مرتب ہوتے ہیں:

1. توحید کا اقرار کر لینے کے بعد انسان کے اندر سب سے پہلی اور اہم تبدیلی یہ رونما ہوتی ہے کہ موحد انسان کا ذہنی افق بہت وسیع ہو جاتا ہے۔ وہ تنگ نظر نہیں ہوتا۔ کیونکہ وہ ایک ایسے خدا پر یقین رکھتا ہے جس کی خدائی پوری کائنات کو محیط ہے، جس نے زمین و آسمان پیدا کیے اور جو مشرق و مغرب میں جو کچھ بھی ہے سب کا مالک ہے اور جو تمام جہانوں کا رب ہے۔ توحید پر ایمان لانے کے بعد بندے کو کائنات میں مخلوقات کے درمیان کہیں بھی فرق نظر نہیں آتی۔ سب اس کی نگاہ میں برابر ہو جاتے ہیں کیونکہ سب اسی ایک خالق و مالک کی ملکیت، غلام اور رعایا ہیں۔ ایک خدا پر ایمان لانے کے بعد بندے کی نظر غیر محدود ہو جاتی ہے۔ وہ دائروں کا پابند نہیں رہتا، اس کی ہمدردی، محبت اور خدمت کا دائرہ پوری انسانیت تک پھیل جاتا ہے۔ کوئی ایسا شخص جو توحید کا قائل نہ ہو اس کے اندر یہ وسعت نظری پیدا ہی نہیں ہو سکتی۔

2. کلمۂ توحید کے اقرار کے بعد انسان کے اندر غیر معمولی غیرت و خودداری اور عزت نفس پیدا ہو جاتی ہے۔ کیونکہ وہ جانتا ہوتا ہے کہ ایک ہی خدا ہے جو تمام طاقتوں کا مالک ہے۔ نفع اور نقصان پہنچانے کی قوت اور مارنے اور جلانے کی طاقت اسی کے ہاتھ اور اختیار میں ہے۔ جب بندے کو یہ یقین حاصل ہو جاتا ہے تو وہ قوت و طاقت کے ظاہری تمام مراکز سے بے خوف اور بے نیاز ہو جاتا ہے۔ وہ نہ کسی کے آگے سرِ نیاز خم کرتا ہے، نہ کسی کے سامنے ہاتھ پھیلاتا ہے اور نہ کسی سے ڈرتا اور خوف کھاتا ہے۔ وہ ایک خدا کے سامنے سجدہ کر کے دیگر تمام سجدوں سے نجات حاصل کر لیتا ہے۔ جب کہ ایسا انسان جو عقیدۂ توحید کا حامل نہ ہو معمولی معمولی مفادات کے حصول کے لیے جہاں تہاں سر جھکا دیتا ہے اور چھوٹے موٹے نفع و نقصان کی خاطر سبھی کے سامنے دست سوال دراز کر دیتا ہے۔

3. عقیدۂ توحید پر یقین انسان میں خودداری کے ساتھ ساتھ انکساری بھی پیدا کرتا ہے۔ خودداری اس لیے پیدا ہوتی ہے کہ وہ صرف ایک خدا کا بندہ اور غلام ہوتا ہے اور انکساری و عاجزی اس لیے پیدا ہوتی ہے کہ اس کے پاس جو کچھ ہوتا ہے اس کے بارے میں اسے یہ اچھی طرح معلوم ہوتا ہے کہ اس کے اپنے زور بازو کا نتیجہ نہیں محض اللہ کی دین اور نوازش ہے۔ اس نے جس طرح دیا ہے اسی طرح چھین بھی سکتا ہے۔ چنانچہ وہ غرور و تکبر اور ہر طرح کے گھمنڈ سے دور رہتا ہے۔ جب کہ اس کے بالمقابل ایسا شخص جو خدائے واحد پر یقین نہیں رکھتا اگر اسے کسی طرح کا دنیوی اقتدار اور کمال حاصل ہو جائے تو وہ متکبر ہو جاتا ہے کیونکہ وہ اپنی حصولیابیوں کو اپنے زور بازو کا نتیجہ سمجھتا ہے۔

4. عقیدۂ توحید کا ماننے والا انسان نیکی، پاک نفسی اور راست روی کا طریقہ اختیار کرتا ہے کیونکہ اسے یہ بات اچھی طرح معلوم

ہوتی ہے کہ نیک اعمال ہی کامیابی اور نجات کا ذریعہ ہیں۔ اگر وہ خدا کے احکام کی پابندی نہیں کرتا تو کوئی طاقت نہیں جو اسے عادل خدا کی گرفت سے بچا سکے۔ اس کے برعکس جو لوگ خدا پر یقین نہیں رکھتے اور نہ ہی ان کے پاس کوئی ہدایت و رہنمائی ہوتی ہے تو وہ لوگ جھوٹی توقعات اور امیدوں پر ادھر ادھر مارے مارے پھرتے ہیں۔ کوئی کسی مخلوق کو نذر و نیاز دے کر یہ سمجھتا ہے کہ وہ دنیوی ذمہ داریوں سے آزاد ہو گیا اور اب وہ جو چاہے کرتا رہے۔ کوئی کسی برگزیدہ شخصیت سے یہ توقع وابستہ کرلیتا ہے کہ وہ اس کی خدا کے ہاں سفارش کریں گے اور اسے اس کی بداعمالیوں سے بچالیں گے۔ کوئی خود کو اللہ کا چہیتا سمجھ بیٹھتا ہے اور سوچتا ہے کہ وہ کچھ بھی کرتا رہے اسے اس کے اعمال کی سزا نہیں ملے گی۔ اسی طرح کوئی یہ سمجھ لیتا ہے کہ خدا کا بیٹا ہمارے لیے کفارہ بن گیا، اب ہمارے گناہوں کی بازپرس نہیں ہوگی۔ سب اپنے نفس کے غلام اور بندے بن جاتے ہیں جب کہ مومن احکامِ الٰہی کا پابند ہوتا ہے۔

5. انسان بہت ہی عجلت پسند پیدا کیا گیا ہے۔ وہ فوراً ہی تمام نتائج حاصل کرلینا چاہتا ہے اور اگر اسے من چاہے نتائج نہیں ملتے تو وہ بہت جلد مایوسی کا شکار بھی ہو جاتا ہے۔ عقیدۂ توحید کا ماننے والا انسان کسی بھی حال میں دل شکستہ اور مایوس نہیں ہوتا کیونکہ وہ ایک ایسے خدا پر یقین رکھتا ہے جس کے قبضۂ قدرت میں زمین و آسمان کے تمام خزانے ہیں، جس کا فضل و کرم بے پایاں ہے اور جس کی قدرت کا کوئی اندازہ نہیں لگا سکتا۔ جب وہ ایسے ستودہ صفات خدا پر یقین رکھتا ہے تو پھر وہ کسی بھی حال میں مایوس نہیں ہوتا، ہمیشہ پر امید رہتا ہے کیونکہ اسے معلوم ہے کہ خواہ تمام ظاہری اسباب و وسائل اس کا ساتھ چھوڑ دیں پھر بھی اللہ کا سہارا اسے حاصل رہے گا۔ اور جب اسے اللہ کا سہارا حاصل رہے گا تو اس کی امیدیں بھی قائم رہیں گی اور وہ جدوجہد اور کوشش بھی کرتا رہے گا۔ اس کے برعکس جو لوگ ایک خدا پر یقین نہیں رکھتے ان کا سارا یقین ظاہری اسباب و وسائل پر ہوتا ہے اور جب ظاہری اسباب و وسائل نہیں حاصل ہو پاتے تو پھر وہ مایوس و دل شکستہ ہو جاتے ہیں۔ مایوسی کئی بار ان کو اس حد تک پہنچا دیتی ہے کہ وہ خودکشی تک کر گزرتے ہیں۔

6. عقیدۂ توحید کا حامل انسان حوصلہ مند اور پر عزم ہوتا ہے۔ اس کے اندر صبر و توکل کی زبردست طاقت ہوتی ہے۔ اس حوصلہ مندی اور طاقت کے سہارے ایمان والا دنیا کا بڑے سے بڑا کام کرنے کے لیے تیار ہو جاتا ہے کیونکہ اسے یقین ہوتا ہے کہ ظاہری اسباب و وسائل وہ ضرور استعمال کر رہا ہے لیکن اصل کرنے والی طاقت اللہ کی ہے اور چونکہ اللہ کا بندہ ہونے کے ناطے اسے اللہ کی مدد اور پشت پناہی حاصل ہے اس لیے تمام مشکلیں اور رکاوٹیں بھی وہی دور کرے گا۔

7. عقیدۂ توحید کا ایک اثر یہ بھی ہوتا ہے کہ اس عقیدے کا حامل انسان بزدل نہیں رہتا بلکہ وہ بہت ہی بہادر ہو جاتا ہے۔ چونکہ اس کا ایمان خدائے واحد پر ہوتا ہے اور وہ یہ سمجھتا ہے کہ اس کی جان و مال اور ہر چیز کا مالک اللہ ہی ہے اس لیے اسے کسی بھی چیز کا خوف نہیں رہتا۔ بنیادی طور پر کسی انسان کو دو چیزیں بزدل بناتی ہیں: 1) ایک جان و مال اور بال بچوں کی محبت اور 2) دوسری موت کا خوف۔ چونکہ بندۂ مومن خدا پر کامل یقین رکھتا ہے، اسے پتہ ہوتا ہے کہ کارساز صرف اللہ کی ذات ہے اور موت و حیات بھی اسی کے ہاتھ میں ہے' وہ اگر مارنا چاہے تو کوئی بچا نہیں سکتا اور اگر وہ زندہ رکھنا چاہے تو پھر دنیا کی کوئی طاقت اسے مار نہیں سکتی' تو پھر وہ دنیاوی اسباب سے بے نیاز ہو جاتا ہے اور بہادری کے وہ کارنامے انجام دیتا ہے کہ کفار و مشرکین اس کا تصور بھی نہیں کرسکتے۔ اس کے برعکس جو لوگ ایک خدا میں یقین نہیں رکھتے

ان میں جان ومال اور اولاد کی محبت بہت زیادہ ہوتی ہے اور وہ موت سے ڈرتے ہیں اس لیے بزدل ہو جاتے ہیں۔

.8 عقیدۂ توحید انسان کے اندر قناعت اور بے نیازی پیدا کرتا ہے۔ چونکہ اسے معلوم ہوتا ہے کہ دینے والی ذات اللہ تعالیٰ کی ہے وہ جس کو چاہے زیادہ دے، جسے چاہے کم دے، جسے چاہے عزت، طاقت اور ناموری دے اور جسے چاہے نہ دے۔ اسی طرح اسے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اس کا کام اپنی حد تک صحیح صحیح اور جائز طریقے سے کوشش کرنا ہے۔ کامیابی اور ناکامی خدا کے فضل پر موقوف ہوتی ہے۔ اس لیے اسے جو کچھ بھی مل جاتا ہے اس پر قناعت کرتے ہوئے خدا کا شکر بجالاتا ہے اور جو نہیں ملتا اس سے یہ سمجھ کر بے نیاز ہو جاتا ہے کہ اس میں اللہ کی مصلحت شاید کچھ اور ہے۔ اس کے برعکس جو لوگ خدا پر یقین نہیں رکھتے وہ دنیوی کامیابی وناکامی کو ہی سب کچھ سمجھتے ہیں اس لیے ان پر ہمیشہ حرص وہوس مسلط رہتی ہے اور وہ قناعت وبے نیازی سے محروم رہتے ہیں۔

.9 عقیدۂ توحید کا ماننے والا انسان خدا کے قانون کا پابند ہوتا ہے۔ وہ وہی کرتا ہے جو کچھ کہ خدا نے اسے کرنے کا حکم دیا ہے۔ وہ کام نہیں کرتا ہے جس سے کہ اسے اللہ نے روک دیا ہے۔ چونکہ مؤمن کو یقین ہوتا ہے کہ خدا ہر حاضر وغائب سے واقف ہے وہ ہر کھلے اور چھپے سے باخبر ہے اس لیے وہ اندھیرے اور تنہائی میں بھی، جب کہ بظاہر اسے کوئی دیکھ نہیں رہا ہوتا ہے کوئی کام ایسا نہیں کرتا جو خدا کو ناپسند ہو کیونکہ اسے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا علم بہت وسیع ہے وہ دلوں کے بھید سے بھی واقف ہے اس لیے کوئی بھی کام اس سے چھپا کر نہیں کیا جاسکتا۔ اسے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ وہ کسی بھی حال میں خدا کی پکڑ سے نہیں بچ سکتا، وہ بھاگنا بھی چاہے تو خدا کی قائم کردہ حدود سے باہر نہیں نکل سکتا اس لیے وہ خدا کی ہدایت پر اس طرح عمل کرتا ہے کہ جن چیزوں کو اس نے حرام کیا ہے ان سے ہر حال میں بچتا ہے اور جن کا حکم دیا ہے انہیں ہر حال میں بجالاتا ہے۔

عقیدۂ توحید کو اسلام میں مرکزیت اور بنیادی حیثیت حاصل ہے اگر کوئی سماج اس عقیدے پر قائم ہے یا اس میں عقیدۂ توحید کے ماننے والوں کی اکثریت ہے تو اس میں خیر کا پہلو غالب رہے گا۔ عقیدۂ توحید جیسے جیسے اور جتنا کمزور پڑتا جاتا ہے سماج سے خیر کم ہوتا جاتا اور برائیاں بڑھتی جاتی ہیں۔

1.9 اکتسابی نتائج

اس اکائی میں آپ نے درج ذیل نکات سیکھے:

- توحید عربی زبان کا لفظ ہے۔ اس کا مادہ "وحد" ہے اور اس کا لفظی معنی ایک بنانا یا یکتائی کو ثابت کرنا ہے۔ اسی لیے متکلمین اسلام کے نزدیک لفظ توحید کا اطلاق اللہ کی وحدانیت اور توحد پر کیا جاتا ہے۔ اس طرح توحید کا معنی اللہ کو ایک ماننا اور اس پر ایمان لانا ہے۔ اصطلاح میں توحید کا معنی یہ ہوا کہ اللہ کی ذات اور صفات میں کسی کو اس کا شریک نہ مانا جائے یعنی یہ عقیدہ رکھا جائے کہ الٰہ ہونے اور الوہیت کی خصوصیت میں کوئی بھی اللہ تعالیٰ کا شریک اور ساجھی دار نہیں ہے۔
- توحید یعنی خدا کے ایک ہونے کی ایک دلیل یہ بھی ہے کہ زمین وآسمان اور پوری کائنات کی ایک ایک چیز ایک نظم وضبط اور اصول

و قانون کی پابند ہے سورج چاند سے لے کر انسان، حیوان، ہوا، پانی اور جمادات و نباتات تک جہاں بھی نظر جاتی ہے یہی معلوم پڑتا ہے کہ ہر ایک مقررہ نظام اور اصول کا پابند ہے۔ وہ اس قانون سے ذرا بھی نہیں ہٹتا اور یہ قانون کی پابندی ہی اس دنیا کو قائم رکھے ہوئے ہے۔ انسان خود اپنے وجود ہی پر نظر ڈالے تو وہ خدا کی وحدانیت کا قائل ہو جائے۔

- اللہ تعالیٰ کے اسماء وصفات کے بارے میں یہاں یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ اس کے ناموں اور صفات کا احاطہ ممکن ہی نہیں۔ 99 کا مطلب اللہ تعالیٰ کے اسماء وصفات کی کثرت بھی لیا جاسکتا ہے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ کی جلالی صفات کے حوالے سے یہ بات بھی یاد رکھنے کی ہے کہ قرآن مجید میں جہاں کہیں بھی اللہ تعالیٰ کی صفات جلال کا ذکر ہوا ہے اس کے ساتھ ہی اس کے عدل، حکمت اور علم کی صفات کا ذکر بھی کیا گیا ہے تا کہ کسی کو غلط فہمی نہ ہو اور یہ معلوم ہو کہ اللہ کا جلال بھی عدل و انصاف اور حکمت و مصلحت پر مبنی ہوتا ہے۔

1.10 نمونہ امتحانی سوالات

1.10.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات

1. توحید کس زبان کا لفظ ہے؟

(a). عربی (b). فارسی (c). یونانی (d). انگریزی

2. شرک سب سے بڑا ظلم ہے؟

(a). صحیح (b). غلط (c). پتہ نہیں (d). سب غلط

3. قرآن مجید کی کون سی سورہ توحید کی تعلیم کا نچوڑ ہے؟

(a). اخلاص (b). سورہ لہب (c). سورہ ناس (d). سورہ فلق

4. صحیح حدیث کے مطابق اللہ تبارک وتعالیٰ کے کتنے نام ہیں؟

(a). 99 (b). 110 (c). 199 (d). 200

5. ”اللطیف“ کے معنی بتائیں؟

(a). مہربان (b). ظالم (c). خوفناک (d). سب صحیح

1. توحید کے عقلی دلائل بیان کیجیے۔
2. توحید کے دلائل قرآن مجید کی روشنی میں لکھیے۔
3. اللہ تعالیٰ کے اسماء وصفات کا جائزہ لیجیے۔
4. صفات جمال کی تعریف کرتے ہوئے پانچ معانی کے ساتھ لکھیے۔

5. اسماء صفات کمال اور اسماء صفات وحدانیت پر مضمون لکھیے۔

1.10.2 طویل جوابات کے حامل سوالات

1. توحید کے معنی و مفہوم پر تفصیلی مضمون لکھیے۔
2. عقیدہ توحید کے تقاضوں کا تفصیلی جائزہ لیجیے۔
3. انسانی زندگی پر عقیدہ توحید کے اثرات کا جائزہ لیجیے۔

1.11 تجویز کردہ اکتسابی مواد

---

1. عقیدہ اسلامی : علامہ محمد غزالی / محمد عنایت اللہ اسد سبحانی
2. دینیات : مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی
3. اسلام ایک نظر میں : مولانا صدرالدین اصلاحی
4. اسلامی تعلیمات : مولانا محمد سلیمان فرخ آبادی
5. اسلامی عقائد : علامہ عفیف عبدالفتاح طباہر / ڈاکٹر عبیداللہ فہد فلاحی
6. سیرہ النبی (جلد چہارم) : علامہ سید سلیمان ندوی

اکائی 2: رسالت

اکائی کے اجزا:

- 2.0 تمہید
- 2.1 مقاصد
- 2.2 رسالت: معنی و مفہوم
- 2.3 رسالت: اہمیت اور ضرورت
- 2.4 رسالت کی حقیقت
- 2.5 رسالت محمدی (صلی اللہ علیہ وسلم)
- 2.6 ختم نبوت
- 2.7 رسالت محمدیؐ کی خصوصیات
- 2.8 رسالت محمدیؐ پر ایمان کا تقاضہ
- 2.9 اکتسابی نتائج
- 2.10 نمونہ امتحانی سوالات
  - 2.10.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات
  - 2.10.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات
  - 2.10.3 طویل جوابات کے حامل سوالات
- 2.11 تجویز کردہ اکتسابی مواد

2.0 تمہید

اللہ تعالیٰ نے انسان کو پیدا کیا اپنی بندگی اور عبادت کے لیے، لیکن اسے یوں ہی چھوڑ نہیں دیا بلکہ انسان کی تمام تر ضروریات کا اس نے انتظام بھی کیا۔ پیدا ہونے سے لے کر انسان کی موت تک جن چیزوں کی بھی انسان کو ضرورت پڑتی ہے اللہ تعالیٰ نے اس دنیا میں وافر

مقدار میں مہیا کر رکھی ہیں اور انسان ان چیزوں سے فائدہ اٹھاتا ہے۔ سانس لینے کے لیے ہوا، پینے کے لیے پانی، کھانے پینے کے لیے طرح طرح کے اناج اور پھل اور نہ جانے کیا کیا چیزیں سب کچھ اللہ نے انسان کو دی ہیں۔ جو اللہ اپنے بندے کے تئیں اتنا زیادہ مہربان ہے کہ اس نے اس کے لیے تمام مادّی ضروریات فراہم کر رکھی ہیں کیا وہ ایسا ہو سکتا ہے کہ اپنے بندے کی روحانی ضرورت، جو اس کا مقصد تخلیق ہے، کا اس نے خیال نہیں رکھا ہو گا۔ ایسا ہر گز نہیں ہے۔ جس طرح اللہ تبارک و تعالیٰ نے انسان کی مادی ضروریات کا خیال رکھا ہے اسی طرح اس نے انسان کی روحانی ضروریات کو بھی پورا کیا ہے۔ انسان اللہ کا بندہ اور غلام ہے، کائنات کے چپے چپے پر اس کی نشانیاں موجود ہیں لیکن اللہ تعالیٰ نے اسی پر بس نہیں کیا کہ انسان اپنے طور پر ادھر ادھر سر مارتا پھرے بلکہ اس نے انسانوں کی ہدایت اور رہنمائی کا ایک مستقل نظام قائم کیا جس کے تحت اللہ کے منتخب بندے ہر قوم، ہر زبان، ہر علاقے اور ہر دور میں انسانیت کی ہدایت کا پیغام لے کر اس دنیا میں آتے رہے اور انسانوں کو یہ بتاتے رہے کہ انہیں اس دنیا میں اللہ کی مرضی کے مطابق کس طرح زندگی بسر کرنی چاہیے۔ اللہ تعالیٰ نے جس طرح پہلے انسان کو اس دنیا میں بھیجا (یعنی حضرت آدمؑ) اسے نبی بھی بنایا اسی طرح ہم کہہ سکتے ہیں اور یہ بالکل درست بھی ہے کہ انسانیت کے سفر کا اس دنیا میں آغاز پوری روشنی میں ہوا وہ ہدایت و رہنمائی کے لیے ادھر ادھر بھٹکتی نہیں پھری ہے۔

ہدایت و رہنمائی کے اس سلسلے کا نام ہی رسالت و نبوت ہے جس کا آغاز سیدنا حضرت آدمؑ سے ہوتا ہے اور جس سلسلے کی آخری کڑی ہمارے اور ساری دنیا کے رسولؐ حضرت محمدؐ ہیں۔ اس درمیان اللہ تعالیٰ نے انسانوں کی ہدایت و رہنمائی کے لیے مختلف علاقوں، قوموں، زبانوں اور زمانوں میں ایک روایت کے مطابق تقریباً ایک لاکھ چوبیس ہزار انبیاء و رسل اس دنیا میں مبعوث فرمائے اور ان سب نے ایک ہی پیغام اپنے اپنے زمانے اور علاقے میں انسانوں کو دیا کہ وہ اللہ کے بندے اور غلام بن کر رہیں۔ ایک مسلمان کے لیے ضروری ہے کہ وہ رسالت کے اس پورے سلسلے پر ایمان و یقین رکھے، جن کے نام اسے معلوم ہیں ان کے نام کے ساتھ اور جن کے نام معلوم نہیں ہیں ان پر عمومی طور پر۔ اور پھر یہ بھی یقین رکھے کہ حضرت محمدؐ اس سلسلہ رسالت کی آخری کڑی ہیں۔ اب رہتی دنیا تک ہدایت و رہنمائی کا کام انہیں کی تعلیمات اور دی گئی ہدایات میں ہے۔ دنیا و آخرت کی کامیابی اور فلاح کے لیے ضروری ہے کہ شریعت محمدیؐ کی پیروی کی جائے۔

2.1 مقاصد

اس اکائی کا مقصد اسلامی عقائد میں توحید کے بعد سب سے زیادہ اہمیت رسالت کی ہے۔ اس اکائی میں طلبہ کو یہ بتانے کی کوشش کی جائے گی کہ رسالت کی حقیقت کیا ہے؟ اس کا معنی و مفہوم کیا ہے؟ انسانیت کو رسولوں اور ان کی تعلیمات کی ضرورت کیوں ہے؟ رسولؐ کس طرح کے لوگوں کو بنایا جاتا ہے؟ آپ اس بات سے واقف ہو سکیں گے کہ اللہ تعالیٰ نے تسلسل کے ساتھ نبی اور رسولؐ کیوں بھیجے۔ سب سے آخر میں حضرت محمدؐ کو رسالت کے منصب پر فائز کیا۔ اب ان کے بعد کوئی نبیؐ اس دنیا میں نہیں آئے گا۔ نیز اس طرح آنحضرتؐ کی تعلیمات کی خصوصیات سے بھی طلبہ آگاہ ہوں گے۔

2.2 رسالت: معنی و مفہوم

رسالت عربی زبان کا لفظ ہے۔ اس کا مادہ ر س ل ہے اور اسی سے مصدر رسالت ہے یہ خط و کتابت کرنا، ربط پیدا کرنا، بھیجنا وغیرہ معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ سفارت اور پیغامبری (پیغام پہچانا) کے معنوں میں بھی یہ لفظ استعمال ہوتا ہے۔ اصطلاح شریعت میں رسالت اس سفارت اور پیغامبری کو کہتے ہیں جسے اللہ تعالیٰ نے انسانوں تک اپنے تشریعی احکام پہنچانے، انہیں اپنی تعلیمات وہدایات سے آگاہ کرنے اور انہیں اپنی مرضی کا راستہ یا طریقہ بتانے کے لیے قائم کیا۔ رسالت کا دوسرا نام نبوت بھی ہے۔ اسی سے رسولؐ کا لفظ بھی نکلا ہے اور عام طور پر قاصد، ایلچی، پیغام بر یا پیغام لانے والے کے لیے بولا جاتا ہے۔ اسلامی شریعت کی اصطلاح میں رسولؐ سے مراد اللہ کا وہ برگزیدہ اور منتخب بندہ ہوتا ہے جسے اللہ تعالیٰ انسانوں تک اپنا پیغام (اپنی مرضی اور ہدایات) پہنچانے کے لیے بھیجتا ہے۔ وہ اللہ تعالی کا منتخب کیا ہوا ہوتا ہے اور اس کا کام لوگوں کو ڈرانا اور خوش خبری دینا ہوتا ہے۔ رسولؐ آزاد ہوتا ہے، انسانِ کامل ہوتا ہے اور آدم کی اولاد میں سے ہوتا ہے۔

رسالت کا ادارہ یا شعبہ انسانیت کے آغاز سے ہی قائم ہے اور یہ اس وقت تک باقی اور قائم رہا جب تک کہ انسانیت علمی ترقی اور تمدنی ارتقاء کی اس خاص سطح اور منزل تک نہیں پہنچ گئی جہاں آخری اور کامل و مکمل ہدایت بھیجی جا سکتی تھی اور جو رہتی دنیا تک کے لیے ہدایت و رہنمائی کا کام کر سکتی تھی۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے دنیا میں سب سے پہلے انسان یعنی حضرت آدمؑ کو بھیجا اسے رسول بھی بنایا تاکہ وہ اپنی آنے والی نسلوں تک خدا کی مرضی اور احکامات کو پہنچا دے۔ اس کے بعد انسانیت جب جب خدا کے بتائے ہوئے راستے سے بھٹکتی اور گمراہ ہوتی رہی اللہ تعالیٰ اس کی ہدایت و رہنمائی کے لیے رسول اور نبی بھیجتا رہا ہے یہاں تک کہ سب سے آخر میں حضرت محمدؐ کو اپنی آخری اور مکمل ہدایت دے کر معبوث فرمایا جو جب تک کہ دنیا قائم اور باقی ہے، موجود رہے گی اور لوگوں کی ہدایت و رہنمائی کے کام آتی رہے گی۔ ایک روایت کے مطابق اللہ تعالیٰ نے دنیا میں کم و بیش ایک لاکھ چوبیس ہزار انبیاء و رسل رسالت کے ادارے کے تحت بھیجے جنہوں نے اپنے اپنے زمانے، علاقے قوم اور زبان میں اللہ کی مرضی اور احکام کو انسانوں تک پہنچانے کی ذمہ داری بحسن و خوبی انجام دی۔

2.3 رسالت: اہمیت اور ضرورت

رسالت اسلام کے بنیادی عقائد میں نہایت اہم عقیدہ ہے۔ عقیدہ توحید کے بعد رسالت کے عقیدے کی اہمیت سب سے زیادہ ہے‘ کیوں کہ رسالت کے عقیدے کو تسلیم کیے بغیر انسان یہ جان ہی نہیں سکتا کہ اس دنیا میں اسے بھیجے جانے کا مقصد کیا ہے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ رسالت کی اہمیت اور ضرورت کیوں اتنی زیادہ ہے؟ وہ کون سی وجوہات ہیں جو اس کو ضروری بنا دیتی ہیں؟ اور کیوں اسے ایمانیات میں شامل کیا گیا ہے؟

ہم سب کو معلوم ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو پیدا کیا۔ پیدا کر کے یونہی نہیں چھوڑ دیا بلکہ اس نے انسان کو دنیا میں اپنا نائب اور خلیفہ بنایا۔ اس نے انسان کی تمام طرح کی ضرورتوں کا خیال رکھا۔ اسے بہترین ساخت پر پیدا کیا اور پھر اس کے سانس لینے کے لیے ہوا چلائی۔ اس کی غذائی ضروریات کے لیے غلہ اگایا، اس کے لیے پانی کا ذخیرہ مہیا کیا۔ اس کے لیے دن رات، چاند، سورج غرض پوری کائنات

بنائی جس کا ایک ایک ذرہ انسان کی خدمت پر مامور ہے۔ انسان کے لیے اتنا سب کچھ کرنے کے بعد اس سے اللہ کا بس ایک مطالبہ ہے کہ وہ اس کی اطاعت و بندگی کرے، اس کی عبادت کرے اور اپنی زندگی کو اس کی مرضی کے تابع کر دے۔ اسی پر بس نہیں کیا بلکہ یہ وعدہ بھی فرمایا کہ انسان اگر دنیا میں اللہ کی مرضی کے مطابق اپنی زندگی گزارتا ہے تو اللہ اسے آخرت میں کامیاب و کامران کرے گا اور ابدی زندگی کے ساتھ ساتھ ابدی نعمتیں بھی عطا کرے گا۔

اب یہ سوال فطری طور پر اٹھتا ہے کہ انسان اللہ کی اطاعت و بندگی کیسے کرے؟ کہاں سے اسے اس سلسلے میں ہدایت ملے؟ اس کی عبادت کرنے کا طریقہ کیا ہو؟ اور اس کی مرضی کس طرح معلوم کی جائے، وہ کیسے یہ جانے کہ اللہ تعالیٰ کن باتوں کو پسند کرتا ہے اور کون سی باتیں ہیں جو اسے ناپسند ہیں؟ کن کاموں سے وہ خوش ہوتا ہے اور وہ کون سے کام ہیں جو اس کے غضب کو دعوت دیتے ہیں؟ بلاشبہ اللہ نے انسان کو عقل و شعور سے نوازا ہے، اسے سوچنے اور سمجھنے کے قوت دی ہے اور اسے ارادہ و اختیار کی آزادی بھی دی ہے۔ کہا جا سکتا ہے کہ انسان کو اللہ تعالیٰ نے جب عقل و شعور جیسی دولت دی ہے تو وہ اس کو استعمال کر کے اللہ کی مرضی کو معلوم کر سکتا ہے۔ لیکن فی الواقع ایسا نہیں ہے۔ تمام انسان تو کجا کوئی ایک فرد بھی محض اپنی عقل کے ذریعہ نہ اپنی زندگی اور نہ ہی اس کائنات کے حقائق معلوم کر سکتا ہے اللہ کی ذات اور اس کے تقاضوں کو جاننا تو بہت دور کی بات ہے۔ انسانی عقل اللہ کی رضا اور اس کے احکامات جان لینے سے پوری طرح قاصر ہے۔

یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ انسانی عقل نارسا ہو سکتی ہے لیکن نفس کی ریاضت کے ذریعہ انسان اپنے وجدان اور قوت ادراک کو اس درجہ ترقی دے سکتا ہے کو وہ اللہ کی مرضی اور اس کے احکامات تک رسائی حاصل کر لے۔ لیکن اول تو ہر انسان کے لیے ایسا ممکن ہی نہیں اور نہ ہی یہ ممکن ہے کہ ریاضت نفس کے ذریعے تمام انسان ایک ہی نتیجے تک پہنچیں۔ دوسرے یہ کہ کون یہ فیصلہ کرے گا کہ کسی نے ریاضت نفس کے ذریعہ جو ہدایات اور احکام حاصل کیے ہیں وہ الٰہی احکام اور اس کی مرضی ہیں۔ اس لیے خدا کی مرضی اور اس کی ہدایات کو جاننے کا یہ ذریعہ بھی ناقص ہے۔

اللہ کی ہدایات اور مرضی کو جاننے کا ایک تیسرا طریقہ یہ ہو سکتا ہے کہ ہر انسان فرداً فرداً اپنے طور پر ان کو جاننے کی کوشش کرنے کے بجائے لوگ اجتماعی طور پر غور و فکر کریں۔ لیکن یہ طریقہ بھی قابل عمل نہیں ہے۔ جب کوئی فرد غور و فکر کے نتیجے میں اللہ کے احکامات کو نہیں معلوم کر سکتا تو پھر افراد کا مجموعہ بھی ایسا نہیں کر سکتا۔ اس لیے یہ طریقہ بھی کامیاب نہیں ہو سکتا۔ اس بات میں کوئی شبہ نہیں کہ انسان ایک فطرت پر پیدا کیا گیا ہے اور اس فطرت کے ذریعہ اسے بہت سی چیزوں کی اچھائی یا برائی کا علم ہو جاتا ہے لیکن محض اس بنیاد پر کہ انسان بہت سی اچھی اور بری چیزوں کو خود بخود جان لیتا ہے یہ استدلال نہیں کیا جا سکتا کہ وہ اس طرح اللہ تعالیٰ کے تمام احکامات، ہدایات اور مرضی کو بھی معلوم کر سکتا ہے۔

اس طرح یہ کہنا صحیح ہے کہ انسان محض اپنے عقل و شعور، انفرادی و اجتماعی ریاضت اور وجدان کے ذریعہ اللہ تعالیٰ کے احکام اور مرضی کو نہیں جان سکتا۔ لیکن سوال یہ ہے کہ جس اللہ نے انسان کی تمام مادی ضروریات کا خیال رکھا اور انہیں فراہم کیا اس نے انسان کی اس بنیادی ضرورت، جس کے لیے وہ پیدا کیا گیا، اس کا خیال نہ رکھا ہو گا؟ بلاشبہ اللہ کی ذات کے ادراک کے لیے انسان کے اندرون سے لے

کر کائنات کے چپے چپے پر ایسے نشانات موجود ہیں جو اس کے خالق و مالک ہونے کا پتہ دیتے ہیں البتہ اس نے اپنی مرضی اور احکامات کو انسانوں تک ٹھیک ٹھیک اور پورے طور پر پہنچانے کے لیے ایک خارجی ذریعہ کا انتظام کیا۔ اللہ تعالیٰ انسان کا خالق، مالک اور رب ہے اس نے انسان کی تمام ضرورتوں کو جب پورا کیا ہے تو پھر اس کے عدل و حکمت کا تقاضا یہ بھی تھا کہ وہ انسان کی اس اہم ضرورت کو بھی پورا کرے، چنانچہ اس نے ایسا ہی کیا اور انسانوں ہی میں سے کچھ لوگوں کو اپنی پیغام رسانی کے لیے منتخب کیا تا کہ وہ اس کی مرضی اور احکام کو ٹھیک ٹھیک اور پورے طور پر انسانوں تک پہنچا دیں۔ اللہ تعالیٰ کے اس انتظام کا نام رسالت ہے اور اس نے اپنے جن بندوں کو اس کام کے لیے منتخب کیا انہیں ہم رسول کے نام سے جانتے ہیں۔

رسالت کے بغیر کوئی انسان اللہ تعالیٰ کی مرضی اور احکام کو نہیں جان سکتا اس لیے اللہ تعالیٰ کا مومن، مسلم اور فرماں بردار بندہ بننے کے لیے ضروری ہے کہ وہ رسالت پر ایمان لائے۔ رسالت پر ایمان لانا اس لیے بھی ضروری ہے کہ اس پر ایمان لائے بغیر انسان کو اللہ اور آخرت جیسے بنیادی عقائد کا بھی علم نہیں ہو سکتا۔ اس لیے رسالت اسلام کا بنیادی عقیدہ ہے۔

2.4 رسالت کی حقیقت

یہ بات ہمیں اچھی طرح معلوم ہے کہ دنیا کی ہر قوم، علاقے، زبان اور زمانے میں نبی اور رسول انسانوں کی ہدایت کے لیے مبعوث کیے جاتے رہے لیکن جب ہم مختلف مذہبی روایتوں کا مطالعہ کرتے ہیں تو پاتے ہیں کہ رسالت کا تصور ان کے یہاں کچھ زیادہ واضح نہیں ہے۔ ان میں بہت ساری چیزیں ایسی بھی پائی جاتی ہیں جو رسالت کی شان کے منافی بھی ہیں۔ یہ اسلام ہے اور پیغمبر اسلام حضرت محمدؐ ہیں جنہوں نے رسالت کی حقیقت کو پوری طرح واضح کیا اور یہ بتایا کہ رسالت ایک امتیازی وصف اور منصب ہے جسے اللہ تعالیٰ نے دنیا میں کچھ خاص انسانوں کو عطا کیا اور ان پر یہ ذمہ داری ڈالی کہ وہ خدا کی مرضی اور احکام کو لوگوں تک پہنچائیں۔ رسالت کے منصب پر جو لوگ بھی فائز ہوئے وہ انسانوں میں سے ہی تھے۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں گناہوں اور برائیوں سے محفوظ رکھا یعنی وہ معصوم تھے۔ وہ دنیا کی ہر قوم اور علاقے میں بھیجے گئے اور اللہ تعالیٰ نے جو ذمہ داری انہیں دی تھی انہوں نے اسے پورا پورا ادا کیا اور اس میں ذرا بھی کوتاہی نہ کی۔ آگے ہم رسالت سے متعلق بعض اہم حقیقتوں کو کسی قدر تفصیل کے ساتھ بیان کریں گے تا کہ اس کی حقیقت کو سمجھنے میں آسانی ہو۔

1. سبھی رسول انسان تھے

رسالت کی سب سے خاص بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس ذمہ داری کو ادا کرنے کے لیے انسانوں میں سے ہی کچھ لوگوں کا انتخاب کیا تا کہ وہ اس کے احکامات کو لوگوں تک پہنچائیں۔ اللہ تعالیٰ نے کسی دوسری مخلوق کے افراد کو کبھی بھی رسول نہیں بنایا نہ ہی خود کوئی روپ دھار کر کے انسانوں کے بیچ آیا۔ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَمَا أَرْسَلْنَا مِن قَبْلِكَ إِلاَّ رِجَالاً نُّوحِيْ إِلَيْهِم (یوسف:109)

ترجمہ: اور (اے محمدؐ) ہم نے تم سے پہلے بھی (رسولؐ بنا کر) صرف آدمیوں ہی کو بھیجا تھا، جن پر ہم وحی نازل کرتے تھے۔“

اس کی حکمت اللہ تعالیٰ کے نزدیک یہ تھی کہ اللہ نے رسولوں کو محض ڈاکیہ بنا کر نہیں بھیجا' بلکہ وہ پیغامبر کے ساتھ داعی، معلم، شارح اور خود ان احکام پر عمل کرنے والے بھی ہوتے تھے۔ لہٰذا ان کا انسانوں میں سے ہونا ضروری تھا تاکہ وہ لوگوں کے سامنے عملی نمونہ اور معیار بھی پیش کریں۔

2. رسول اللہ کے مخصوص منتخب بندے تھے

رسالت کوئی ایسی چیز نہیں جسے علم و ریاضت سے حاصل کیا جاسکے۔ یہ اللہ تعالیٰ کی خاص دین ہے جسے وہ اپنے خاص بندوں میں سے کچھ لوگوں کا انتخاب کر کے عطا کرتا ہے۔ اس پر کوئی دوسرا اپنا حق نہیں جتا سکتا۔ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ کا بہت ہی واضح ارشاد ہے:

اللّٰهُ أَعْلَمُ حَيْثُ يَجْعَلُ رِسَالَتَهُ(الانعام:124)

ترجمہ: اللہ زیادہ بہتر جانتا ہے کہ اسے اپنی پیغمبری کس کے سپرد کرنی چاہیے تھی۔

3. رسول ہر قوم میں بھیجے گئے

اللہ تعالیٰ نے ہر قوم میں نبی اور رسول بھیجے کیوں کہ انسان اور انسان سب برابر ہیں سب کا مقصد تخلیق ایک ہے، ذمہ داری اور جواب دہی میں سب برابر کے شریک ہیں۔ اس لیے اس کے عدل اور رحمت کا تقاضا تھا کہ وہ دنیا کی سبھی قوموں میں رسول اور نبی بھیجے اور اس نے ایسا ہی کیا۔ قرآن مجید میں ہے:

وَإِن مِّنْ أُمَّةٍ إِلَّا خلَا فِيُهَا نَذِيُرٌ(الفاطر:24)

ترجمہ: کوئی بھی قوم ایسی نہیں جس میں کوئی خبر دار کرنے والا (رسول) نہ گزر چکا ہو۔

4. رسول کی تعلیمات اللہ کی جانب سے ہوتی ہیں

رسول اللہ کا فرستادہ اور بھیجا ہوا ہوتا ہے۔ اس لیے دین و شریعت کے نام پر وہ جو کچھ بھی کہتا ہے اور لوگوں کو جو کچھ بھی بتاتا ہے سب کا سب اللہ کی جانب سے ہوتا ہے۔ رسولؐ دین کے معاملے میں اپنی طرف سے کچھ بھی نہیں کہتا ہے۔ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَمَا يَنطِقُ عَنِ الْهَوَى إِنْ هوَ إِلَّا وَحُيٌ يُوحَى(النجم:3-4)

ترجمہ: نبی (دین کے معاملے میں) اپنی خواہش سے کوئی بات نہیں کہتا۔ وہ جو کچھ کہتا ہے وہ صرف وہ وحی ہوتی ہے جو اس پر نازل کی جاتی ہے۔

5. رسول خطا سے معصوم ہوتا ہے

رسولؐ ہر طرح کی غلطی اور لغزش سے پاک اور محفوظ ہوتا ہے۔ وہ نفس، شیطان اور جذبات کے بہکاوے میں نہیں آتا۔ اس کی اخلاقی قوت اور فکری بصیرت ایسی کامل اور پختہ ہوتی ہے کہ اس کا نفس پورا کا پورا اس کے قابو میں ہوتا ہے۔ رسول کا معصوم ہونا اس کے

منصب رسالت کا تقاضا بھی ہے کیوں کہ اسی صورت میں وہ اللہ کے احکامات وہدایات کو پورے طور پر اور صحیح ڈھنگ سے لوگوں کے پاس پہنچا سکتا ہے۔ یہاں ایک بات یہ بھی یاد رکھنے کی ہے کہ معصوم صرف نبی ہی ہوتا ہے اس کے علاوہ انسانوں میں سے کوئی بھی خواہ وہ زہد و تزکیے کے کسی بھی منصب پر فائز ہو جائے معصومیت کا دعوی نہیں کر سکتا۔

6. رسول کی اطاعت فرض ہے

رسول اللہ کے احکامات وہدایات لے کر انسانوں کے پاس آتا ہے تا کہ وہ انہیں اس سے باخبر کرے۔ خود بھی ان پر عمل کرے اور لوگوں کو بھی ان پر عمل پیرا ہونے کی دعوت دے۔ اس لیے رسول کی مکمل اطاعت اور پیروی فرض ہے۔ دین کے معاملے میں رسول کے ہر فرمان کی بے چون وچرا تعمیل کی جانی چاہیے۔ یہ بھی ضروری نہیں کہ اس فرمان کی مصلحت سمجھ میں آتی ہے یا نہیں۔ کیوں کہ رسول سراپا حق ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَمَا أَرْسَلْنَا مِن رَّسُولٍ إِلاَّ لِيُطَاعَ بِإِذْنِ اللّهِ (النساء:64)

ترجمہ: ہم نے جس رسول کو بھی بھیجا اسی لیے بھیجا کہ اذن خداوندی کے مطابق اس کی پیروی کی جائے۔"

رسول کچھ بھی اپنی طرف سے نہیں کہتا بلکہ جو کچھ بھی کہتا ہے وہ اللہ کی جانب سے ہوتا ہے اس لیے رسول کی اطاعت حقیقت میں اللہ کی اطاعت ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

مَّنْ يُطِعِ الرَّسُولَ فَقَدْ أَطَاعَ اللّهَ (النساء:80)

ترجمہ: جو اللہ کے رسولؐ کی اطاعت کرتا ہے حقیقت میں وہ اللہ کی اطاعت کرتا ہے۔

7. تمام رسولوں پر ایمان لانا ضروری ہے

رسالت پر ایمان لانے کا مطلب یہ ہے کہ تمام رسولوں پر ایمان لایا جائے حضرت آدم سے لے کر حضرت محمدؐ تک جتنے بھی رسول اللہ تعالیٰ نے بھیجے سب پر ایمان لانا ضروری ہے۔ جن کا ذکر قرآن مجید میں نام کے ساتھ ہے ان پر نام کے ساتھ ایمان لانا ہے اور جن کا ذکر نام کے ساتھ نہیں آیا ان پر بحیثیت مجموعی، کیوں کہ اللہ نے ہر قوم میں رسول بھیجے ہیں۔ اگر کوئی شخص ایک رسول کا بھی انکار کرتا ہے تو وہ مسلمان نہیں ہو سکتا۔

2.5 رسالت محمدی (صلی اللہ علیہ وسلم)

لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ یعنی اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور حضرت محمدؐ اللہ کے (آخری) رسول ہیں، اسلام کا بنیادی کلمہ ہے۔ اور کوئی شخص اس وقت تک دائرہ اسلام میں داخل نہیں ہوتا جب تک کہ اس کلمے کا زبان سے اقرار نہ کرے، دل سے اس کی تصدیق نہ کرے اور اس کے تقاضوں پر عمل پیرا نہ ہو۔ اس کلمے میں خدا پر ایمان لانے کے ساتھ ساتھ محمد رسول اللہ پر بھی ایمان لانا ضروری قرار دیا گیا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جس طرح دوسرے تمام رسولوں پر ایمان لانا ضروری ہے اسی طرح حضرت محمدؐ پر بھی ایمان لانا ضروری ہے۔

آپ بھی انبیاء کے اسی سلسلے سے تعلق رکھتے ہیں جس نے کہ اللہ کے احکام وہدایات کو اپنے اپنے زمانے میں لوگوں تک نہ صرف پہنچایا بلکہ ان پر عمل کرکے بھی دکھایا۔ حضرت محمد ایک ایسے زمانے میں دنیا میں تشریف لائے جب الہی تعلیمات اس دنیا سے مٹ چکی تھیں۔ پوری دنیا میں گمراہی کا اندھیرا پھیلا ہوا تھا۔ دور دور تک روشنی کی کوئی کرن بھی دکھائی نہیں دیتی تھی۔ لوگوں نے سابقہ انبیاء کی تعلیمات کو بالکل ہی بھلا دیا تھا۔ کچھ لوگ ان کا نام ضرور لیتے تھے لیکن ان کی تعلیمات سے پوری طرح بے گانہ تھے۔ دعوی تو ان کے پیرو ہونے کا کرتے تھے لیکن ان کے اعمال وعقائد سے ان کے زبانی دعووں کی تردید ہوتی تھی۔ خدائی ہدایات جو کتابوں کی صورت میں انہیں ملی تھیں انہوں نے نہ صرف ان پر عمل کرنا چھوڑ دیا تھا بلکہ ان میں من مانی تحریفات کر دی تھیں۔ اس گھور اندھیرے سے انسانیت کو نکالنے اور اسے روشن راستے پر گامزن کرنے کے لیے ضرورت تھی کہ ایک اور نبی کی بعثت ہو۔ چنانچہ تاریخ کے اس اہم موڑ پر اللہ تعالیٰ نے اپنے آخری رسول حضرت محمد کو عرب کے صحرا میں بیت اللہ کے شہر مکہ مکرمہ میں مبعوث کرنے کا فیصلہ کیا۔

حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو ایک ایسے زمانے میں اور ایک ایسی قوم میں مبعوث کیا گیا جب ہر طرف گناہوں اور برائیوں کا بازار گرم تھا اور جو قوم تمدن سے نا آشنا تھی۔ اللہ کے رسولؐ ان ناسازگار حالات میں ایک ایسے انسان کے طور پر ابھرے جو اخلاق وکردار کا اعلی اور بہترین نمونہ تھا۔ جو برائیوں میں پوری طرح لت پت قوم کے درمیان پروان چڑھتے ہوئے بھی ان میں ذرا سا بھی ملوث نہیں ہوا اس نے ایک ایسی مثالی شخصیت کی تعمیر کی کہ نوجوانی میں ہی قوم نے اسے صادق اور امین جیسے اعزازات سے سرفراز کیا۔ اور جب اس نے اپنی نبوت کا اعلان کیا تو انکار کرنے والوں کے پاس سوائے ہٹ دھرمی کے کوئی دوسری دلیل نہ تھی۔ خود قرآن نے اس کی شہادت دی ہے:

فقد لبثت فیکم عمراً من قبله افلا تعقلون۔ (یونس:23)

ترجمہ: پس یقیناً میں تمہارے درمیان ایک عمر گزار چکا ہوں۔ کیا تم عقل سے کام نہیں لیتے۔

اس کے ساتھ ہی حضرت محمدؐ نے صرف 23 برس کی قلیل مدت میں اپنے اعلی اخلاق وکردار اور بہترین دعوت وتبلیغ کے ذریعہ اسلام کی دعوت کو نہ صرف یہ کہ مکّہ اور عرب کے علاقوں میں پھیلایا بلکہ اس دوران اسلام کی دعوت اس وقت کی معلوم دنیا کے دور دراز علاقوں تک بھی پہنچ گئی۔ آپ نے اخلاق وکردار کا ایسا نمونہ پیش کیا کہ آپؐ کے دشمن دوست اور مخالف موافق بن گئے۔ جن لوگوں نے آپؐ کو تنگ کرنے اور ستانے میں کوئی دقیقہ بھی چھوڑ نہ رکھا تھا جب آپؐ کو ان پر بھی فتح حاصل ہوئی تو ان سے بدلہ لینے کے بجائے انہیں معاف کر دیا۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ سب آپؐ کے گرویدہ ہو گئے۔

عرب کی وہ قوم جو تمدن نا آشنا تھی۔ جس کے اندر دنیا جہان کی برائیاں اور خرابیاں موجود تھیں آپؐ نے اپنی تعلیم وتربیت کے ذریعہ انہیں وحشت وجہالت سے نکال کر اعلی درجے کی مہذب اور متمدن قوم بنا دیا۔ ان کے اخلاق وکردار کو ایسا صیقل کیا کہ ان کی مثالیں دی جانے لگیں۔ ان کی تربیت اس طرح کی کہ وہ اسلام کے پیغام کو لے کر پوری دنیا میں پھیل گئے اور انسانیت کو اس کا بھولا ہوا سبق یاد دلانے میں اپنی زندگیاں اور تمام تر صلاحیتیں صرف کر دیں۔ 32 سال تک دعوت وتبلیغ کا فریضہ انجام دینے کے بعد جب آپؐ اس دنیا سے رخصت ہوئے تو اپنے پیچھے متبعین کی ایک ایسی ٹیم چھوڑی جس نے خود کو آپ کے مشن کے لیے پوری طرح وقف کر دیا تھا۔ اسے دنیا کا کوئی

بھی لالچ اس کے راستے سے ہٹا نہ سکتا تھا اور آپ نے رہتی دنیا تک اپنے پیروؤں کی ہدایت و رہنمائی کے لیے جو سامان چھوڑا وہ تھا کتاب (قرآن مجید) اور سنت (آپؐ کے اقوال، افعال اور تقریر و تائید)۔

دنیا میں حضرت محمدؐ کی ذات ہی ایسی واحد ہستی ہے جن کی زندگی کا (خاص طور سے نبوت کے بعد کی زندگی کا) ایک ایک لمحہ، ایک ایک عمل اور ایک ایک قول روز روشن کی طرح دنیا کے سامنے موجود ہے۔ آپؐ کو جو کتاب (قرآن مجید) اللہ کی جانب سے عطا ہوئی آپ نے اپنی زندگی ہی میں اسے سینوں اور سفینوں دونوں میں اس طرح محفوظ کرا دیا کہ آج تک اس میں ایک حرف یا ایک زیر و زبر کی تبدیلی نہیں ہوئی۔ کروڑوں اربوں کی تعداد میں قرآن مجید کے نسخے پوری دنیا میں پھیلے ہوئے ہیں لیکن ان میں ایک زیر زبر کا فرق بھی کوئی پیش نہیں کر سکتا۔ اسی طرح لاکھوں کی تعداد میں ایسے حفاظ کرام موجود ہیں جن کے سینوں میں قرآن مجید محفوظ ہے۔ اس کا کچھ نہ کچھ حصہ ہر مسلمان کو یاد ہے۔ قرآن دنیا کی واحد کتاب ہے جو سب سے زیادہ پڑھی جاتی ہے۔ اور یہ سب کچھ نبوت محمدؐ کا اعجاز ہے۔

2.6 ختم نبوت

رسالت و نبوت کا سلسلہ انسانیت کے آغاز سے ہی جاری ہے۔ پہلے انسان حضرت آدمؑ پہلے نبی بھی تھے، اس کے بعد دنیا جیسے جیسے آگے بڑھتی گئی جب جب ضرورت پڑتی رہی اللہ انسانوں کی ہدایت و رہنمائی کے لیے اپنے رسولؐ بھیجتا رہا اور سب سے آخر میں اس نے حضرت محمدؐ کو مبعوث فرمایا جن کی ہدایت و رہنمائی اب رہتی دنیا تک ہمیشہ کے لیے ہے۔ حضرت آدمؑ سے لے کر حضرت محمدؐ تک انسانوں کی ہدایت و رہنمائی کے لیے کم و بیش ایک لاکھ چوبیس ہزار پیغمبر اس دنیا میں تشریف لائے۔ یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے اور بجا طور پر پیدا ہوتا ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے ہدایت و رہنمائی کے لیے رسولوں کا اتنا طویل سلسلہ قائم کیا تو اب محمدؐ اللہ کے آخری رسولؐ کیوں؟ آپؐ کے بعد اب کوئی دوسرا رسول کیوں نہیں آسکتا؟ کیا آج کی دنیا میں گمراہی نہیں ہے جس کی ہدایت کے لیے رسول کی ضرورت نہ ہو؟

اس سوال یا ان جیسے دیگر سوالات کا جواب پانے کے لیے ہمیں تھوڑا پیچھے جانا ہوگا۔ ہم سب کو یہ بات اچھی طرح معلوم ہو چکی ہے کہ انسانوں کی ہدایت و رہنمائی کا کوئی ذریعہ سوائے اس کے نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے احکامات اور مرضی کو اپنے مخصوص بندوں کے ذریعہ ان کی قوموں تک پہنچائے۔ اس مقصد کے لیے اللہ تعالیٰ کئی بار اپنے رسولوں کو کتاب کی صورت میں بھی اپنی ہدایات عطا کرتا ہے۔ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ اللہ تعالیٰ رسول اور نبی روز روز مبعوث نہیں فرماتا بلکہ دنیا میں یا کسی قوم میں اللہ تعالیٰ اسی وقت نبی بھیجتا ہے جب اس سے پہلے نبی کی تعلیمات ختم ہو جائیں، لوگوں نے انہیں بدل ڈالا ہو یا جو کتاب اس کو دی گئی تھی لوگوں نے اس میں تحریف کر ڈالی ہو اور اب وہ اپنی اصلی صورت میں باقی نہ رہی ہو۔

اب ہم اس مسئلے پر آتے ہیں کہ نبی جب اس دنیا میں تشریف لائے تو کیا کسی نبی کی تعلیمات یا کوئی آسمانی کتاب اپنی اصل حالت میں دنیا میں موجود تھی۔ اس سے پہلے یہ ثابت کیا جا چکا ہے کہ ایسا نہیں تھا۔ آپ سے پہلے جو بھی انبیاء مبعوث ہوئے تھے یا جو بھی آسمانی کتابیں اللہ تعالیٰ نے نازل کی تھیں ان کی تعلیمات ختم ہو چکی تھیں۔ ان میں سے کوئی بھی اپنی اصل صورت پر باقی نہیں رہی تھی یہاں تک کہ

ان انبیاء کی زندگی کے حالات بھی ان کے پیروؤں کو پوری طرح معلوم نہیں تھے۔ ان کی تعلیمات پوری طرح مٹ چکی تھیں۔ اس لیے ایک نبی کی ضرورت تھی اور اس کے لیے اللہ تعالیٰ نے حضرت محمدؐ کا انتخاب کیا۔ اب سوال یہ رہ جاتا ہے کہ آپ کو آخری نبی کیوں بنایا؟ تو اس کا جو اب یہ ہے کہ اس وقت تک دنیا تدریج کے مراحل سے گزر رہی تھی آپؐ سے پہلے تک دنیا نے اتنی ترقی نہیں کی تھی کہ پوری دنیا کے انسانوں کے لیے کوئی ایک نبی ہی مبعوث کیا جاتا۔ اسی لیے ہم دیکھتے ہیں کہ تمام انبیاء کی بنیادی تعلیم (اللہ کی عبادت و اطاعت) ایک تھی لیکن شریعت و منہاج الگ الگ تھے۔ نبیؐ کے زمانے تک پہنچتے پہنچتے دنیا ترقی اور تمدن کے اس مرحلے میں داخل ہو چکی تھی جہاں پوری دنیا کی ہدایت و رہنمائی کے لیے ایک نبی اور ایک کتاب بھیجی جا سکتی تھی۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے محمدؐ کو آخری نبی بنا کر بھیجا اور آخری آسمانی کتاب قرآن مجید آپ پر نازل فرمائی تاکہ جب تک دنیا قائم رہے اللہ کی آخری کتاب اور حضرت محمدؐ کا اسوہ و تعلیمات انسان کی رہنمائی کرتے رہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ چودہ سو برس گزر جانے کے بعد بھی آپ کی زندگی اور تعلیمات صاف و شفاف آئینے کی طرح ہمارے سامنے ہیں۔ قرآن مجید جو آخری آسمانی کتاب ہے اور جو ہر طرح سے مکمل ہے وہ نہ صرف یہ کہ ایک زندہ زبان میں ہے بلکہ اس کا ایک ایک لفظ بلکہ ایک ایک حرف محفوظ ہے۔ ظاہر سی بات ہے کہ جب نبی کی زندگی اور آپ پر نازل ہونے والی کتاب کامل و مکمل دنیا میں موجود ہیں تو پھر کسی دوسرے نبی یا کتاب کی ضرورت کیوں کر پیش آسکتی ہے۔ اس لیے حضرت محمدؐ آخری نبی اور قرآن مجید آخری کتاب ہے۔ اب نہ تو کوئی دوسرا نبی آنے والا ہے نہ ہی کوئی دوسری کتاب نازل ہونے والی ہے۔ جب تک دنیا قائم ہے نبی کے اسوے اور قرآن مجید سے دنیا کو ہدایت و رہنمائی ملتی رہے گی۔ کسی بھی نبی کے بعد دوسرا نبی تین وجہوں سے آتا ہے:

1. پہلے نبی کی تعلیم و ہدایت مٹ گئی ہو اور اس کو دنیا کے سامنے پھر سے پیش کرنے کی ضرورت ہوں۔
2. پہلے نبی کو جو تعلیم و ہدایت دی گئی ہو وہ مکمل نہ ہو، بعد میں اس میں ترمیم یا اضافہ کرنے کی ضرورت ہو۔
3. پہلا نبی کسی خاص قوم یا علاقے کے لیے ہی بھیجا گیا ہو اور دوسری قوموں یا علاقوں کے لیے نبی کی ضرورت ہو۔

جب ہم حضرت محمدؐ کی بعثت اور زمانے پر غور کرتے ہیں تو پاتے ہیں کہ نئے نبی کی بعثت کی اوپر مذکور تینوں وجہوں میں سے کوئی بھی وجہ موجود نہیں ہے اس لیے اب آپ کے بعد کسی دوسرے نبی کے آنے کی ضرورت نہیں رہی۔ مثال کے طور پر پہلی وجہ کو لیجیے۔ حضرت محمدؐ کو جو تعلیم و ہدایت دی گئی تھی وہ مٹی یا ختم نہیں ہوئی بلکہ زندہ ہے۔ آپؐ نے جو تعلیمات و ہدایات دیں وہ نہ صرف یہ کہ پوری طرح محفوظ ہیں بلکہ ہر وقت اور ہر جگہ دستیاب بھی ہیں۔ کوئی جس وقت بھی دین اسلام کی تعلیمات و ہدایات کے بارے میں معلوم کرنا چاہے اسے معلومات مل جائیں گی۔ آپؐ نے جن باتوں سے روکا ہے وہ بھی معلوم ہیں اور جن کاموں کے کرنے کا حکم دیا ہے وہ بھی پوری طرح معلوم ہے۔ ان پر زمانہ گزرنے کا کوئی اثر نہیں پڑا ہے اس لیے جب آپؐ کے ذریعے آنے والی تعلیمات و ہدایات موجود ہیں اور مٹی نہیں ہیں تو پھر ان کی موجودگی میں نئے سرے سے کسی نئے نبی کے ذریعہ انہیں تعلیمات و ہدایات کے بھیجے جانے کی نہ تو کوئی ضرورت ہے۔ اور نہ ہی اس کی کوئی وجہ بنتی ہے۔

اسی طرح حضرت محمدؐ کے ذریعے جو دین اور شریعت اللہ تعالیٰ نے بھیجا وہ پوری طرح مکمل ہے۔ اس میں کسی طرح کی کوئی کمی نہیں

ہے۔ زمانہ خواہ کتنا بھی آگے کیوں نہ بڑھ جائے دین اسلام کی تعلیمات و ہدایات ہر زمانے اور حالات کے مطابق ہیں ان میں نہ تو کوئی کمی کرنے کی ضرورت ہے اور نہ ہی ان میں کچھ بڑھانے کی ضرورت ہے۔ جب دین اسلام میں کوئی نقص یا کمی ہے ہی نہیں وہ پوری طرح کامل واکمل ہے تو پھر نئے سرے سے کسی نئے نبی کے آنے کی کوئی ضرورت باقی نہیں رہ جاتی۔

حضرت محمدؐ کی دعوت صرف مکہ والوں یا عربوں کے لیے نہیں تھی۔ آپؐ دنیا کے لیے ہی نہیں عالمین (تمام جہانوں) کے لیے رحمت بنا کر بھیجے گئے تھے۔ آپؐ کو جو کتاب ہدایت دی گئی وہ صرف عربوں یا مسلمانوں کی ہدایت و رہنمائی کے لیے ہی نہیں بلکہ ھدی للناس (انسانوں کے لیے ہدایت) ہے۔ آپؐ کی رسالت پوری دنیا کے لیے اور تمام انسانوں کے لیے ہے۔ اس لیے کسی نئے نبی کی بعثت کی ضرورت نہیں رہ جاتی۔

یہ وہ وجہیں ہیں جن کی بنا پر اللہ تعالیٰ نے حضرت محمدؐ کو آخری نبیؐ بنا کر اور آخری آسمانی کتاب دے کر اس دنیا میں مبعوث فرمایا۔ آپؐ کی بعثت سے لے کر جب تک دنیا قائم ہے اب وہی دین لوگوں کی ہدایت و رہنمائی کے کام آتا رہے گا جسے آپؐ اس دنیا میں لے کر آئے تھے۔

2.7 رسالت محمدیؐ کی خصوصیات

اللہ تعالیٰ کے نزدیک دین ایک ہے۔ اس نے دنیا میں جتنے بھی رسول اور نبی بھیجے اسی دین کو لے کر بھیجے۔ اس اعتبار سے اگر دیکھا جائے تو سارے رسولوں کی دعوت ایک تھی اس لیے رسالت کے اوصاف میں تمام انبیاء برابر ہیں۔ البتہ حضرت محمدؐ کو اللہ نے اپنا آخری رسولؐ بنا کر بھیجا، ساری دنیا کے لیے رسول بنا کر بھیجا اور قیامت تک کے لیے رسول بنا کر بھیجا اس لیے حضرت محمدؐ کی رسالت کی کچھ نمایاں خصوصیات ہیں جو انہیں دوسرے انبیاء سے نمایاں و ممتاز کرتی ہیں:

1. حضرت محمدؐ کی رسالت عالم گیر ہے

حضرت محمدؐ کی رسالت کی سب سے پہلی اور نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ آپؐ کی رسالت عالم گیر ہے۔ آپ کسی خاص خطے یا قوم کے لیے نبیؐ بنا کر نہیں بھیجے گئے بلکہ آپؐ ساری دنیا کے لیے اور اس پر بسنے والے تمام انسانوں کے لیے نبی اور رسول بنا کر بھیجے گئے۔ آپؐ کی رسالت محدود نہیں ہے اس کا اعلان خود اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں کیا ہے:

وَمَا أَرْسَلْنَاكَ إِلَّا كَافَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيْراً وَنَذِيْراً وَلَكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُونَ (السبا:28)

ترجمہ: ہم نے تمہیں (اے محمدؐ) جو بھیجا ہے تو سارے ہی لوگوں کے لیے خوش خبری سنانے والا اور ڈرانے والا بنا کر بھیجا ہے۔ لیکن بہت سے لوگ نہیں سمجھتے۔

ایک دوسری جگہ فرمایا ہے: قُلْ يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنِّيْ رَسُولُ اللّٰهِ إِلَيْكُمْ جَمِيْعاً (الاعراف:158)

ترجمہ: (اے محمدؐ) کہہ دو کہ لوگو! میں تم سب لوگوں کی طرف اللہ کا رسول ہوں۔

یہ وہ خصوصیت اور امتیاز ہے جو رسولوں میں صرف اور صرف حضرت محمدؐ کو حاصل ہے، بقیہ جو بھی نبی اور رسول بھیجے گئے ان کی دعوت اپنی اپنی قوموں اور علاقوں کے لیے خاص اور محدود تھی۔ آپؐ ساری دنیا کی طرف معبوث کیے گئے' چنانچہ آپؐ نے خدا کا جو تصور پیش کیا وہ بھی عالم گیر اور آفاقی ہے کہ اللہ رب العالمین ہے (**الحمدللہ رب العالمین**) اسی طرح محمدؐ کو اللہ تعالیٰ نے جو کتاب (قرآن) دی وہ بھی عالم گیر ہے یعنی **ھدی للناس** (تمام لوگوں کے لیے ہدایت) ہے۔ اور خود محمدؐ کو بھی کسی کے ساتھ منحصر نہیں کیا بلکہ **رحمۃ للعالمین** (تمام جہانوں کے لیے رحمت) بنایا۔

2. حضرت محمدؐ کی رسالت ہمیشہ کے لیے (دائمی) ہے

حضور نبی پاکؐ کی رسالت کی دوسری بڑی اور اہم خصوصیت یہ ہے کہ آپ کی رسالت کسی خاص وقت یا زمانے کے ساتھ مخصوص نہیں ہے۔ بلکہ اب جب تک دنیا قائم اور باقی رہے گی تب تک کے لیے آپؐ ہی رسول، ہادی اور رہنما ہیں۔ وحی و رسالت کا سلسلہ آپؐ کی ذات پر ختم اور تمام ہو گیا۔ اب قیامت تک کوئی بھی نبی نہیں آئے گا۔ خود اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَلٰكِن رَّسُولَ اللّٰهِ وَخَاتَمَ النَّبِيِّيْنَ (الاحزاب:40)

ترجمہ: بلکہ وہ اللہ کے رسولؐ اور سارے نبیوں کے خاتم (مہر، آخری) ہیں۔

عربی زبان میں خاتم مہر کو کہتے ہیں۔ جب کسی دستاویز پر مہر لگا دی جاتی ہے تو گویا اب اس میں کسی اور چیز کا اضافہ نہیں ہو سکتا، اسی طرح سلسلہ رسالت کا خاتمہ آپؐ پر ہو گیا۔ اب کوئی بھی رسول آپ کے بعد نہیں آسکتا۔ اب قیامت تک جسے بھی ہدایت ملنی ہے اور جسے بھی نجات کے راستے پر گامزن ہونا ہے اسے ہدایت و نجات آپؐ کے بتائے ہوئے راستے پر چل کر ہی ملے گی۔

3. حضرت محمدؐ کی رسالت (دین و شریعت) کامل و مکمل ہے

حضرت محمدؐ کی رسالت کی تیسری اہم خصوصیت یہ ہے کہ آپؐ کو جو دین اللہ کی جانب سے عطا ہوا اور جو شریعت آپ کو دی گئی وہ ہر پہلو سے کامل اور مکمل ہے۔ اس میں کہیں سے بھی کسی طرح کا ذرا بھی نقص اور کمی نہیں ہے۔ بلاشبہ دین تو اللہ نے ایک ہی بھیجا لیکن اس کی تکمیل کا اعلان حضرت محمدؐ پر ہی کیا۔ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ (المائدہ:3)

ترجمہ: (لوگو!) آج میں نے تمہارے لیے تمہارے دین کو مکمل کر دیا اور تم پر اپنی نعمت پوری کر دی۔

اس طرح دین کامل ہونے کا شرف صرف اسلام کو حاصل ہے جس کی دعوت حضرت محمدؐ نے لوگوں کی دی۔ یہاں ایک ضروری احتیاط یہ ہے کہ دوسرے مذاہب کو ناقص نہ کہا جائے کیوں کہ وہ جن لوگوں میں اور جس زمانے میں بھیجے گئے ان کی ضروریات کے لیے کافی تھے۔ حضرت محمدؐ پر آکر رسالت کے ساتھ ساتھ دین کی بھی تکمیل ہوئی ہے۔

4. حضرت محمدؐ پر نازل ہونے والا پیغام (قرآن مجید) محفوظ ہے

حضرت محمدؐ کی رسالت کی چوتھی خصوصیت یہ ہے کہ آپؐ کو جو پیغام قرآن کی صورت میں اللہ تعالیٰ کی جانب سے دیا گیا وہ پوری طرح محفوظ ہے۔ اس میں ذرا بھی کہیں پر کسی طرح کی کمی بیشی نہیں ہوئی۔ اس کتاب کا ایک ایک لفظ اور ایک ایک نقطہ اسی طرح محفوظ ہے جس طرح کہ آپؐ کے زمانے میں تھا اور قیامت تک یہ اسی طرح محفوظ رہے گا کیونکہ اس کی حفاظت کی ذمہ داری خود اللہ تعالیٰ نے لی ہے: اور اس کا یہ وعدہ ہے:

إِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَإِنَّا لَهُ لَحَافِظُونَ (الحجر:9)

ترجمہ: اس میں کوئی شبہ نہیں کہ یہ قرآن ہم نے نازل کیا ہے اور یقیناً اس کی حفاظت کرنے والے بھی ہم خود ہی ہیں۔

یہ مسلمانوں کا عقیدہ اور عقیدت نہیں تاریخ اس پر گواہ ہے کہ قرآن مجید جیسا کہ حضرت محمدؐ پر نازل ہوا تھا بعینہٖ ایک زبر زیر کے فرق کے بغیر آج تک محفوظ ہے۔ مسلمانوں نے اس کی حفاظت حفظ و تلاوت اور کتابت ہر طریقے سے کی ہے اور اب جس طرح کے حالات ہیں اس میں قرآن مجید کے قیامت تک بعینہ محفوظ رہنے میں کسی طرح کے شک وشبہے کی گنجایش بھی باقی نہیں رہی۔

5. حضرت محمدؐ کی زندگی اور سیرت بھی محفوظ ہے

حضرت محمدؐ کی رسالت کی پانچویں خصوصیت یہ ہے کہ آپؐ کی پوری زندگی اور سیرت کا ایک ایک واقعہ تاریخ کی پوری روشنی میں ہے اور محفوظ ہے۔ دنیا کا کوئی بھی لیڈر اور رہنما ایسا نہیں گزرا جس کی زندگی کے حالات ان تفصیلات کے ساتھ موجود ہوں جن کے ساتھ کہ نبی کے حالات زندگی محفوظ ہیں۔ آپؐ کی زبان سے جو کچھ بھی نکلا اور آپؐ کے اعضاء وجوارح سے جن افعال واعمال کا بھی صدور ہوا آپؐ کے ساتھیوں نے اور ان کے بعد ان کے ساتھیوں نے پوری طرح محفوظ کر لیا اور یہ سلسلہ آج تک جاری ہے۔

6. حضرت محمدؐ کی زندگی اسوہ اور نمونہ ہے

حضرت محمدؐ کی زندگی کی چھٹی خصوصیت یہ ہے کہ آپؐ کی زندگی میں تمام شعبہ ہائے زندگی سے تعلق رکھنے والوں کے لیے اسوہ اور نمونہ موجود ہے۔ ایک مسلمان کی گھریلو زندگی کیسی ہو اس کے لیے حضور کی زندگی کا نمونہ موجود ہے۔ تجارت اور کاروبار مسلمان کرے تو کیسے کرے اس کے لیے بھی نبیؐ ؐکی زندگی میں نمونہ موجود ہے۔ سیاست کے میدان میں قدم رکھے تو کون اس کا رہنما ہو اس کی رہنمائی بھی نبی کی زندگی میں موجود ہے۔ غرض ہر طرح کے حالات میں مسلمانوں کی ہدایت ورہنمائی کے لیے نبیؐ ؐکی زندگی میں نمونہ موجود ہے۔

7. حضرت محمدؐ کا پیغام اور دعوت عملی ہے

حضرت محمدؐ کی رسالت کی ساتویں خصوصیت یہ ہے کہ آپ کی دعوت بالکل عملی ہے۔ آپ کا ارشاد ہے: ”الدین یسر“ (دین آسان ہے) اس کا واضح مطلب یہ ہے کہ حالات خواہ کیسے بھی بدل جائیں، دین اسلام میں وہ لچک موجود ہے کہ ہر طرح کے حالات میں اس پر عمل کرنا اور ایک باعمل مسلمان کی زندگی گزارنا آسان ہے۔ آج دنیا نے کتنی زیادہ ترقی کر لی ہے انسان نے فضاؤں میں کمندیں ڈال دی ہیں لیکن دین اسلام کی موزونیت کو کبھی کہیں کوئی خطرہ درپیش نہیں ہوا۔ اسلام ایک زندہ اور موزوں مذہب کے طور پر انسانیت کی ہدایت و رہنمائی کے لیے آج بھی موجود ہے۔

8. حضرت محمدؐ نے اپنے پیغام پر خود عمل کر کے دکھایا

رسالت محمدی کی آٹھویں خصوصیت یہ ہے کہ آپؐ نے محض افکار و نظریات نہیں پیش کیے۔ بلکہ جس پیغام کی طرف آپؐ نے لوگوں کو بلایا پہلے خود اس پر عمل کر کے دکھایا۔ آپؐ نے لوگوں سے جن بنیادوں پر سماج کی تشکیل کا مطالبہ کیا پہلے خود انہیں بنیادوں پر ایک کامیاب معاشرہ تشکیل کر کے لوگوں کے سامنے پیش کیا۔ ام المومنین سیدہ حضرت عائشہؓ سے سوال کیا گیا کہ آپؐ کی زندگی کیسی تھی؟ انہوں نے اس کے جواب میں فرمایا کہ کیا تم نے قرآن مجید نہیں پڑھا؟ اللہ کے رسولؐ کی ذات چلتا پھرتا قرآن مجید تھی۔

9. حضرت محمدؐ نے دین کو ایک مکمل نظام حیات کے طور پر پیش کیا

رسالت محمدؐی کی نویں خصوصیت یہ ہے کہ آپؐ نے دین کو صرف چند عقائد اور عبادات تک محدود نہیں رکھا بلکہ اسلام کو ایک نظام زندگی کے طور پر پیش کیا۔ جس میں سماج کے تمام طبقات اور زندگی کے تمام گوشوں کے لیے ہدایت و رہنمائی موجود ہے۔

2.8 رسالت محمدیؐ پر ایمان کا تقاضہ

اللہ تعالیٰ نے انسانوں کی ہدایت کے لیے رسالت کا سلسلہ قائم کیا اور ہر زمانے علاقے اور قوم میں اپنے رسول لوگوں کی ہدایت و رہنمائی کے لیے بھیجے سب سے آخر میں اس نے حضرت محمدؐ کو اپنا آخری رسول بنا کر اور اپنا آخری پیغام (قرآن مجید) دے کر بھیجا اب حضرت محمد کے بعد کوئی دوسرا نبی آنے والا نہیں۔ آپؐ آخری رسول ہیں اور آپ کی رسالت کی حیثیت یہ ہے کہ وہی قیامت تک باقی رہنے والی ہے۔ قیامت تک اب کوئی دوسرا نبی اس دنیا میں نہیں بھیجا جائے گا۔ لہذا اب اگر کسی کو نجات حاصل کرنا ہے، خدا کی ہدایت اور رہنمائی کا طالب ہونا ہے تو اسے یہ نجات اور ہدایت و رہنمائی یہیں سے ملے گی۔ اس لیے اس پر ایمان لائے بغیر کوئی چارہ نہیں۔ اس لیے ضروری ہے کہ رسالت محمدیؐ پر نہ صرف ایمان لایا جائے بلکہ اس کے لازمی تقاضوں کو بھی پورا کیا جائے۔

اس کا پہلا تقاضہ یہ ہے کہ صرف اور صرف دین اسلام کی پیروی کی جائے۔ کیوں کہ اب دنیا میں کوئی ایسا مذہب باقی نہیں جس کی اصل تعلیمات اور ہدایات باقی اور محفوظ ہوں۔ صرف اسلام ہی ایک ایسا مذہب ہے جس کی تعلیمات و ہدایات باقی و محفوظ ہیں۔ اس لیے اب اگر کسی کو خدا کی بھیجی ہوئی ہدایات اور تعلیمات پر عمل کرنا ہے تو اس کے لیے ضروری ہے کہ دین اسلام کی پیروی کرے۔ خود اللہ تعالیٰ کا قرآن مجید میں ارشاد ہے:

إِنَّ الدِّيْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الإِسْلاَمُ (آل عمران:19)

ترجمہ کوئی شک نہیں کہ اللہ کے نزدیک (مقبول) دین اسلام ہے۔

اسی طرح ایک دوسری جگہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَمَن يَبْتَغِ غَيْرَ الإِسْلاَمِ دِيْناً فَلَن يُقْبَلَ مِنْهُ (آل عمران:85)

ترجمہ: اور جو کوئی اسلام کے سوا کسی اور دین کا طالب ہو گا تو اللہ کے یہاں اس کی طرف سے یہ دین ہرگز قبول نہ کیا جائے گا۔

ان آیتوں میں بالکل واضح کر دیا گیا ہے کہ اب اگر کسی کو ہدایت حاصل کرنی ہے اور اللہ کی مرضی کے مطابق زندگی گزارنی ہے تو اس کے لیے صرف اور صرف ایک راستہ ہے اور وہ ہے اسلام کا راستہ جس کی دعوت حضرت محمدؐ نے انسانوں کو دی ہے۔

رسالت محمدی پر اس کی خصوصیات کے ساتھ ایمان لانے کا دوسرا تقاضہ یہ ہے کہ آخرت کی نجات اب صرف اور صرف اسلام کو ماننے اور اس کے بتائے ہوئے طریقے پر چلنے میں ہے۔ کیوں کہ اب جب کہ دین صرف اسلام ہی ہے، تمام لوگوں کو ہدایت و نجات کے لیے صرف اسی کی پیروی کرنی ہے تو آخرت کی نجات بھی صرف اسلام کی پیروی کرنے میں ہے۔ حضرت محمدؐ سے پہلے جو بھی شریعتیں اور طریقے اللہ تعالیٰ نے بھیجے تھے حضرت محمدؐ کی رسالت نے ان سب کو منسوخ کر دیا ہے۔ اب کامل اور مکمل دین و شریعت محمدؐ کے ذریعہ انسانوں تک پہنچ چکا اس لیے جو لوگ آخرت کی نجات کے طلب گار ہیں ان کے لیے ضروری ہے کہ وہ اسی آخری دین اسلام کی پیروی کریں اور اسی پر عمل پیرا ہو کر نجات کی امید کریں۔

2.9 اکتسابی نتائج

اس اکائی میں آپ نے درج ذیل نکات سیکھے:

- رسالت عربی زبان کا لفظ ہے۔ اس کا مادہ ر س ل ہے اور اسی سے مصدر رسالت ہے یہ خط و کتابت کرنا، ربط پیدا کرنا، بھیجنا وغیرہ معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ سفارت اور پیغامبری (پیغام پہنچانا) کے معنوں میں بھی یہ لفظ استعمال ہوتا ہے۔ اصطلاح شریعت میں رسالت اس سفارت اور پیغامبری کو کہتے ہیں جسے اللہ تعالیٰ نے انسانوں تک اپنے تشریعی احکام پہنچانے، انہیں اپنی تعلیمات و ہدایات سے آگاہ کرنے اور انہیں اپنی مرضی کا راستہ یا طریقہ بتانے کے لیے قائم کیا۔
- رسالت کے بغیر کوئی انسان اللہ تعالیٰ کی مرضی اور احکام کو نہیں جان سکتا اس لیے اللہ تعالیٰ کا مومن، مسلم اور فرماں بردار بندہ بننے کے لیے ضروری ہے کہ وہ رسالت پر ایمان لائے۔ رسالت پر ایمان لانا اس لیے بھی ضروری ہے کہ اس پر ایمان لائے بغیر انسان کو اللہ اور آخرت جیسے بنیادی عقائد کا بھی علم نہیں ہو سکتا۔ اس لیے رسالت اسلام کا بنیادی عقیدہ ہے۔
- اللہ تعالیٰ نے انسانوں کی ہدایت کے لیے رسالت کا سلسلہ قائم کیا اور ہر زمانے علاقے اور قوم میں اپنے رسول لوگوں کی ہدایت و رہنمائی کے لیے بھیجے سب سے آخر میں اس نے حضرت محمدؐ کو اپنا آخری رسول بنا کر اور اپنا آخری پیغام (قرآن مجید) دے کر بھیجا اب حضرت محمد کے بعد کوئی دوسرا نبی آنے والا نہیں۔ آپؐ آخری رسول ہیں اور آپ کی رسالت کی حیثیت یہ ہے کہ وہی قیامت تک باقی رہنے والی ہے۔ قیامت تک اب کوئی دوسرا نبی اس دنیا میں نہیں بھیجا جائے گا۔ لہذا اب اگر کسی کو نجات حاصل کرنا ہے، خدا کی ہدایت اور رہنمائی کا طالب ہونا ہے تو اسے یہ نجات اور ہدایت و رہنمائی یہیں سے ملے گی۔
- آپؐ کو اللہ نے انسانوں کی ہدایت و رہنمائی کے لیے اپنی آخری کتاب قرآن مجید۔ یہ کتاب اور نبی کا اسوہ پوری طرح محفوظ ہے حالات چاہے کیسے بھی اور کتنے ہی بدل جائیں اللہ کے رسول کی زندگی اور قرآن مجید انسانوں کی ہدایت کے لیے کافی ہیں۔ ہدایت اور رہنمائی صرف اور صرف قرآن مجید اور محمدؐ کی تعلیمات سے مل سکتی ہے اور آخرت کی نجات بھی اب صرف اور صرف اسلام

کو ماننے اور اس کے احکام و ہدایات پر عمل کرنے میں ہے۔

- دنیا میں حضرت محمدؐ کی ذات ہی ایسی واحد ہستی ہے جن کی زندگی کا (خاص طور سے نبوت کے بعد کی زندگی کا) ایک ایک لمحہ، ایک ایک عمل اور ایک ایک قول روز روشن کی طرح دنیا کے سامنے موجود ہے۔ آپؐ کو جو کتاب (قرآن مجید) اللہ کی جانب سے عطا ہوئی آپ نے اپنی زندگی ہی میں اسے سینوں اور سفینوں دونوں میں اس طرح محفوظ کرا دیا کہ آج تک اس میں ایک حرف یا ایک زیر وزبر کی تبدیلی نہیں ہوئی۔ کروڑوں اربوں کی تعداد میں قرآن مجید کے نسخے پوری دنیا میں پھیلے ہوئے ہیں لیکن ان میں ایک زیر زبر کا فرق بھی کوئی پیش نہیں کر سکتا۔

2.10 نمونہ امتحانی سوالات

2.10.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات

1. رسالت کس زبان کا لفظ ہے؟

(a). عربی (b). انگریزی (c). ہندی (d). یونانی

2. اللہ نے دنیا میں کم و بیش کتنے انبیاء و رسل کو بھیجے؟

(a). ایک لاکھ چوبیس ہزار (b). دو لاکھ (c). پانچ لاکھ (d). پچاس ہزار

3. رسالت اسلام کا بنیادی عقیدہ ہے۔

(a). صحیح (b). غلط (c). پتہ نہیں (d). سب صحیح

4. رسالت و نبوت کا آغاز کس سے شروع ہوتا ہے؟

(a). حضرت آدمؑ (b). حضرت محمدؐ (c). حضرت ابراہیمؑ (d). حضرت عیسیٰؑ

5. نبوت کا سلسلہ کس پر ختم ہوتا ہے؟

(a). حضرت محمدؐ (b). حضرت اسحٰقؑ (c). حضرت نوحؑ (d). سب صحیح

6. آخری آسمانی کتاب کون سی ہے؟

(a). قرآن مجید (b). توریت (c). زبور (d). انجیل

7. آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت عالم گیر ہے؟

(a). ہاں (b). نہیں (c). پتہ نہیں (d). سب صحیح

8. کتاب قرآن مجید کس پر نازل ہوئی؟

(a). حضرت محمدؐ (b). حضرت ابراہیمؑ (c). حضرت اسماعیلؑ (d). حضرت موسیٰؑ

9. حضرت محمدؐ کی رسالت ہمیشہ کے لیے ہے؟

(a). وقتی　　(b). صحیح　　(c). غلط

10. حضرت محمدؐ پر نازل ہونے والا پیغام (قرآن مجید) محفوظ ہے؟

(a). صحیح　　(b). غلط　　(c). پتہ نہیں

2.10.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات

1. رسالت کا معنی و مفہوم پر ایک نوٹ لکھیے۔
2. رسالت محمدیؐ پر ایمان کے تقاضوں پر روشنی ڈالیے۔
3. رسالت کی حقیقت کو واضح کیجیے۔
4. حضرت محمدؐ کی نمایاں خصوصیات کو بیان کیجیے۔
5. رسالت محمدی پر اپنی معلومات قلم بند کیجیے۔

2.10.3 طویل جوابات کے حامل سوالات

1. رسالت کی اہمیت اور ضرورت پر ایک تفصیلی مضمون لکھیے۔
2. حضرت محمدؐ کی رسالت کی خصوصیات بیان کیجیے۔
3. ختم نبوت کو دلائل کے ساتھ واضح کیجیے۔

2.11 تجویز کردہ اکتسابی مواد

1. عقیدہ اسلامی : علامہ محمد غزالی / محمد عنایت اللہ اسد سبحانی
2. دینیات : مولانا سید ابوالاعلی مودودی
3. اسلام ایک نظر میں : مولانا صدرالدین اصلاحی
4. اسلامی تعلیمات : مولانا محمد سلیمان فرخ آبادی
5. اسلامی عقائد : علامہ عفیف عبدالفتاح طباہر / ڈاکٹر عبید اللہ فہد فلاحی
6. سیرہ النبی (جلد چہارم) : علامہ سید سلیمان ندوی

اکائی 3: آخرت

اکائی کے اجزا:

3.0 تمہید
3.1 مقاصد
3.2 آخرت: معنی و مفہوم
3.3 عقیدہ آخرت کی اہمیت اور ضرورت
3.4 عقیدہ آخرت قرآن مجید میں
3.5 آخرت کی زندگی کے مختلف مراحل
  3.5.1 برزخ
  3.5.2 قیامت
  3.5.3 حساب کتاب اور جزاوسزا
  3.5.4 جنت اور جہنم
3.6 شفاعت اور اس کا اسلامی تصور
3.7 عقیدہ آخرت کا اثر انسانی زندگی پر
3.8 اکتسابی نتائج
3.9 نمونہ امتحانی سوالات
  3.9.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات
  3.9.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات
  3.9.3 طویل جوابات کے حامل سوالات
3.10 تجویز کردہ اکتسابی مواد

3.0 تمہید

انسان اس دنیا میں پیدا ہوتا ہے۔ ایک عمر یہاں پر گزارتا ہے اور پھر ایک وقت وہ بھی آتا ہے جب وہ دنیا میں اپنی زندگی کے دن پورے کر کے یہاں سے رخت سفر باندھتا ہے یعنی انسان کی دنیوی زندگی کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔ جس طرح دنیا میں انسان کی پیدائش اور پھر زندگی ایسی حقیقتیں ہیں جن کو جھٹلایا نہیں جا سکتا، اسی طرح موت (یعنی دنیوی زندگی کا خاتمہ) بھی ایک ایسی اٹل حقیقت ہے جس کا انکار آج تک کوئی نہیں کر سکا۔ جو بھی جاندار اس دنیا میں پیدا ہوا ہے، اسے ضرور بالضرور ایک دن مرنا بھی ہے اس حقیقت کو سبھی تسلیم کرتے ہیں، خواہ وہ کسی بھی مذہب اور عقیدے کے ماننے والے ہوں یا سرے سے کسی مذہب یا خدا کا انکار کرتے ہوں۔ موت برحق ہے اس کا اعتراف سبھی کو ہے۔ لیکن موت کے بعد کیا ہے؟ اس حوالے سے انسانی ذہن نے کافی ٹھوکریں کھائی ہیں۔ انسانوں کا ایک گروہ تو وہ ہے، جو بزعم خود اپنے آپ کو عقل کل سمجھتا ہے اور سائنس داں وغیرہ ہونے کے دعوے کرتا ہے۔ اس کے خیال میں یہ دنیا کی زندگی ہی کل ہے۔ موت کے بعد کچھ بھی نہیں، مرنے کے بعد انسان گل سڑ کر مٹی میں مل جاتا ہے۔ اس کے بعد کچھ ہونے والا نہیں۔ ماضی کے دہریوں کا بھی دنیوی زندگی اور موت کے بارے میں یہی خیال تھا۔ دوسرا گروہ وہ ہے جو کسی نہ کسی مذہب کو مانتا ہے اس کے خیال میں یہ دنیوی زندگی ہی سب کچھ نہیں ہے بلکہ اس کے خاتمے یعنی موت کے بعد بھی ایک زندگی ہے۔ البتہ موت کے بعد کی زندگی کے حوالے سے اس گروہ میں بھی دو طرح کے خیالات پائے جاتے ہیں۔ ایک یہ کہ مرنے کے بعد انسان اسی دنیا میں دوسرا جنم لیتا ہے۔ اور جیسے اس نے اعمال اپنی پہلی زندگی میں کیے ہوئے ہیں اسی کے مطابق اس کی دوسری زندگی کی شکل وصورت طے ہوتی ہے۔ اور اس طرح آواگون کا ایک لامتناہی سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ دوسرا خیال یہ ہے کہ انسان کی دنیوی زندگی کے خاتمے کے بعد ایک دوسری زندگی ہے جس میں اسے دوبارہ زندگی دی جائے گی اور جیسے اچھے برے اعمال اس نے اس دنیوی زندگی میں کیے ہوں گے اس کے مطابق اسے دوسری زندگی میں بدلہ ملے گا۔ یہ دوسری زندگی ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ہو گی۔ اگر اس نے اچھے کام کیے ہوں گے تو ہمیشہ کے لیے نعمتوں بھری زندگی اس کا مقدر ہو گی اور اگر اس کی برائیوں اور غلط کاموں کا پلڑا بھاری ہو گا تو پھر ہمیشہ ہمیش کے لیے سزا اس کا مقدر ہو گی۔

3.1 مقاصد

آخرت کا عقیدہ اسلام کے بنیادی عقائد میں سے ایک ہے۔ آخرت پر ایمان لائے بغیر کوئی شخص مسلمان نہیں ہو سکتا۔ آخرت پر ایمان لانے کا کیا مطلب ہے؟ اس کے تقاضے کیا ہیں؟ وہ کون سے امور ہیں جو عقیدہ آخرت کے ضمن میں آتے ہیں اس اکائی میں ہماری کوشش ہو گی کہ آخرت کے عقیدہ پر بھرپور روشنی ڈالتے ہوئے ان تمام مباحث کا احاطہ کریں جو اس عقیدے کے ضمن میں آتے ہیں۔ تاکہ طلبہ اس اکائی کے بعد ان تمام باتوں سے واقف ہو جائیں۔ اسی عقیدے کی وجہ سے انسان کے اندر جواب دہی کا جو تصور پیدا ہوتا ہے اور اس جوابدہی کے احساس کے نتیجے میں انسان کی زندگی پر جو اثرات مرتب ہوتے ہیں ان سے بھی طلبہ کو واقفیت ہو گی۔

3.2 آخرت: معنی و مفہوم

آخرت عربی زبان کا لفظ ہے۔ اس کی اصل ء خ ر ہے جس کے معنی بعد میں آنے کے ہوتے ہیں۔ آخرت (ۃ) کا لفظ آخر کا مونث ہے اور اس کا معنی ہے ’سب سے بعد کی‘۔ آخرت کا لفظ صفت کے طور پر استعمال ہوتا ہے لیکن عربی زبان کا ایک قاعدہ یہ ہے کہ کئی بار صفت کو موصوف کا قائم مقام بنا دیا جاتا ہے اور موصوف کو ظاہر نہیں کیا جاتا۔ مثال کے طور پر دنیا کے لفظ کو لے سکتے ہیں جس کے معنی ”قریب ترین“ کے ہیں۔ یہ لفظ بھی صفت ہے اور اس کا موصوف الحیاۃ (زندگی) یا الدار (گھر) ظاہر نہیں کیا جاتا لیکن جب دنیا کا لفظ ہم بولتے ہیں تو اس سے مراد قریب ترین زندگی (یعنی اس جہان کی زندگی) یا قریب ترین گھر (یعنی موجودہ عالم یا جہاں) مراد ہوتا ہے۔ اسی طرح آخرت کا لفظ بول کر اس سے مراد بھی الحیاۃ الآخرۃ ((بعد میں آنے والی (پچھلی) زندگی یا الدار لآخرۃ (بعد میں آنے والا (پچھلا) گھر ہوتا ہے۔ یعنی ابھی جو زندگی ہے۔ اس کے خاتمے کے بعد آنے والی دوسری زندگی۔ ایک تحقیق کے مطابق قرآن پاک میں آخرت کا لفظ اس معنی میں 113 (ایک سو تیرہ) جگہ استعمال ہوا ہے اور ہر جگہ اس کا موصوف الحیاۃ یا الدار ہے۔

ایک اصطلاح کے طور پر جب ہم آخرت کا لفظ استعمال کرتے ہیں تو اس سے مراد موت کے بعد سے شروع ہونے والے وہ تمام مراحل، منازل اور مقامات ہوتے ہیں جو انسان کی موت سے لے کر حشر و نشر، حساب کتاب اور جنت و جہنم تک پیش آتے ہیں۔ اس طرح گویا جو شخص آخرت پر ایمان لانے کا اقرار کرتا ہے وہ فی الواقع درج ذیل چیزوں پر ایمان لانے کا اقرار کرتا ہے۔

1. ایک دن ایسا آئے گا جب اللہ تعالیٰ اس دنیا کو اور اس میں جو بھی مخلوقات ہیں سب کو مٹا کر ختم کر دے گا۔ اس دن کو قیامت کہتے ہیں۔
2. اس کے بعد اللہ تعالیٰ ایک نئی دنیا برپا کرے گا۔ سب کو (جو بھی اس دنیا میں رہے ہوں) ایک دوسری زندگی عطا کرے گا۔ اس دن سب اللہ کے سامنے حاضر ہوں گے۔ اس دن کا نام حشر ہے۔
3. دنیا میں جو بھی آیا ہے اور اس نے اپنی دنیا کی زندگی میں جو بھی عمل کیے ہیں۔ ان سب کاموں کا کچا چٹھا (نامہ اعمال) اللہ کی عدالت میں پیش ہو گا۔ اسے یوم الحساب کہتے ہیں۔
4. پھر اللہ تعالیٰ ہر شخص کے اچھے اور برے کاموں کا جائزہ لے گا۔ سب کے اعمال وزن کیے جائیں گے۔ جس کی بھلائیوں (اچھے اور نیک کاموں) کا پلڑا برائیوں (برے کاموں) سے بھاری ہو گا اللہ تعالیٰ اسے کامیاب قرار دے کر بخش دے گا۔ اور جس کے برے کام اس کے نیک کاموں پر بھاری ہوں گے، اللہ تعالیٰ کی جناب میں وہ ناکام قرار پائے گا اور اللہ تعالیٰ اس کو سزا دے گا۔ اسے یوم الجزا کہتے ہیں۔
5. جن لوگوں نے اچھے کام کیے ہوں گے اور اللہ تعالیٰ نے انہیں بخش دیا ہو گا وہ جنت میں جائیں گے اور برے کام کرنے والے جو سزا کے مستحق قرار پائے انہیں دوزخ میں ڈال دیا جائے گا۔

اس طرح ہم دیکھ سکتے ہیں کو جو شخص آخرت پر ایمان لاتا ہے گویا وہ اس بات کو تسلیم کرتا ہے کہ انسان کی تخلیق اور پیدائش ایک

خاص اور متعین مقصد کے تحت ہوئی ہے۔ اسے اس دنیا میں ایک ذمہ دار ہستی بنا کر بھیجا گیا ہے۔ یہی نہیں اللہ جو اس کا پیدا کرنے والا ہے اس نے اسے زندگی گزارنے کے لیے ہدایت نامہ بھی دیا ہے جو اس ہدایت پر چلتا اور عمل کرتا ہے وہی سیدھے راستے پر ہے اور جو من مانا راستہ اختیار کرتا ہے اس نے گمراہی اختیار کی ہے۔ انسان کی زندگی اس کی موت کے ساتھ ختم نہیں ہو جاتی بلکہ یہ زندگی ایک مسلسل اور ہمیشہ باقی رہنے والی زندگی کا پیش خیمہ ہے۔ انسان اس دنیا میں جو کچھ بھی عمل کرتا ہے بظاہر وہ یہیں پر ختم ہو جاتے ہیں لیکن نتائج کے اعتبار سے اس کے عمل باقی رہتے ہیں۔ جب قیامت آجائے گی اور دنیا کا یہ سارا کارخانہ ختم ہو جائے گا تو اللہ تعالی ایک بار پھر تمام جانداروں کو پیدا کرے گا۔ سب اپنی اپنی قبروں سے اٹھ کھڑے ہوں گے۔ حشر کے میدان میں جمع ہوں گے۔ پھر اللہ کی عدالت قائم ہو گی سارے انسان اس کی عدالت میں پیش کیے جائیں گے۔ انسان کے ایک ایک عمل کا حساب ہو گا اور اسے تولا جائے گا۔ نیکوکاروں اور اس دن اللہ کی عدالت میں کامیاب قرار پانے والوں کو بے حد و حساب نعمتیں ملیں گی۔ جن کا عمل کھوٹا ہو گا اور جن کے برے اعمال زیادہ ہوں گے انہیں لازوال اذیتوں کا سامنا ہو گا۔ اس کے بعد ایک ایسی زندگی شروع ہو گی جو ہمیشہ باقی رہے گی، کبھی نہ ختم ہونے والی زندگی۔ اس زندگی میں موت نام کی کوئی چیز نہیں ہو گی، یہ ہے آخرت پر ایمان لانے کا مفہوم اور مطلب۔

3.3 عقیدہ آخرت کی اہمیت اور ضرورت

آخرت کا عقیدہ بھی اسی طرح اہمیت کا حامل ہے جس طرح کہ عقیدہ توحید۔ جس طرح مسلمان ہونے کے لیے ایک خدا پر اس کی تمام صفات کے ساتھ ایمان لانا ضروری ہے اسی طرح آخرت پر اس کے تمام متعلقات کے ساتھ ایمان لانا ضروری ہے۔ کوئی شخص مسلمان ہو ہی نہیں سکتا جب تک کہ وہ آخرت پر ایمان نہ لائے۔ اور اگر کوئی آخرت کے عقیدے پر ایمان نہیں رکھتا تو پھر چاہے وہ ایک خدا کو ماننے والا ہی کیوں نہ ہو اس کا ایک خدا پر ایمان اسے کچھ بھی فائدہ نہیں دے گا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اگر کوئی شخص آخرت کی جواب دہی، حشر و نشر، حساب کتاب اور جنت و جہنم کا انکار کرتا ہے تو گویا وہ اللہ تعالی کی بہت سی صفات کا بھی انکار کرتا ہے۔ مثال کے طور پر اللہ تعالی کی ایک صفت عدل ہے، ایک صفت حکمت ہے، ایک صفت رحمت ہے، ایک اور صفت حاکمیت ہے وغیرہ۔ اب اگر کوئی شخص ایسا ہے جو آخرت پر ایمان نہیں رکھتا تو گویا وہ اللہ تعالی کی ان تمام صفات کا بھی انکار کرتا ہے کیوں کہ جس دنیا میں ہم جی رہے ہیں ہمارے اعمال کے اخلاقی نتائج اس طرح سامنے نہیں آتے جس طرح کہ آنے چاہئیں۔ کئی بار ہم دیکھتے ہیں کہ ظالم ظلم کرتا رہتا ہے، اس کی نہ صرف یہ کہ پکڑ نہیں ہوتی ہے بلکہ وہ ترقی کرتا اور آگے بھی بڑھتا رہتا ہے۔ اسی طرح بہت سے لوگ اچھے کام کرتے ہیں لیکن انہیں ان کاموں کا وہ صلہ نہیں ملتا جو کہ ملنا چاہیے اس لیے اگر کوئی ایسا دن نہ ہو جس میں ہر ایک کو اپنے کیے کاموں کا ٹھیک اور صحیح بدلہ نہ ملے تو یہ بات اللہ تعالی کے عدل، حکمت، حاکمیت اور رحمت جیسی صفتوں کے منافی اور برخلاف ہو گی۔ اللہ تعالی کی ان صفات کا تقاضا ہے کہ قیامت قائم ہو، حشر میں تمام انسان اکٹھا ہوں، حساب کتاب ہو اور جس نے جیسے اعمال اس دنیا میں کیے ہوں ان کے مطابق اسے بدلہ دیا جائے۔

آخرت کے عقیدے کی اہمیت کو جان لینے کے بعد ضروری ہے کہ یہ بھی جانا جائے کہ عقیدہ آخرت کی ضرورت کیوں ہے؟ یہ بات ہم سب جانتے ہیں کہ آخرت کا عقیدہ دنیا کے تمام مذاہب میں کسی نہ کسی صورت میں موجود ہے اس کا مطلب ہے کہ دنیا میں جتنے بھی انبیاء

آئے عقیدہ آخرت ان کی تعلیم کا بنیادی حصہ تھا جس طرح انہوں نے خدا اور رسولوں پر ایمان لانے کی دعوت دی اسی طرح آخرت پر ایمان لانے کا بھی مطالبہ کیا۔ ہم یہ جان چکے ہیں کہ عقیدہ آخرت کے بغیر خدا اور رسول پر ایمان لانا بالکل بے معنی ہے کیوں کہ انسانی فطرت ہے کہ جب اس سے کسی کام کے کرنے کا مطالبہ کیا جاتا ہے تو سب سے پہلے وہ یہ دیکھتا ہے کہ اگر وہ اس کام کو کرے گا تو اس کا کیا فائدہ ہو گا اور نہ کرنے کا کیا نقصان ہو گا۔ یہ بات انسانی فطرت میں شامل ہے کہ وہ وہی کام کرتا ہے جس کا کہ اسے کوئی فائدہ نظر آتا ہے یا وہ انہیں کاموں سے بچتا ہے جن کے بارے میں اسے معلوم ہو کہ ان کے کرنے سے اسے نقصان اٹھانا پڑنے گا۔ انسان بے فائدہ کاموں کے کرنے کی زحمت نہیں کرتا اسی طرح وہ ان کاموں سے بچنا بھی ضروری نہیں سمجھتا جن کا کوئی نقصان نہ ہو۔ اب اگر کوئی شخص آخرت پر یقین نہیں رکھتا، اسے جواب دہی اور جزاو سزا کا کوئی خوف نہیں ہے تو پھر وہ کیوں کر ایسے کام کرے گا جن کو کرنے کا اللہ نے حکم دیا ہے یا کیوں کر ان کاموں سے بچے گا جن سے کہ اللہ نے روکا ہے۔ بلکہ اس کے لیے تو خدا اور رسول کا ماننا بھی بے کار ہے کیوں کہ اسے جب آخرت کی جواب دہی کا یقین ہی نہیں ہے تو پھر وہ کیوں اللہ اور اس کے رسول کے احکام وہدایات کی پیروی کرے گا۔

آخرت پر ایمان انسان کے اندر نہ صرف یہ کہ یوم آخر کی جواب دہی کا تصوّر پیدا کرتا ہے بلکہ اس عقیدے کی وجہ سے انسان اس دنیا میں بھی ایک ذمہ دار انسان کے طور پر زندگی گزارتا ہے۔ جو شخص آخرت پر یقین نہیں رکھتا اسے اگر دنیاوی قانون کا خوف نہ ہو تو وہ کچھ بھی کر سکتا ہے۔ اگر اسے معلوم ہو کہ کسی کام کے کرنے سے وہ دنیا کے بنائے ہوئے قانون کی گرفت میں نہیں آئے گا نہ ہی اس سے اس کی سماجی عزت اور احترام پر بٹہ لگے گا تو وہ اس کام کے کرنے میں کوئی جھجھک محسوس نہیں کرتا۔ لیکن اگر کوئی شخص آخرت کی جواب دہی پر یقین رکھتا ہے تو خواہ دنیا میں اس کی گرفت ہو یا نہ ہو، اس کی سماجی عزت کو خطرہ ہو یا نہ ہو، وہ کوئی ایسا کام نہیں کرتا ہے جو خدا اور اس کے رسول کی منشا کے خلاف ہو۔ یہاں تک کہ اگر کسی کام میں اسے دنیا کا کوئی بڑے سے بڑا فائدہ مل رہا ہو لیکن وہ خدا اور اس کے رسول کے احکامات کے خلاف ہے تو وہ اسے نہیں کرے گا۔ اسی طرح کسی کام کے کرنے میں جو کہ اللہ اور اس کے رسول کا حکم ہو، خواہ اسے دنیا میں بظاہر نقصان ہی کیوں نہ ہو رہا ہو، وہ ہچکچائے گا نہیں کیوں کہ اسے معلوم ہے کہ اس کا اجر تو اسے آخرت میں ملنا ہی ہے۔ سود اور زکوٰۃ اس کی مثالیں ہیں۔ ایک مسلمان سود نہیں لے گا حالانکہ بظاہر اس میں فائدہ ہے۔ ایسا وہ اس لیے کرے گا کہ اللہ اور اس کے رسول نے اس سے روکا ہے اور آخرت میں اسے اس کے لیے جواب دہ ہونا پڑے گا۔ اسی طرح ایک مسلمان زکوٰۃ دے گا۔ حالانکہ زکوٰۃ ادا کرنے میں بظاہر اسے مالی نقصان ہوتا ہے۔ ایسا وہ اس لیے کرتا ہے کہ اس کے کرنے کا اللہ اور اس کے رسول نے حکم دیا ہے اور آخرت کے دن اس سے اس بارے میں باز پرس ہو گی۔ آخرت کا عقیدہ صرف مسلمان کو ہی نہیں کسی بھی انسان کو اس دنیا میں بھی ذمہ دار اور جواب دہ بناتا ہے۔ جو شخص آخرت پر ایمان رکھتا ہے وہ کوئی بھی غلط کام نہیں کر سکتا کیوں کہ اسے اچھی طرح معلوم ہے کہ وہ اگر کسی طرح اس دنیا کی جواب دہی سے بچ بھی گیا تو بھی آخرت کی باز پرس اور جواب دہی سے اسے دنیا کی کوئی بھی طاقت بچا نہیں سکے گی۔ اسی طرح آخرت کے عقیدے کو ماننے والا اس دنیا میں ہر اچھا کام کرے گا خواہ ظاہری طور پر دنیا میں اس کی وجہ سے اسے کچھ نقصان ہی اٹھانا کیوں نہ پڑے کیوں کہ اسے معلوم ہے کہ اگر اس نے دنیا میں اچھے کام نہیں کیے تو آخرت میں اس سے اس بارے میں بھی پوچھا جائے گا۔ اس لیے وہ نقصان اٹھا کر بھی اچھے کام کرتا

ہے۔

3.4 عقیدہ آخرت قرآن مجید میں

قرآن مجید میں صرف آخرت کا لفظ 113 مقامات پر ذکر ہوا ہے۔ اس کے علاوہ بے شمار آیات میں عقیدہ آخرت کے مختلف پہلوؤں پر دلائل دیئے گئے ہیں۔ قرآن مجید کی بنیادی تعلیمات کا خلاصہ اگر چند الفاظ میں بیان کرنے کے لیے کہا جائے تو کہا جاتا ہے کہ اس میں توحید، رسالت اور آخرت کا اثبات ہے۔ خاص طور پر قرآن مجید کی مکی سورتوں میں بہت تفصیل کے ساتھ آخرت اور اس کے مقامات و منازل کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ یہاں ہم آخرت سے متعلق چند آیات اور ان کے ترجمے کے بیان پر اکتفا کرتے ہیں۔

قرآن مجید کی دوسری سورہ بقرہ کے آغاز میں ہی مومنین کی جو صفات بیان کی گئی ہیں ان میں ایک صفت یہ ہے:

وَبِالآخِرَةِ هُمْ يُوقِنُونَ (البقرۃ:4) ترجمہ: اور وہ آخرت پر یقین رکھتے ہیں۔

قرآن مجید میں قیامت کے اثبات اور اس کے مناظر کا بیان نہایت ہی موئثر انداز میں کیا گیا ہے۔ اور اسے انسانی فطرت (جزاو سزا کا تصوّر) سے بہت قریب کر کے بیان کیا گیا ہے مثلاً سورہ قیامت میں اللہ تعالی کا ارشاد ہے:

أَيَحْسَبُ الْإِنسَانُ أَن يُتْرَكَ سُدًى (القیامۃ:36)

ترجمہ: کیا انسان یہ سمجھتا ہے کہ وہ بے کار چھوڑ دیا جائے گا۔

اسی طرح قرآن میں بتایا گیا کہ انسان کی تخلیق بے مقصد نہیں ہے:

أَفَحَسِبْتُمْ أَنَّمَا خَلَقْنَاكُمْ عَبَثاً وَأَنَّكُمْ إِلَيْنَا لَا تُرْجَعُونَ۔ (المومنون:115)

ترجمہ: (اے لوگو!) کیا تم یہ سمجھتے ہو کہ ہم نے تم کو بے کار پیدا کیا ہے اور تم ہماری طرف لوٹائے نہ جاؤ گے۔

قرآن مجید میں قیامت کے وقوع اور روز جزا (بدلے کے دن) کے اثبات کا بیان متعدد مقامات پر ہوا ہے اور اسے اللہ تعالی کے عدل و انصاف کا تقاضہ اور اس کی حکمرانی کے اثبات میں پیش کیا گیا ہے مثلاً سورہ تین میں اللہ کا ارشاد ہے:

إِلَّا الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ فَلَهُمْ أَجْرٌ غَيْرُ مَمْنُون فَمَا يُكَذِّبُكَ بَعْدُ بِالدِّينِ أَلَيْسَ اللَّهُ بِأَحْكَمِ الْحَاكِمِينَ (التین:8-6)

ترجمہ: لیکن جو ایمان لائے اور جنہوں نے نیک کام کیے ان کے لیے نہ ختم ہونے والا اجر ہے۔ پھر اس کے بعد تجھ کو کیا چیز جزا پر یقین لانے نہیں دیتی۔ کیا اللہ تمام حاکموں میں سب سے بڑا حاکم نہیں ہے۔

قرآن مجید میں بار بار اس بات کا اعادہ کیا گیا ہے کہ اچھے کام کرنے والے اور برے کام کرنے والے یکساں نہیں ہو سکتے۔

أَمْ حَسِبَ الَّذِينَ اجْتَرَحُوا السَّيِّئَاتِ أَن نَّجْعَلَهُمْ كَالَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ سَوَاء مَّحْيَاهُم

وَمَمَاتُهُمْ سَاء مَا يَحْكُمُونَ (الجاثیۃ:21)

ترجمہ: کیا انہوں نے جنہوں نے گناہ کمائے یہ گمان (خیال) کیا ہے کہ ہم ان کو ان کی طرح کر دیں گے جو ایمان لائے اور جنہوں نے نیک کام کیے۔ ان دونوں کی زندگی اور موت برابر ہو گی۔ ان کا یہ خیال برا ہے۔

انسان کو آخرت پر ایمان لانے میں جو چیز سب سے بڑی رکاوٹ بنتی ہے۔ وہ یہ خیال کہ مرنے کے بعد انسان دوبارہ زندہ نہیں ہو سکتا۔ قرآن مجید میں مختلف مثالیں دے کر اسے سمجھایا گیا ہے۔ سورہ ق کی ابتدائی آیات (15-1) پڑھ جایئے ایک ایک آیت میں اللہ تعالی کی قدرت اور کائنات کی مختلف اشیاء کی تخلیق کا ذکر ہے اور آخر میں فرمایا:

أَفَعَيِينَا بِالْخَلْقِ الْأَوَّلِ بَلْ هُمْ فِي لَبْسٍ مِّنْ خَلْقٍ جَدِيدٍ (ق:15)

ترجمہ: کیا ہم پہلے پیدا کر کے تھک گئے جو دوبارہ نہیں پیدا کر سکتے۔ بات یہ ہے کہ ان کافروں کو از سر نو پیدائش میں شک ہے۔

جو اللہ پہلے انسان کی تخلیق پر قادر ہے (جب کہ وہ کچھ بھی نہیں تھا) وہ اللہ انسان کو دوبارہ بھی پیدا کر سکتا ہے۔ اسی بات کو سورہ قیامت میں مزید منطقی انداز میں سمجھایا ہے:

أَيَحْسَبُ الْإِنسَانُ أَن يُتْرَكَ سُدًى (36) أَلَمْ يَكُ نُطْفَةً مِّن مَّنِيٍّ يُمْنَى (37) ثُمَّ كَانَ عَلَقَةً فَخَلَقَ فَسَوَّى (38) فَجَعَلَ مِنْهُ الزَّوْجَيْنِ الذَّكَرَ وَالْأُنثَى (39) أَلَيْسَ ذَلِكَ بِقَادِرٍ عَلَى أَن يُحْيِيَ الْمَوْتَى (40)(القیامۃ:40-36)

ترجمہ: کیا انسان یہ سمجھتا ہے کہ وہ یوں ہی بے کار چھوڑ دیا جائے گا۔ کیا وہ پانی کی ایک ٹپکی ہوئی بوند نہ تھا۔ پھر وہ بندھا ہوا خون ہوا۔ پھر خدا نے اس کو بنایا اور اس کو ٹھیک کیا۔ پھر اس کو جوڑا کیا یعنی نر اور مادہ کیا۔ کیا وہ خدا اس پر قادر نہیں کہ مردوں کو دوبارہ جِلائے۔

ایک اور جگہ اللہ تعالی کا ارشاد ہے:

وَهُوَ الَّذِي يَبْدَأُ الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيدُهُ وَهُوَ أَهْوَنُ عَلَيْهِ (الروم:27)

ترجمہ: اور خدا وہی ہے جو خلق کا آغاز کرتا ہے پھر اس کو دوبارہ خلق کرے گا۔ اور یہ (دوبارہ خلق کرنا) اس کے لیے آسان ہے۔

3.5 آخرت کی زندگی کے مختلف مراحل

اسلامی تعلیمات کے مطابق انسانی زندگی بنیادی طور پر دو مرحلوں میں تقسیم ہے۔ ایک دنیوی زندگی جس کا دائرہ انسان کی پیدائش سے لے کر موت تک وسیع ہے۔ قرآن مجید میں اسے حیات دنیا، اولیٰ وغیرہ الفاظ سے تعبیر کیا گیا ہے۔ انسانی زندگی کا دوسرا حصّہ وہ ہے جو اس دنیا میں اس کی موت کے بعد شروع ہوتا ہے۔ یہ ابدی زندگی ہے اور اسے قرآن مجید میں آخرت کے لفظ سے تعبیر کیا گیا ہے۔ والآخرۃ خیر من الاولیٰ (اعلیٰ:)(اور آخرت (بعد والی زندگی) پہلی (زندگی) سے بہتر ہے)۔

آخرت کی زندگی جو انسان کی موت کے ساتھ شروع ہوتی ہے اس کے بھی کئی مراحل ہیں۔ ان میں سے ہر ایک کا ذکر یہاں کسی

قدر تفصیل سے کیا جاتا ہے۔

3.5.1 برزخ

برزخ کے معنی حجاب اور پردے کے ہیں جو دو چیزوں کے درمیان حائل ہوتا ہے۔ قرآن مجید میں برزخ کا لفظ 3 مقامات پر استعمال ہوا ہے۔ (سورہ رحمان 20، الفرقان 53، المومنون 100) اور ہر جگہ پردے اور حجاب کے معنی میں ہی استعمال ہوا ہے۔ اس لیے انسان کی موجودہ زندگی اور بعد میں آنے والی زندگی کے درمیان جو پردہ اور حجاب ہے اسے برزخ کا نام دیا گیا ہے۔ قرآن مجید میں اللہ تعالی کا ارشاد ہے:

وَمِن وَرَآئِهِم بَرۡزَخٌ إِلَىٰ يَوۡمِ يُبۡعَثُونَ (المومنون 100)

ترجمہ: اور ان مرنے والوں کے پیچھے ایک پردہ ہے اس دن تک جب کہ وہ (قیامت میں) اٹھائے جائیں گے۔

عربی اور بہت ساری دوسری زبانوں میں بھی دونوں زندگیوں کی اسی درمیانی منزل کا نام 'قبر' ہے۔ انسان مرنے کے بعد خواہ زمین میں دفن ہوا ہو، خواہ غرق آب کر دیا گیا ہو، خواہ اسے درندوں اور پرندوں نے اپنی خوراک بنالیا ہو یا اسے نذر آتش کر دیا گیا ہو، ان تمام حالتوں پر قبر کا اطلاق ہوتا ہے۔ مطلب یہ کہ قبر ہر اس جگہ کو کہیں گے جہاں مرنے کے بعد انسانی جسم نے جگہ حاصل کی ہو۔ اللہ تعالی کا قرآن مجید میں ارشاد ہے:

وَأَنَّ ٱللَّهَ يَبۡعَثُ مَن فِي ٱلۡقُبُورِ (الحج:7)

ترجمہ: بلاشبہ اللہ تعالی ان کو جو قبروں میں ہیں اٹھائے گا۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ عالم برزخ میں انسان کی کیا کیفیت ہوتی ہے اور وہ کن حالات سے دوچار ہوتا ہے؟ برزخ میں انسان کی کیفیت و حالت کو سمجھنے کے لیے جو سب سے بہتر اور مناسب و موزوں مثال دی جاتی ہے وہ عالم خواب کی ہے۔ یعنی نیند اور موت کے درمیان بہت ہی قریبی مماثلت پائی جاتی ہے۔ دونوں میں فرق صرف یہ ہے کہ نیند کی حالت میں نفس و روح کا رشتہ جسم سے ٹوٹتا نہیں بلکہ قائم رہتا ہے اس لیے جسم زندہ اور باقی رہتا ہے جب کہ موت کی صورت میں نفس کا رشتہ انسانی جسم سے ختم ہو جاتا ہے اس لیے جسم کے اجزاء کچھ دنوں میں ختم ہو کر بکھر جاتے ہیں۔ موت کے بعد اور دوسری زندگی کے آغاز سے پہلے انسانی روح کا رشتہ اس کے جسم سے تو ختم ہو جاتا ہے لیکن اس درمیانی منزل میں جسے ہم برزخ اور قبر سے تعبیر کرتے ہیں انسانی روح لذت والم کی کیفیات سے اسی طرح دوچار اور متاثر ہوتی ہے جس طرح نیند کی حالت میں خواب دیکھتے ہوئے انسانی روح لذت والم کو محسوس کرتی ہے اور نیند سے بیداری کے بعد گو کہ اس کے مادّی جسم پر اس لذت والم کے ظاہری آثار دکھائی نہیں دیتے لیکن اس کا احساس بیداری کے بعد بھی باقی رہتا ہے۔

قرآن اور حدیث کی تعلیمات اس سلسلے میں بہت ہی واضح ہیں کہ عالم برزخ میں عذاب و راحت کے مناظر انسانی روح کے سامنے سے نہ صرف یہ کہ گزرتے ہیں بلکہ روح ان سے دوچار بھی ہوتی ہے۔ مثلاً جو اللہ کے نیک اور پاکباز بندے ہیں انہیں برزخ کے دوران ہی جنت اور اس کی نعمتوں کے منظر دکھائے جاتے ہیں اور جو لوگ کہ غلط کار اور گنہ گار ہیں ان کے سامنے دوزخ کا منظر پیش کیا جاتا ہے اور

عذاب کا کچھ نہ کچھ مزہ بھی چکھایا جاتا ہے۔ اللہ کے رسول حضرت محمدؐ کا ارشاد ہے: تم میں سے جب کوئی مرتا ہے تو اس پر صبح و شام اس کا اصلی مقام پیش کیا جاتا ہے۔ اگر وہ اہل جنت میں سے ہوتا ہے تو جنت اور اہل دوزخ میں سے ہوتا ہے تو دوزخ۔ پھر اس سے کہا جاتا ہے کہ یہ ہے تیرا مقام اس وقت تک کے لیے کہ جب تو قیامت کے دن اٹھایا جائے گا۔" (صحیح مسلم، کتاب الجنۃ والنار جلد دوم) یہاں ایک غلط فہمی کا ازالہ بھی ضروری معلوم ہوتا ہے جو عام طور پر "قبر" کی اصطلاح کے حوالے سے پائی جاتی ہے۔ صحیح حدیثوں میں عالم برزخ کے حالات کو عام طور پر قبر کی اصطلاح کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ البتہ ان میں قبر کے لفظ سے مراد زمین کا وہ ٹکڑا نہیں ہے جہاں کہ مردے کا جسم دفن (یا دبا پڑا) ہوتا ہے بلکہ وہاں پر اس سے مراد وہ عالم ہے جس میں کہ مذکورہ مناظر پیش آتے ہیں اور اس سے مراد ارواح و انفس کی دنیا ہے نہ کہ مادی عناصر کی دنیا۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید میں اس عالم کے تعلق سے نفس اور نفوس سے خطاب کیا گیا ہے اور ان ہی نفوس کے عذاب و ثواب کا ذکر ہے، اس عالم میں جو جسم نظر آتا ہے وہ مرنے والے کے اعمال کا مثالی پیکر ہوتا ہے (اصل جسم نہیں) کیوں کہ اعمال کی اصل ذمہ دار انسان کی روح ہے، مٹی کا بنا ہوا اس کا جسم نہیں۔ **کل نفس بما کسبت رهينة** (المدثر:38) (ہر روح اور جان اپنے اعمال کے ہاتھوں گروی ہے۔) جسم ایک آلہ ہے۔ دنیا میں وہ خاکی شکل میں ہوتا ہے اور برزخ میں وہ مادّے سے پاک ہوتا ہے۔

ایک سوال یہ بھی پیدا ہوتا ہے کہ عالم برزخ میں انسانی روح کہاں رہتی ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ جن لوگوں نے خدا اور اس کی ہدایات کا انکار کیا ان کی روحیں مرنے کے بعد زمین میں آوارہ پھرتی ہیں۔ وہیں سے جہنم کے مناظر کا مشاہدہ کرتی اور تکلیفیں اٹھاتی ہیں۔ اللہ کے نیک اور پاکباز بندوں کی روحیں اپنے پروردگار کے پاس جنت میں ہوتی ہیں اور جنت کی لازوال نعمتوں کا نظارہ کرتی ہیں۔ اسی طرح صحیح حدیثوں سے یہ بھی ثابت ہے کہ عالم برزخ میں (مرنے کے بعد قبر میں) فرشتے آتے ہیں اور مرنے والوں سے توحید و رسالت سے متعلق سوال کرتے ہیں۔ ایمان والے جس طرح اپنی دنیا کی زندگی میں ایمان پر قائم اور ثابت قدم رہتے ہیں اسی طرح برزخ میں بھی ایمان پر قائم رہتے ہیں۔ اور جو لوگ دنیا میں کفر و شرک کرتے ہیں برزخ میں بھی وہ فرشتوں کے سوالوں کے صحیح جواب نہیں دے سکیں گے اور بہک جائیں گے۔

3.5.2 قیامت

قیامت کا لفظ قیام کی مونث ہے جس کے معنی اٹھ کھڑا ہونا ہے۔ (تائے تانیث یہاں زور دینے کے لیے ہے۔) قرآن مجید میں یہ لفظ بار بار استعمال ہوا ہے (تقریباً 70 مقامات پر) اور اس کے علاوہ بھی قیامت کے لیے متعدد نام استعمال ہوئے ہیں۔ اصطلاح میں قیامت سے مراد ایک ایسا دن ہے جب ہستی کی ساری بساط لپیٹ دی جائے گی۔ کائنات کا تمام کا تمام نظام درہم برہم ہو جائے گا۔ آسمان و زمین کے درمیان جو کچھ بھی ہے وہ تباہ و برباد ہو جائے گا۔ کوئی بھی چیز باقی نہیں بچے گی۔ پھر اللہ تعالی جو اس سارے نظام کا خالق و مالک ہے نئی زمین اور نئے آسمان پیدا کر کے ایک نیا نظام تشکیل دے گا۔ روز اوّل سے لے کر آخری وقت تک جو بھی انسان دنیا میں پیدا ہوئے انہیں دوبارہ اٹھا کھڑا کیا جائے گا۔ اللہ کی عدالت قائم ہو گی اور ہر کسی کو اپنے اعمال کے مطابق جزا یا سزا ملے گی۔

اس بات پر دنیا کے تقریباً سبھی مذاہب کا یہاں تک کہ سائنس دانوں کا بھی تقریباً اتفاق ہے کہ جس طرح انسان کی زندگی ایک

متعینہ مدت کے بعد ختم ہو جاتی ہے، دنیا کی بیشتر اشیاء وجود میں آنے کے بعد فنا ہوتی ہیں اسی طرح یہ نظام عالم بھی ایک نہ ایک دن درہم برہم ہو کر فنا ہو جائے گا۔ اس عظیم تباہی کے بعد کیا ہو گا؟ اس بارے میں نہ ہمارے سائنس داں کچھ بتاتے ہیں اور نہ ہی دنیا کے دیگر مذاہب میں اس کی تفصیلات ملتی ہیں۔ دنیا کے فنا ہو جانے کے بعد کی حقیقت کی تفصیل اور تشریح سب سے واضح اور مکمل شکل میں اگر ہمیں کہیں ملتی ہے تو وہ قرآن مجید اور حضرت محمدؐ کی احادیث ہیں۔ قرآن مجید میں قیامت کو بیسیوں ناموں سے یاد کیا گیا ہے مثلاً الساعۃ (وہ گھڑی)۔ الیوم الحق (سچا دن) الیوم الموعود (موعودہ دن)، یوم عسیر (ایک سخت دن)، الحاقۃ (ضرور آنے والی گھڑی)، القارعۃ (کھڑ کھڑانے والی) الغاشیۃ (چھا جانے والی) وغیرہ۔ اسی طرح قیامت کا بیان فقروں اور جملوں میں بھی کثرت سے ہوا ہے۔ مثلاً یوم ینفخ فی الصور (جس دن صور پھونکا جائے گا) ولیوم لاریب فیہ (جس دن میں کوئی شک نہیں) وغیرہ ان تمام الفاظ اور جملوں میں قیامت کے دن کی ہولناکی اور انسان کی عاجزی و بے کسی کا بھرپور اظہار ہے۔

قیامت کی حقیقت کو جاننے اور سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ نظام عالم پر ایک نظر ڈالیں۔ یہ حقیقت ہم خوب اچھی طرح سے جانتے ہیں کہ یہاں جو کچھ بھی وجود پذیر ہوتا ہے، ایک نہ ایک دن اسے فنا ہونا ہے۔ افراد و اقوام ہر سطح پر قدرت کا یہ نظام جاری و ساری ہے۔ جو آج ہے کل کو فنا ہو جائے گا۔ اسی اصول پر کائنات کا نظام بھی گامزن ہے اس لیے جس طرح افراد اور اقوام فنا کے گھاٹ اترتے رہتے ہیں اسی طرح ایک دن اقوام کا یہ مجموعہ بھی ختم ہو جائے گا۔ اور یہی قیامت ہے۔ قیامت کو سمجھنے کا ایک دوسرا ذریعہ بھی ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ اللہ تعالی نے دنیا کو تضادات کے گہوارے کے طور پر پیدا کیا۔ ہر جگہ متضاد قوتیں کارفرما نظر آتی ہیں۔ اس تضاد کے باوجود اگر دنیا اور اس کا نظام قائم ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ اس میں ہر جگہ ایک اعتدال پایا جاتا ہے۔ متضاد قوتیں جب ایک اعتدال کے ساتھ باہم ملتی ہیں تو ان میں زندگی پیدا ہوتی ہے۔ جیسے ہی یہ اعتدال ختم ہوتا ہے وہ آپس میں ٹکرا کر فنا ہو جاتی ہیں۔ ایک دن ایسا آئے گا جب دنیا کا توازن و اعتدال بگڑ جائے گا پھر سارا نظام عالم درہم برہم ہو جائے گا اور وہی دن قیامت کا دن ہو گا۔

قیامت کس طرح قائم ہو گی؟ اس سلسلے میں قرآن مجید اور خاص طور پر احادیث مبارکہ میں کافی تفصیلات موجود ہیں۔ جن میں قیامت کی نشانیوں کا ذکر ہے، پھر قیامت کے دن صور پھونکا جائے گا جو ایک طرح سے قیامت کے آنے کا اعلان ہو گا، (جس طرح کہ کسی بڑی اور اہم خبر سے پہلے نقارہ بجانے کی روایت خود انسانی معاشروں میں موجود ہے) یا پھر اسی آواز کے نتیجے میں تمام کا تمام نظام عالم درہم برہم ہو کر ختم ہو جائے گا۔ قیامت کی ہولناکیوں کا بھی قرآن مجید میں اور حدیثوں میں بھی تذکرہ موجود ہے کہ کس طرح نفسی نفسی کا عالم ہو گا۔ کوئی کسی کو نہ پوچھے گا۔ ماں اپنے دودھ پیتے بچے تک کو چھوڑ دے گی وغیرہ وغیرہ۔ قیامت کے نتیجے میں جب ایک بار دنیا کا کارخانہ ختم ہو جائے گا تو پھر دوبارہ صور پھونکا جائے گا۔ اس کی آواز سن کر سب سے پہلے انسان سے لے کر آخری انسان تک سبھی لوگ دوبارہ اٹھ کھڑے ہوں گے ' اللہ کے حکم سے نئی زمین اور نئے آسمان وجود میں آئیں گے۔ سب لوگ ایک جگہ اکٹھا ہوں گے ' اسے حشر کہتے ہیں۔ پھر حساب کتاب ہو گا، جس نے پہلی زندگی میں جیسا کچھ اور جو کچھ بھی کیا ہو گا سب کچھ اس کے سامنے آجائے گا۔ اگر دنیا میں اعمال اچھے رہے ہوں گے تو اچھا بدلہ ملے گا اور اگر دنیا میں برے کام زیادہ کیے ہوں گے تو پھر برا بدلہ ملے گا۔

قیامت کا آنا ضروری ہے۔ اس پر قرآن مجید نے دو طرح سے استدلال کیا ہے۔ ایک یہ کہ اللہ تعالی نے انسان کو اور پھر اس کے لیے کائنات کے اس پورے کارخانے کو یوں ہی بے کار اور بے مقصد نہیں پیدا کیا۔ اس لیے ضروری ہے کہ انسان کا اس کے اچھے برے اعمال پر مواخذہ ہو اور پھر اس کے مطابق بدلہ بھی ملے۔ ایسا ہونا قیامت کے بغیر ممکن نہیں۔ دوسرے یہ کہ اللہ تعالی عادل اور منصف ہے۔ اس کے عدل و انصاف کا لازمی تقاضا ہے کہ اچھے اعمال کی اچھی جزا ملے اور برے اعمال کی سزا ملے۔ اگر ایسا نہیں ہوتا تو گویا اللہ تعالیٰ (نعوذ باللہ من ذلک) ظالم قرار پائے گا۔ چونکہ اس دنیا میں انسان کو اس کے اعمال کی جزا یا سزا عام طور پر نہیں ملتی اس لیے ضروری ہے کہ ایک دن ایسا آئے جب اللہ تعالی انسانوں کے درمیان عدل و انصاف کرے۔ اس دن کا قیام قیامت کے بغیر ممکن نہیں۔

جو لوگ بھی قیامت کا انکار کرتے ہیں ان کی بنیادی دلیل یہ ہوتی ہے کہ جب دنیا میں مرنے کے بعد دوبارہ کوئی نہیں جیتا تو پھر طویل عرصہ گزر جانے کے بعد قیامت کے دن انسان کا جی اٹھنا مزید محال ہے۔ چونکہ انسانی تجربہ اس کی نفی کرتا ہے اس لیے دوبارہ زندگی نہیں مل سکتی۔ قرآن مجید نے منکرین قیامت کے وہم کا درج ذیل طریقوں سے ازالہ کیا ہے:

1. قرآن مجید میں ایسی مثالیں پیش کی گئیں جن میں اس دنیا میں دوبارہ زندگی ملی مثال کے طور پر حضرت ابراہیم کا پرندوں کو زندہ کرنے کا معجزہ، اصحاب کہف کا قصہ یا حضرت عیسیٰ کا مردوں کو زندہ کر دینا۔
2. قرآن مجید میں زمین کی مثال پیش کی گئی ہے کہ تپش اور گرمی کے سبب وہ ایسی ہو جاتی ہے کہ اس میں زندگی کی ذرا بھی رمق باقی نہیں رہ جاتی۔ لیکن جیسے ہی بارش کے چھینٹے اس پر پڑنے شروع ہوتے ہیں وہ زندہ ہو اٹھتی ہے اور سبزہ لہلہانے لگتا ہے۔ جب مردہ زمین دوبارہ زندہ ہو سکتی ہے تو پھر مردہ انسانوں کو بھی اللہ دوبارہ زندہ کر سکتا ہے۔
3. جو خدا زمین، آسمان اور کائنات کی ایک ایک چیز بنانے اور پیدا کرنے کی قدرت رکھتا ہے اس خدا کی قدرت سے یہ بعید نہیں ہو سکتا کہ وہ انسانوں کو دوبارہ پیدا کر دے۔
4. جب انسان اور یہ کائنات کچھ بھی نہیں تھا تو اللہ تعالی نے عدم سے ان چیزوں کو وجود بخشا۔ جو خدا عدم سے وجود عطا کر سکتا ہے یہ کیسے ممکن ہے کہ ایک بار کسی چیز کو بنا لینے کے بعد وہ اس کے دوبارہ وجود میں لانے پر قادر نہ ہو۔
5. افراد کے مرنے اور مٹ جانے پر ہم سب آسانی کے ساتھ یقین رکھتے ہیں کیوں کہ ہمارے سامنے یہ روز مرّہ کا معمول ہے لیکن قوموں اور بڑے بڑے گروپوں کا مٹنا اور ختم ہونا آسانی سے ہماری سمجھ میں نہیں آتا۔ اس کے باوجود یہ تاریخی حقیقت ہمارے سامنے موجود ہے کہ دنیا میں کتنی بڑی بڑی قومیں اٹھیں، عروج کو پہنچیں اور صدہا برس نظام عالم پر چھائی رہیں لیکن پھر فنا بھی ہو گئیں، اب ان کا کچھ بھی باقی نہیں رہا۔ اس طرح یہ دنیا بھی ایک دن فنا ہو جائے گی جس طرح ایک قوم کی جگہ دوسری قوم لیتی رہتی ہے اسی طرح اس دنیا کے بعد ایک دوسری دنیا قائم ہو گی۔

قیامت میں انسان دوبارہ اٹھایا جائے گا۔ اس کی یہ دوبارہ زندگی محض روحانی نہیں بلکہ جسمانی ہو گی۔ انسان ایک نئے جسم کے ساتھ اٹھایا جائے گا اور اس کا یہ جسم اس کے اعمال کے مطابق ہو گا یعنی جیسے انسان کے اعمال ہوں گے ان کی روحوں کو انہیں اعمال کے مطابق

جسموں میں داخل کیا جائے گا۔ اصل مواخذہ اور ذمہ داری روح سے متعلق ہے چنانچہ قرآن مجید میں متعدد آیات ایسی موجود ہیں جن میں عمل اور اچھے برے نتیجے کی ذمہ داری روح پر ڈالی گئی ہے مثلاً سورہ فجر میں ہے:

يَا أَيَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ ارْجِعِيْ إِلَى رَبِّكِ رَاضِيَةً مَّرْضِيَّةً فَادْخُلِيْ فِيْ عِبَادِيْ وَادْخُلِيْ جَنَّتِيْ (الفجر30-27)

ترجمہ: اے مطمئن نفس اپنے رب کی طرف خوشی خوشی پلٹ جا پس داخل ہو جا میرے بندوں میں اور داخل ہو جا میری جنت میں۔

3.5.3 حساب کتاب اور جزا و سزا

اسلام کے مطابق آخرت پر ایمان لانا اس لیے ضروری ہے تا کہ انسان یہ جان لے کہ وہ جو کچھ اس دنیا میں کرتا ہے اس کا کچھ بدلہ تو اس دنیا میں مل جاتا ہے لیکن پورا پورا بدلہ اس وقت ملے گا جب قیامت کے نتیجے میں یہ دنیا ختم ہو جائے گی، ایک نئی دنیا قائم ہو گی، انسانوں کو دوبارہ زندہ کیا جائے گا، ان کے ایک ایک عمل کا حساب ہو گا اور پھر اعمال کے مطابق ہی اچھا یا برا بدلہ دیا جائے گا۔ اسی لیے اسے یوم الدین یعنی بدلے کا دن کہا جاتا ہے۔

آخرت کا عقیدہ پورے کا پورا جواب دہی کے تصور پر قائم ہے۔ یہ عقیدہ انسان کو ذمہ دار بناتا ہے اور اس میں یہ احساس پیدا کرتا ہے کہ دنیا میں اس کا ہر عمل ایک ذمہ دار کی حیثیت میں ہے۔ وہ جو کچھ بھی یہاں کرتا ہے نہ صرف یہ کہ اس کے ایک ایک عمل کا ریکارڈ رکھا جاتا ہے بلکہ ایک دن ایسا آئے گا جب اس کے تمام اعمال کا پورا پورا بدلہ اسے دیا جائے گا۔ صرف اسلام ہی نہیں دنیا کے تمام مذاہب نے انسان کو ایک ذمہ دار مخلوق قرار دیا ہے اور ان سب میں جواب دہی اور جزا و سزا کا تصوّر پایا جاتا ہے۔ ہندومت میں آواگون کا تصوّر ہو یا عیسائیت اور یہودیت جیسے مذاہب میں جنت کی نعمتوں اور جہنم کے مصائب کا بیان ہر جگہ انسان کے ذمہ دار ہونے اور اعمال کا بدلہ دیے جانے کی بات واضح ہے۔ البتہ اسلام کا کمال یہ ہے کہ اس نے عقیدہ آخرت کے ذریعہ جواب دہی اور جزا و سزا کے تصوّر کو نہ صرف پوری تفصیل کے ساتھ بیان کیا بلکہ اسے انتہائی کمال تک پہنچا دیا۔ دیگر مذاہب میں اس حوالے سے جو تصوّرات ناقص تھے اسلام نے ان کی تکمیل کر دی اور جواب دہی اور جزا و سزا کے بارے میں جو بھی شکوک و شبہات انسانی ذہن میں اٹھتے ہیں اسلامی تعلیمات میں ان کا پوری طرح ازالہ کر دیا گیا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے اس دنیا کو ایک خاص نظام اور قانون کا پابند بنایا ہے جس پر کہ یہ جاری ہے۔ سائنس داں اور فلسفی اس نظام و قانون کو قدرت یا Nature کہتے ہیں جب کہ مذہب والے اسے تقدیر الٰہی قرار دیتے ہیں۔ اللہ کے اس نظام و قانون کے تحت اس دنیا میں جو کچھ بھی وقوع پذیر ہوتا ہے اس کے اثرات و نتائج بھی بر آمد ہوتے ہیں۔ یہ اصول صرف مادی چیزوں میں ہی جاری نہیں بلکہ انسان کی اندرونی کیفیات اور اعمال بھی اس اصول کے پابند ہیں مثلاً جس طرح زہر انسانی جسم کو ہلاک کر دیتا ہے اسی طرح گناہ انسان کی روح کو مردہ کر دیتا ہے۔ جس طرح علاج اور پرہیز سے بیمار انسانی جسم کو صحت ملتی ہے اسی طرح تزکیہ نفس انسانی روح کو بالیدہ اور روحانی بیماریوں سے شفایاب کرتا ہے۔ غرض عمل اور ردّ عمل کا سلسلہ جس طرح انسان کی مادی و جسمانی زندگی میں جاری ہے، انسان کی روحانی زندگی بھی اس سے مستثنیٰ نہیں ہے۔

انسان کا ہر قول و فعل اثرات کا حامل ہوتا ہے اچھے قول و عمل کا اثر اچھے بدلے کی صورت میں ظاہر ہو گا اور برے قول و عمل کا لازمی نتیجہ برے بدلے کی صورت میں سامنے آئے گا۔ مطلب یہ کہ انسان کو جزا و سزا جو بھی ملے گی وہ اس کے دنیا میں کیے گئے اعمال کا نتیجہ ہو گی۔ اس کی صراحت اللہ کے رسولؐ کے پاک ارشاد میں اس طرح ملتی ہے۔ ”اللہ تعالیٰ قیامت میں فرمائے گا اے میرے بندو یہ تمہارے ہی اعمال ہیں جو میں تمہیں لوٹا رہا ہوں۔ تو جو کوئی جزائے خیر پائے وہ خدا کا شکر ادا کرے اور جس کو برائی ملے وہ خود کو ملامت کرے۔ (صحیح مسلم کتاب الزہد)

ہم انسان اپنی روز مرہ کی دنیاوی زندگی میں بار بار یہ دیکھتے اور مشاہدہ کرتے ہیں کہ ایک انسان بڑی تکلیف سے بچنے کے لیے چھوٹی چھوٹی تکلیفیں آسانی سے برداشت کر لیتا ہے مثلاً کسی بیماری کی تکلیف سے بچنے کے لیے کڑوی کسیلی گولیاں کھاتا ہے۔ اسی طرح کسی بڑی راحت اور خوشی کے حصول کے لیے چھوٹی موٹی خوشیاں تج دیتا ہے مثلاً اس کا جسم صحت مند رہے اس کے لیے وہ صبح کی میٹھی نیند سے بے دار ہوتا ہے اور مختلف طرح کی ورزشیں کرتا ہے۔ اور ایسا وہ اس لیے کرتا ہے کہ نتائج کے بارے میں اسے یقینی طور پر معلوم ہوتا ہے۔ جس طرح انسان دنیوی معاملات کے ماہرین کی باتوں کا یقین کرتے ہوئے ان پر عمل پیرا ہوتا ہے اسی طرح اگر وہ آخرت کے معاملات کے ماہرین انبیاء علیہم السلام کی باتوں پر یقین کرتے ہوئے عمل کرے یعنی ایمان لائے اور عمل صالح کرے تو آخرت میں اچھا بدلہ ضرور ملے گا۔

انسان اس دنیا کی زندگی میں جو کچھ بھی کرتا ہے، چونکہ وہ اپنے ایک ایک عمل کے لیے جواب دہ ہے اس لیے اللہ تعالیٰ کی جانب سے اس کے تمام اچھے برے اعمال کا ریکارڈ رکھا جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا بہت ہی واضح ارشاد ہے:

يَوْمَ تَجِدُ كُلُّ نَفْسٍ مَّا عَمِلَتْ مِنْ خَيْرٍ مُّحْضَراً وَمَا عَمِلَتْ مِن سُوءٍ (آل عمران:30)

ترجمہ: جس دن ہر جان جو اس نے اچھے کام کیے ان کو موجود پائے گی اور جو برے کام کیے وہ بھی۔

ایک دوسری جگہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

فَمَن يَعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْراً يَرَهُ () وَمَن يَعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرّاً يَرَهُ (الزلزال:8-7)

ترجمہ: تو جو کوئی ایک ذرّہ برابر بھی نیکی کرے گا وہ اس کو دیکھے گا اور جو ذرّہ برابر بھی بدی (برا کام) کرے گا وہ اس کو بھی دیکھے گا۔

اس کا مطلب ہے کہ انسان جو کچھ بھی اچھا برا عمل کرتا ہے سب کا سب نہ صرف یہ کہ اللہ کی نظر میں ہے بلکہ سب کا ریکارڈ بھی اس نے محفوظ کر رکھا ہے اور انکار کی صورت میں اللہ تعالیٰ سب کچھ پیش کر دے گا۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

أَمْ يَحْسَبُونَ أَنَّا لَا نَسْمَعُ سِرَّهُمْ وَنَجْوَاهُم بَلَى وَرُسُلُنَا لَدَيْهِمْ يَكْتُبُونَ (الزخرف:80)

ترجمہ: کیا یہ منکر سمجھتے ہیں کہ ہم ان کے بھید اور ان کی کانا پھوسی نہیں سنتے؟ کیوں نہیں! بلکہ ہمارے فرستادہ ان کے پاس (اعمال کو) لکھتے ہیں۔

ایک دوسری جگہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ انسان کا نامہ اعمال اس کی گردن میں لٹکا ہوا ہے

وَكُلَّ إِنسَانٍ أَلْزَمْنَاهُ طَآئِرَهُ فِيْ عُنُقِهِ وَنُخْرِجُ لَهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ كِتَاباً يَلْقَاهُ مَنشُوراً() اقْرَأْ كَتَابَكَ كَفَى بِنَفْسِكَ الْيَوْمَ عَلَيْكَ حَسِيْباً(بنی اسرائیل:13-14)

ترجمہ اور ہم نے ہر انسان کا نتیجہ عمل اس کی گردن میں چپکا دیا ہے اور قیامت کے دن ہم اس کو دفتر کر کے نکالیں گے جس کو وہ کھلا ہوا پائے گا کہ اپنا دفتر پڑھ لے۔ آج تیرا نفس خود ہی محاسب ہو تو کافی ہے۔

نامہ عمل کے لیے کتابت اور رجسٹر وغیرہ الفاظ کنایے کے طور پر استعمال ہوئے ہیں۔ ان سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالی نے ایسا انتظام کر رکھا ہے کہ انسان کا ایک ایک عمل محفوظ رہے۔ آج کے کمپیوٹر ٹکنالوجی کے دور میں ہمارے لیے اس کا سمجھنا اور بھی آسان ہو گیا ہے۔ ایک معمولی چپ (Chip) لگا کر ہم گاڑیوں کی نگرانی کر سکتے ہیں اللہ کی ذات سے بالکل بعید نہیں کہ ہر انسان کے جسم میں کوئی ایسی چیز تخلیق کر دے جو اس کے ایک ایک عمل اور بات کو محفوظ رکھے جیسا کہ اوپر کی آیت میں اشارہ بھی ہے۔ انسان کے اعضاء کی شہادت سے متعلق آیات واحادیث اس سلسلے میں بہت ہی واضح ہیں۔

انسان عام طور پر اچھے اور برے دونوں طرح کے عمل کرتا ہے اس کے کچھ عمل اچھے ہوتے ہیں اور کچھ عمل برے ہوتے ہیں۔ قیامت میں (آخرت میں) جب اللہ تعالی انسان کو اچھا یا برا بدلہ دینے کا فیصلہ کرے گا تو انہی اچھے اور برے اعمال کی بنیاد پر کرے گا۔ آخرت کے دن جب اللہ کی عدالت قائم ہو گی دنیا کے پہلے انسان سے لے کر آخری انسان تک سبھی انسانوں کا کچا چٹھا اس کے سامنے پیش کیا جائے گا۔ اللہ تعالی کی میزان میں انسان کے تمام اعمال تولے جائیں گے۔ کسی کے ساتھ ذرّہ برابر بھی زیادتی نہیں ہو گی۔ اس دن جس کے اچھے اعمال کا پلڑا بھاری ہو گا اسے اللہ کی عدالت سے اچھا بدلہ دیے جانے کا فیصلہ ہو گا اور جس کے برے اعمال زیادہ ہوں گے اسے برا بدلہ دیا جائے گا۔ اللہ تعالی کے حساب میں کسی قسم کا ذرا بھی نقص نہیں ہو گا۔

3.5.4 جنت اور جہنم

یہ دنیا دارالامتحان ہے۔ انسان یہاں پر اس لیے ہے کہ وہ اللہ کی ہدایت ورہنمائی کے مطابق زندگی گزار کر دنیا کے اس امتحان میں کامیاب ہو اور ابدی نعمتوں سے ہم کنار ہو۔ البتہ اللہ تعالی نے انسان کو اختیار کی آزادی بھی دی ہے اور اس کے نتیجے میں وہ چاہے تو دنیا میں امتحان کی تیاری اس ڈھنگ سے کرے کہ کامیاب ہو جائے اور چاہے تو یہاں جو وقت اور موقع اسے حاصل ہیں انہیں یوں ہی کھیل کود اور تفریح میں گزار دے اور آخرت میں ناکام ہو جائے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اللہ تعالی نے دنیا کا یہ کارخانہ کیوں قائم کیا؟ اس نے انسان کو عمل کی تکلیف کیوں دی؟ اس کا جواب یہ ہے کہ اللہ تعالی انسان کو ابدی سعادت اور لامتناہی ترقی سے ہم کنار کرنا چاہتا ہے اور اس کی نبیاد اس پر رکھی ہے کہ انسان اپنی دنیا کی زندگی میں اچھے عمل کرے اور غلط اور برے کاموں سے بچے۔ اس نے انسان کو یونہی نہیں چھوڑا بلکہ اچھے اور برے کاموں کے درمیان تمیز کے لیے ہدایت ورہنمائی کا انتظام بھی کیا۔ اس کے بعد اگر کوئی اچھے کام کرتا ہے اور برے کاموں سے بچتا ہے تو پھر اللہ تعالیٰ ابدی سعادت کی اس آخری منزل پر فائز کرے گا جس کا کہ اس نے اس سے وعدہ کر رکھا ہے اور جسے ہم جنت کے نام سے جانتے ہیں۔ اور اگر کوئی اپنے ارادہ واختیار سے اللہ کی عطا کی ہوئی ہدایت ورہنمائی سے فائدہ نہیں اٹھاتا بلکہ اس کی ان دیکھی کرتے ہوئے غلط

اور برے کام کرتا ہے تو پھر کوئی وجہ نہیں کہ وہ ابدی سعادت یعنی جنت سے ہم کنار ہو بلکہ اس کا ٹھکانہ جہنم ہے جہاں اسے اس کی غلط کاریوں کی سزا ملے گی۔

جنت وہ مقام ہے جو ابدی ہے اور جہاں انسان کو اللہ تعالی کی وہ تمام نعمتیں میسر ہوں گی جن کا وہ تصوّر بھی نہیں کر سکتا؟ جنت ہی انسان کی حقیقی منزل اور مقام ہے کیوں کہ پہلے انسان حضرت آدمؑ کو تخلیق کے بعد اللہ سبحانہ تعالی نے جنت میں ہی رکھا تھا۔ جب ایک نافرمانی کے نتیجے میں انہیں دنیا میں اتارا گیا تو بھی دنیا کی خلافت کے ساتھ ان سے یہ مطالبہ کیا گیا کہ اگر وہ اور ان کی نسل اس ابدی مقام میں پھر سے داخلہ چاہتی ہے جہاں وہ رہ بھی چکے ہیں تو ضروری ہے کہ وہ اپنے عمل میں اللہ کی ہدایت و رہنمائی کے پابند رہیں۔ یہی وہ طریقہ اور راستہ ہے جس پر چل کر وہ جنت کی ابدی اور دائمی راحت و مسرت کو حاصل کر سکتے ہیں۔ گویا جنت انسان کا وہ ورثہ ہے جس کے حصول کے لیے وہ اس دنیا میں ہے لہذا اس کی سعی و عمل کا اصل مرکز و محور اسی جنت کا حصول ہونا چاہیے جہاں وہ ابدی سعادت سے ہم کنار ہو گا۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ پھر جہنم کیا ہے؟ حقیقت یہ ہے کہ اللہ تعالی غفور و رحیم کے ساتھ ساتھ عادل و منصف بھی ہے۔ یہ اس کے عدل و انصاف کے خلاف ہو گا کہ وہ فرماں بردار اور نافرمان دونوں طرح کے انسانوں کو ایک ہی جگہ اکھٹا کر دے۔ چنانچہ جس طرح اس نے فرماں بردار بندوں کے لیے جنت کے مقام میں واپسی کا وعدہ کر رکھا ہے اسی طرح نافرمانوں کو ان کی نافرمانی کے بدلے سزا دینے کی دھمکی بھی دے رکھی ہے اور سزا کا جو مقام ان کے لیے مقرر ہے وہ دوزخ یا جہنم ہے۔ یہ وہ جگہ ہے جہاں انسان کے لیے سزا کی وہ تمام انتہائیں موجود ہیں جن کا کہ وہ تصوّر بھی کر سکتا ہے۔ جہنم ان لوگوں کا ابدی ٹھکانہ اور مقام ہے جنھوں نے کہ کفر اور شرک کا رویہ اختیار کیا اور اللہ کی ہدایت و رہنمائی کی موجودگی میں اس کا نہ صرف انکار کیا بلکہ اس سے انحراف کرتے ہوئے برائیوں اور غلط کاموں پر عمل پیرا رہے۔

یہاں ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ بہت سے لوگ جو فی الواقع تو ایمان رکھتے ہیں لیکن انسانی تقاضوں اور لذات دنیا میں پڑ کر اللہ کی ہدایت و رہنمائی سے غافل ہو جاتے ہیں یہاں تک کہ ان کے غلط اور برے کاموں کا پلڑا ان کے اچھے کاموں کے مقابلے بھاری ہو جاتا ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ چونکہ ایسے لوگ اللہ کی ذات و صفات اور اس کی ہدایت پر یقین رکھتے ہیں اس لیے ان کا اصل اور آخری ٹھکانہ تو جنت ہی ہے لیکن چونکہ انہوں نے بہت سارے برے کاموں کا ارتکاب کیا ہوا ہے اس لیے ان برائیوں کی پاداش میں انہیں عذاب دنیا، عذاب برزخ اور عذاب آخرت (جہنم) سے دوچار ہونا پڑ سکتا ہے اور اپنی برائیوں اور گناہوں کے سبب وہ ایک عرصے تک جہنم کے عذاب میں مبتلا رہیں گے یہاں تک کہ اللہ کی رحمت و مغفرت سے گناہوں کی سزا پانے کے بعد بالاخر جنت میں داخل ہوں گے۔ مگر یہ کہ یہ سزا کتنی طویل اور کیسی سخت ہو گی ہم اس کا تصور بھی نہیں کر سکتے اس لیے ہمیں کوشش کرنی چاہیے کہ ہم زیادہ سے زیادہ اچھے عمل کر لیں اور جہنم کا ایندھن بننے سے بچ جائیں۔

3.6 شفاعت اور اس کا اسلامی تصور

آخرت کے عقیدے کو اس کی صحیح شکل میں اور اصل اسپرٹ کے ساتھ جاننے، سمجھنے اور تسلیم کرنے کے لیے ضروری ہے کہ اس

حوالے سے ایک بڑی غلط فہمی جس کا شکار لوگ اکثر ہوتے رہتے ہیں، کا ازالہ کر لیا جائے اور وہ ہے شفاعت کا غلط تصور۔ بلاشبہ ہم انسان ہیں اور انسان ہونے کے ناطے بہت سے معتقدات ایسے رکھتے ہیں جو ہمیں خوش گمان رکھ سکیں۔ انہیں میں ایک شفاعت کا غلط تصوّر بھی ہے جس کے تحت انسانوں کی ایک بہت بڑی تعداد اس خوش گمانی میں مبتلا رہتی ہے کہ چاہے وہ جو کچھ بھی کرتی رہے اللہ کے کچھ مقرب بندے، جن کو وہ مختلف طریقوں سے خوش رکھنے کی کوشش کرتا ہے، اسے اللہ کے غضب اور سزا سے بچالیں گے۔ انسان کے اندر شفاعت کا جب یہ تصوّر مستحکم ہو جاتا ہے تو پھر وہ اللہ کو راضی اور خوش کرنے والے تمام کاموں کو چھوڑ کر غلط کاموں میں پڑ جاتا ہے۔ جو کچھ بھی اس کے دل اور مرضی میں آتا ہے کرتا پھرتا ہے اور آخر میں زندہ یا مردہ انسانوں کی بارگاہ میں حاضری دے کر یہ سمجھتا ہے کہ اللہ کے یہ مقرب اور بزرگ بندے اللہ کے دربار میں اس کی سفارش کر کے اسے اس کے غلط کاموں کی پاداش میں ملنے والی سزا اور عذاب سے بچالیں گے اور یہی نہیں وہ ان کی سفارش کی وجہ سے جنت میں اعلی مقام بھی حاصل کر سکے گا۔

اسلام شفاعت کے اس غلط تصوّر کی نفی کرتا ہے۔ آخرت کی زندگی میں کسے جنت ملنی چاہیے اور کس کا مقدر جہنم ہے اس کا پورا پورا اختیار صرف اور صرف اللہ تعالی کو حاصل ہے۔ اللہ کے علاوہ اس معاملے میں کوئی کچھ بھی نہیں کر سکتا۔ اللہ تعالی کا بہت ہی واضح ارشاد ہے:

اَلْمُلْكُ يَوْمَئِذٍ لِّلَّهِ (الحج:56)

ترجمہ: بادشاہی اس دن اللہ کی ہو گی۔ یعنی لوگوں کے درمیان فیصلہ کرے گا۔

عقلی طور پر بھی ہم یہ سمجھ سکتے ہیں کہ جب کائنات کی ایک ایک چیز کا مالک اور حاکم اللہ تعالی ہے تو اس کے فیصلوں میں کسی کو بھی کوئی اختیار نہیں مل سکتا۔ اسی طرح چونکہ اللہ تعالی کو انسانوں کے ایک ایک عمل اور بات کی خبر ہے، وہ ہر چیز سے واقف ہے اس لیے کوئی بھی فیصلہ کرنے میں وہ کسی کی سفارش یا شہادت (گواہی) کا محتاج نہیں ہے۔ پھر کوئی انسان جو کہ اپنے بارے میں بھی پورا پورا علم نہیں رکھتا، اس کے دربار میں کسی دوسرے شخص کی سفارش کیوں کرے گا۔ جو خود ہی محتاج ہو وہ کسی دوسرے کی حاجت روائی کیسے کر سکتا ہے۔ توحید کے باب میں ہم یہ بات اچھی طرح جان چکے ہیں کہ اللہ عادل ہے۔ وہ ہر حال میں عدل کرنے والا ہے، اس لیے کسی سفارش پر وہ کیوں کر کچھ لوگوں کو بخش سکتا ہے۔ یہ بات تو اس کے عدل کے خلاف ہو گی کہ وہ کچھ ایسے لوگوں کی مغفرت کر دے جو اپنے ایمان اور عمل کے لحاظ سے مغفرت کے مستحق نہ ہوں۔ یہ تو ظلم ہو جائے گا اور اللہ ظلم کرنے والا نہیں ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ آخرت کی کامیابی کی امید ایمان اور عمل صالح کے بعد ہی کرنی چاہے۔ کسی بھی بندہ کی خوش نودی یا سفارش انسان کو آخرت میں اللہ کے محاسبے سے نہیں بچا سکتی وہاں نہ کوئی لین دین کام آئے گا، نہ کوئی دوستی کارگر ہو گی اور نہ ہی کسی طرح کی سفارش ہو گی۔ اللہ تعالیٰ نے خود ہی سفارش کی تردید کر دی ہے' اس کا اارشاد ہے:

مِّن قَبْلِ أَن يَأْتِيَ يَوْمٌ لاَّ بَيْعٌ فِيهِ وَلاَ خُلَّةٌ وَلاَ شَفَاعَةٌ (البقرة:254)

ترجمہ: اس دن کے آنے سے پہلے، جس دن کہ نہ کوئی لین دین ہو گا، نہ کوئی دوستی ہو گی اور نہ کوئی سفارش ہو گی۔

عمل سے بے پرواہو کر بزرگوں اور اللہ کے مقرب بندوں سے یہ امید رکھنا کہ وہ آخرت میں انہیں اللہ کے عقاب و عذاب سے

بچالیں گے، شفاعت کا غلط اور مشرکانہ تصور ہے۔ اور اس کا مطلب یہ ہے کہ گویا کچھ لوگ ہیں جو خدا کی خدائی میں شریک ہیں اور اس کے فیصلوں پر اثر انداز ہو سکتے ہیں۔ ظاہر سی بات ہے کہ اللہ کا کوئی بھی مومن بندہ ایسے خیالات کا حامل نہیں ہو سکتا۔

لیکن پھر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ شفاعت کا مطلب کیا ہے؟ کیا آخرت میں شفاعت نام کی کوئی چیز ہو گی ہی نہیں؟ اس کا جواب یہ ہے کہ شفاعت ایک حقیقت ہے۔ آخرت کے دن اللہ تعالی اپنے کچھ مخصوص بندوں کی شفاعت کچھ لوگوں کے حق میں قبول کرے گا البتہ ان کی یہ شفاعت اس طرح کی شفاعت نہیں ہو گی جس کا ذکر کہ درج بالا سطور میں کیا گیا ہے اور جس کی تردید قرآن وحدیث میں بار بار کی گئی ہے۔

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ آخرت میں اللہ کے کچھ مخصوص بندے کچھ لوگوں کی شفاعت کریں گے۔ البتہ یہ شفاعت بنیادی طور پر ایک مختلف طرح کی شفاعت ہو گی۔ یہ شفاعت ایسی ہو گی جس سے اللہ تعالی کی عدل، حکم اور ملک وغیرہ صفات اور ان کے لازمی تقاضوں پر کسی طرح کی کوئی ضرب نہیں پڑتی ہو گی۔ اس سے نہ اللہ تعالی کی عدالت میں کوئی فرق پڑتا ہو گا نہ اس کی حاکمیت اور مالک ہونے پر کوئی سوال اٹھتا ہو گا۔ مطلب یہ کہ یہ شفاعت بالکل عام اور بے قید نہ ہو گی بلکہ خاص اور محدود ہو گی۔ کچھ شرطوں کے ساتھ ہو گی اور شفاعت کرنے والے کچھ اصول اور ضابطوں کے پابند ہوں گے۔ یہ شفاعت کس طرح کی ہو گی قرآن مجید میں اس کی تفصیلات بہت کھول کر بیان کر دی گئی ہیں یہاں ہم انہیں بالترتیب نقل کرتے ہیں۔

1. شفاعت کا معاملہ پورے کا پورا اللہ کے ہاتھ میں ہو گا۔ اور جو کچھ بھی ہو گا اس کی مرضی اور حکم کے مطابق ہو گا۔ اس کی ذرا بھی خلاف ورزی نہ ہو گی۔ قرآن مجید میں ہے:

   قُل لِّلَّهِ الشَّفَاعَةُ جَمِيعاً (الزمر:44)

   ترجمہ: کہہ دو کہ شفاعت تمام کی تمام اللہ ہی کے ہاتھ میں ہے۔

2. شفاعت صرف وہی انسان یا اللہ کا مقرب بندہ کر سکے گا جس کو اللہ تعالی شفاعت کرنے کی اجازت دے گا۔ اللہ کی اجازت اور مرضی کے بغیر کوئی بھی انسان شفاعت کے لیے زبان نہیں کھول سکے گا۔ قرآن مجید میں اللہ تعالی کا ارشاد ہے:

   مَن ذَا الَّذِیْ یَشْفَعُ عِنْدَهُ إِلاَّ بِإِذْنِهِ (البقرہ:255)

ترجمہ: کون ہے جو (اللہ) اس کے پاس شفاعت کر سکے مگر اس کی اجازت سے۔ یعنی کوئی بھی شخص اللہ کی اجازت اور مرضی کے بغیر کسی کی کوئی سفارش نہیں کر سکے گا۔

3. جو بھی شفاعت کرے گا یا اللہ تعالی جس کو بھی شفاعت کی اجازت دے گا وہ صرف اسی شخص کے لیے شفاعت کر سکے گا جس کی شفاعت کی اللہ نے اسے اجازت دی ہو گی۔ یعنی اللہ کی مرضی اور اجازت کے بغیر نہ تو کوئی شفاعت کر سکے گا اور نہ ہی کسی کی شفاعت کی جا سکے گی۔ اللہ کا واضح ارشاد ہے:

لَا یَشْفَعُوْنَ إِلَّا لِمَنِ ارْتَضٰی (الانبیاء:28)

ترجمہ: صرف انہیں لوگوں کے لیے شفاعت کریں گے جن کے لیے اللہ کی مرضی ہوگی۔

4. شفاعت کی جن لوگوں کو اجازت ملے گی اور جن کے لیے ملے گی ایسا نہیں ہے کہ وہ ان کے لیے جیسی تیسی سفارش کریں بلکہ ان کے حق میں وہ وہی بات کہیں گے جو کہ بالکل درست اور صحیح ہوگی۔ اللہ پاک کا ارشاد ہے:

لَّا یَتَکَلَّمُوْنَ إِلَّا مَنْ أَذِنَ لَهُ الرحْمٰنُ وَقَالَ صَوَاباً (النباء:38)

وہ کوئی بات نہ کہیں گے مگر وہی جس کے لیے اللہ نے (رحمان نے) اسے اجازت دی ہوگی اور وہ ٹھیک بات کہے گا۔

اس تفصیل سے یہ بات بہت اچھی طرح معلوم ہو جاتی ہے کہ آخرت میں شفاعت ہوگی۔ اللہ تعالی اپنے کچھ مخصوص بندوں کی سفارش کو قبول کرے گا البتہ سفارش کی یہ قبولیت عام نہ ہوگی بلکہ محدود ہوگی۔ شفاعت کرنے والے اللہ کے حضور اس کی اجازت سے اس کے کچھ بندوں کے بارے میں اس کے رحم وکرم کی درخواست کریں گے۔ یہ شفاعت کرنے والے اللہ کے محبوب اور مقرب بندے ہوں گے اور جن کی شفاعت کی جائے گی ان کا معاملہ یہ ہوگا کہ ان کے ایمان و عمل میں کسی قدر کمی رہ گئی ہوگی جس کی وجہ سے اللہ تعالی کے عام قانون کے تحت ان کی بخشش نہیں ہو پائے گی۔ اللہ کے مقرب بندے اس کمی سے درگزر کرنے کی اللہ سے درخواست کریں گے کہ وہ ان کی کمیوں پر پردہ ڈال دے اور انہیں محض اپنے فضل و کرم سے بخش دے۔ اس شفاعت کا اصل مقصد یہ ہوگا کہ ایک ایسے دن جب اللہ کی جناب میں کوئی اُف تک نہ کہہ سکے گا، اللہ کی کبریائی کے سامنے سارے انسان سہمے ہوئے خاموش کھڑے ہوں گے اللہ تعالی اپنے کچھ مقرب بندوں کو اس دن شفاعت کی نہ صرف اجازت دے گا بلکہ ان کی شفاعت کو قبول بھی کرے گا۔ اس طرح فی الحقیقت یہ شفاعت اللہ کی جانب سے اپنے مقرب بندوں کی عزت افزائی ہوگی۔

اس میں کوئی شک نہیں اور احادیث سے یہ ثابت بھی ہے کہ محض اپنے عمل کی بنیاد پر کسی شخص کی مغفرت نہیں ہو سکتی۔ مغفرت اللہ تعالی کی خاص عنایت ہے جو وہ اپنے بندوں پر کرے گا۔ البتہ یہ مغفرت بھی اللہ تعالی کے قانون عدل کے دائرے میں ہوگی اور جس کا ایمان و عمل جتنا بہتر ہوگا اسی قدر وہ اللہ تعالی کے کرم اور مہربانیوں کا مستحق قرار پائے گا۔ اس سے یہ بات اچھی طرح ثابت ہو جاتی ہے کہ مغفرت کا اصل انحصار انسان کے ایمان و عمل پر ہے اور مغفرت کرنے کا اصل اختیار صرف اور صرف اللہ تعالی کی ذات کو حاصل ہے۔

3.7 عقیدہ آخرت کا اثر انسانی زندگی پر

انسانی زندگی پر عقائد میں سے جو سب سے زیادہ اثر انداز ہوتے ہیں، عقیدہ آخرت ان میں انتہائی اہم ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید میں توحید کی تعلیمات کے بعد سب سے زیادہ زور آخرت کے ایمان ویقین پر دیا گیا ہے۔ قرآن مجید میں ایسی سورتوں اور آیتوں کی تعداد بہت زیادہ ہے جن میں آخرت اور اس میں رونما ہونے والے واقعات کا تذکرہ انتہائی مؤثر انداز میں ہوا ہے۔

آخرت کا عقیدہ انسان کو جواب دہ بناتا ہے۔ یہ انسان میں اس بات کا احساس پیدا کرتا ہے کہ وہ ایک ذمہ دار مخلوق ہے۔ اس سے

اس کے ایک ایک عمل کی باز پرس ہو گی وہ کوئی کام ---خواہ کھلے میں کرے یا ڈھکے چھپے ---- اس کے کام دنیا کی نظروں میں آئیں یا نہ آئیں آخرت کا عقیدہ اسے بتاتا ہے کہ اس کا ایک ایک عمل نہ صرف ریکارڈ ہو رہا ہے بلکہ ایک دن ایسا آئے گا جب مرنے کے بعد اس کا خالق و مالک اسے دوبارہ اٹھائے گا اور اس نے جو کچھ بھی عمل اس دنیا میں کیا ہو گا اس کا حساب لے گا اور پھر عمل کے مطابق اسے اچھا یا برا بدلہ دے گا۔ جس انسان کے اندر بھی آخرت کا یہ تصور پیدا ہو جائے وہ یقینی طور پر ذمہ دار بن جاتا ہے اور کوئی کام ایسا نہیں کرتا جو اللہ کو ناپسند ہو۔

آخرت کا عقیدہ انسان کو صرف جواب دہ ہی نہیں بناتا بلکہ اس کے اندر یہ احساس پیدا کرتا ہے کہ وہ ایک اچھا انسان بنے۔ ایک ایسا انسان بنے جو اپنے مالک کے فرمان پر عمل کرنے والا ہو اور اس کی مخلوقات کے ساتھ اچھے طریقے سے پیش آنے والا ہو۔ گویا آخرت کا عقیدہ انسان کو اپنے مالک و خالق کا مطیع و فرماں بردار بنانے کا ساتھ ساتھ ایک اچھا انسان بھی بناتا ہے جو اپنے جیسے انسانوں کے ساتھ اچھا معاملہ کرتا ہے۔

آخرت کا عقیدہ انسان کو قانون کا پابند بناتا ہے۔ اس عقیدے کو ماننے والا شخص کوئی بھی کام ایسا نہیں کرتا جو قانون کے خلاف ہو۔ وہ قانون کی صرف ظاہری پابندی ہی نہیں کرتا بلکہ دن کا اجالا ہو یا رات کی تاریکی، بظاہر اسے کوئی دیکھنے والا ہو یا نہ ہو ہر حال میں وہ اللہ کے بنائے ہوئے قانون سے تجاوز نہیں کرتا۔ وہ وہی کام کرتا ہے جن کے کرنے کا اللہ نے اسے حکم دیا ہے اور وہ ان تمام کاموں سے بچتا ہے جن سے کہ اللہ تعالیٰ نے منع کیا ہے۔

آخرت کا عقیدہ انسان کو دنیا کے خوف سے بے نیاز کر دیتا ہے۔ وہ دنیا میں کسی سے ڈر کر کوئی کام نہیں کرتا بلکہ اس کے ہر کام کے پیچھے اللہ کا ڈر اور خوف کار فرما ہوتا ہے۔ یعنی عقیدہ آخرت پر یقین رکھنے والا شخص دنیا اور اس کے لوگوں سے ڈرنے کے بجائے اللہ سے ڈرتا ہے اور اسی ڈر کی وجہ سے وہ دنیا کی برائیوں سے بچتا ہے۔

آخرت کا عقیدہ انسان کو بہادر اور حوصلہ مند بنا دیتا ہے۔ آخرت کو ماننے والا شخص چونکہ اس بات کو اچھی طرح جانتا ہوتا ہے کہ اصل جواب دہی آخرت کی جواب دہی ہے اور آخرت میں اچھے اعمال کا بدلہ جنت کی صورت میں ملے گا جہاں وہ تمام نعمتیں اسے ملیں گی جن کا کہ وہ تصور بھی نہیں کر سکتا۔ وہ وہاں مقام محمود میں ہو گا، اسے اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل ہو گا یہی نہیں اس کی آنکھیں دیدار الٰہی سے بھی شرف یاب ہوں گی، تو پھر اس کے اندر اتنا حوصلہ اور بہادری پیدا ہو جاتی ہے کہ وہ اللہ کے راستے میں جان دینے سے بھی نہیں گھبراتا بلکہ خوشی خوشی وہ اس کے لیے بھی تیار ہو جاتا ہے۔

آخرت کا عقیدہ انسان کو انصاف پسند اور عدل کا پیروکار بناتا ہے۔ چونکہ اسے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اس دنیا میں ایک ذمہ دار مخلوق ہے اور اسے اپنے دنیوی اعمال کے لیے آخرت میں جواب دہ ہونا ہے اس لیے وہ کسی کے ساتھ بھی ظلم و ناانصافی کے ساتھ نہیں پیش آتا بلکہ ہر ایک کے ساتھ عدل و انصاف کا معاملہ کرتا ہے۔

3.8 اکتسابی نتائج

اس اکائی میں آپ نے درج ذیل نکات سیکھے:

- آخرت پر ایمان اسلام کا بنیادی عقیدہ ہے۔ مسلمان ہونے کے لیے آخرت پر ایمان لانا اسی طرح ضروری ہے جیسے کہ توحید و رسالت پر۔ آخرت سے مراد انسان کی موت کے بعد پیش آنے والے وہ تمام مراحل، منازل اور مقامات ہیں جو موت کے بعد شروع ہوتے ہیں اور جن کا سلسلہ قبر، حشر و نشر، حساب کتاب، جزا و سزا اور جنت و جہنم تک دراز ہے۔ گویا عقیدہ آخرت کا مطلب یہ ہے کہ ایک دن اللہ تعالی دنیا کے اس کارخانے کو ختم کر دے گا۔ اس کے بعد ایک نئی دنیا برپا ہوگی اور تمام انسان دوبارہ جی کر اللہ کے سامنے حاضر ہوں گے۔
- آخرت کا عقیدہ بھی اسی طرح اہمیت کا حامل ہے جس طرح کہ عقیدہ توحید۔ جس طرح مسلمان ہونے کے لیے ایک خدا پر اس کی تمام صفات کے ساتھ ایمان لانا ضروری ہے اسی طرح آخرت پر اس کے تمام متعلقات کے ساتھ ایمان لانا ضروری ہے۔ کوئی شخص مسلمان ہو ہی نہیں سکتا جب تک کہ وہ آخرت پر ایمان نہ لائے۔ اور اگر کوئی آخرت کے عقیدے پر ایمان نہیں رکھتا تو پھر چاہے وہ ایک خدا کو ماننے والا ہی کیوں نہ ہو اس کا ایک خدا پر ایمان اسے کچھ بھی فائدہ نہیں دے گا۔
- آخرت پر ایمان انسان کے اندر نہ صرف یہ کہ یوم آخر کی جواب دہی کا تصوّر پیدا کرتا ہے بلکہ اس عقیدے کی وجہ سے انسان اس دنیا میں بھی ایک ذمہ دار انسان کے طور پر زندگی گزارتا ہے۔ جو شخص آخرت پر یقین نہیں رکھتا اسے اگر دنیاوی قانون کا خوف نہ ہو تو وہ کچھ بھی کر سکتا ہے۔ اگر اسے معلوم ہو کہ کسی کام کے کرنے سے وہ دنیا کے بنائے ہوئے قانون کی گرفت میں نہیں آئے گا نہ ہی اس سے اس کی سماجی عزت اور احترام پر بٹہ لگے گا تو وہ اس کام کے کرنے میں کوئی جھجھک محسوس نہیں کرتا۔
- اسلام کے مطابق آخرت پر ایمان لانا اس لیے ضروری ہے تاکہ انسان یہ جان لے کہ وہ جو کچھ اس دنیا میں کرتا ہے اس کا کچھ بدلہ تو اس دنیا میں مل جاتا ہے لیکن پورا پورا بدلہ اس وقت ملے گا جب قیامت کے نتیجے میں یہ دنیا ختم ہو جائے گی، ایک نئی دنیا قائم ہوگی، انسانوں کو دوبارہ زندہ کیا جائے گا، ان کے ایک ایک عمل کا حساب ہوگا اور پھر اعمال کے مطابق ہی اچھا یا برا بدلہ دیا جائے گا۔
- برزخ میں انسان کی کیفیت و حالت کو سمجھنے کے لیے جو سب سے بہتر اور مناسب و موزوں مثال دی جاتی ہے وہ عالم خواب کی ہے۔ یعنی نیند اور موت کے درمیان بہت ہی قریبی مماثلت پائی جاتی ہے۔ دونوں میں فرق صرف یہ ہے کہ نیند کی حالت میں نفس و روح کا رشتہ جسم سے ٹوٹتا نہیں بلکہ قائم رہتا ہے اس لیے جسم زندہ اور باقی رہتا ہے جب کہ موت کی صورت میں نفس کا رشتہ انسانی جسم سے ختم ہو جاتا ہے اس لیے جسم کے اجزاء کچھ دنوں میں ختم ہو کر بکھر جاتے ہیں۔

3.9 نمونہ امتحانی سوالات

3.9.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات

1. آخرت کس زبان کا لفظ ہے؟

(a). عربی (b). یونانی (c). فارسی (d). انگریزی

2. قرآن مجید میں آخرت کا لفظ کتنی بار آیا ہے؟

(a). 113 (b). 145 (c). 170 (d). 200

3. برزخ کے معنی کیا ہیں؟

(a). حجاب (b). بے پردگی (c). کھلا ہوا (d). سب غلط

4. قیامت کے معنی بتائیں؟

(a). اٹھ کھڑا ہونا (b). جزاوسزا (c). اندازہ کرنا (d). سب صحیح

5. آخرت کے عقیدے کا تصور کس بنیاد پر قائم ہے؟

(a). جواب دہی (b). اندازہ کرنا (c). فیصلہ کرنا (d). سب صحیح

6. مرنے کے بعد انسان کو اللہ کی تمام نعمتیں کہاں میسر ہوں گی؟

(a). جنت (b). جہنم (c). دونوں صحیح (d). سب غلط

7. اسلامی نقطہ نظر سے دنیا کون سی جگہ ہیں؟

(a). دارالامتحان (b). جنت (c). اچھی جگہ (d). سب صحیح

8. آخرت پر ایمان اسلام کا بنیادی عقیدہ ہے؟

(a). ہاں (b). نہیں (c). پتہ نہیں (d). غلط

9. آخرت میں اللہ کے کون سے بندے کچھ لوگوں کی شفاعت کریں گے؟

(a). مخصوص بندے (b). عام لوگ (c). سبھی (d). سب غلط

10. کون سی سورتوں میں تفصیل سے آخرت اور اس کے مقامات و منازل کا تذکرہ کیا گیا ہے؟

(a). مکی سورتیں (b). مدنی سورتیں (c). دونوں صحیح (d). سب غلط

3.9.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات

1. حساب کتاب اور جزا وسزا کے متعلق اپنی معلومات قلم بند کیجیے۔
2. قیامت کے بارے میں ایک تفصیلی مضمون لکھیے۔
3. برزخ کے بارے میں مختصر نوٹ لکھیے۔
4. انسانی زندگی پر عقیدہ آخرت کے اثرات کا جائزہ لیجیے۔
5. جنت اور جہنم کے بارے میں لکھیے۔

3.9.3 طویل جوابات کے حامل سوالات

1. عقیدہ آخرت کی اہمیت اور ضرورت پر روشنی ڈالیے۔
2. عقیدہ آخرت کی بابت قرآن مجید کی رہنمائی سے گفتگو کیجیے۔
3. شفاعت اور اس کا اسلامی تصور پیش کیجیے۔

3.10 تجویز کردہ اکتسابی مواد

---

1. عقیدہ اسلامی : علامہ محمد غزالی / محمد عنایت اللہ اسد سبحانی
2. دینیات : مولانا سید ابو الاعلی مودودی
3. اسلام ایک نظر میں : مولانا صدر الدین اصلاحی
4. اسلامی تعلیمات : مولانا محمد سلیمان فرخ آبادی
5. اسلامی عقائد : علامہ عفیف عبد الفتاح طباہر / ڈاکٹر عبید اللہ فہد فلاحی
6. سیرہ النبی (جلد چہارم) : علامہ سید سلیمان ندوی

اکائی 4: فرشتے اور آسمانی کتابیں

اکائی کے اجزا:

4.0 تمہید

4.1 مقاصد

4.2 فرشتے

  4.2.1 معنی و مفہوم

  4.2.2 دنیا کے مختلف مذاہب میں فرشتوں کا تصور

  4.2.3 اسلامی تعلیمات میں فرشتوں کی حقیقت

  4.2.4 فرشتوں کے فرائض اور ذمہ داریاں

  4.2.5 بعض فرشتوں کے نام اور ان کی ذمہ داریاں

  4.2.6 فرشتوں پر ایمان لانا کیوں ضروری ہے؟

4.3 آسمانی کتابیں

  4.3.1 معنی و مفہوم

  4.3.2 کتابوں پر ایمان لانے کی اہمیت اور ضرورت

  4.3.3 قرآن مجید اور دوسری آسمانی کتابوں کی حیثیت میں فرق:

  4.3.4 چار معلوم آسمانی کتابیں

4.4 عقیدہ ایمان بالکتب کا اثر انسانی سماج پر

4.5 اکتسابی نتائج

4.6 نمونہ امتحانی سوالات

  4.6.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات

4.6.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات
4.6.3 طویل جوابات کے حامل سوالات
4.7 تجویز کردہ اکتسابی مواد

4.0 تمہید

اللہ کے بعد فرشتوں پر ایمان لانا ضروری ہے کیوں کہ فرشتے وہ نورانی ہستیاں ہیں جو انسانی نظروں سے پوشیدہ ہیں۔ یہ خدا کی مخلوق ہیں اور اس کی خدائی میں کسی طرح شریک نہیں بلکہ یہ اللہ تعالی کے مطیع و فرمابردار ہیں اور ان کی اطاعت و فرماں برداری ایسی ہوتی ہیکہ اللہ کے حکم سے یہ سر مو بھی سر تابی نہیں کرسکتے۔ انہیں کوئی بھی اختیار حاصل نہیں یہ جو کچھ بھی کرتے ہیں خدا کے حکم سے ہی کرتے ہیں۔ یہ نہ تو کسی کی کوئی سفارش کرسکتے ہیں نہ کسی طرح کی کوئی مدد۔ یہ ہمیشہ عبادت و بندگی میں مصروف اور مشغول رہتے ہیں اور جس ذمہ داری پر اللہ تعالیٰ نے انہیں لگا رکھا ہے اسے پوری طرح بجالاتے ہیں۔ ہمیں ان کے بارے میں کچھ زیادہ معلوم نہیں سوائے اس کے جو اللہ نے اپنے رسول کے ذریعے ہمیں بتایا۔ اور ہم فرشتوں پر اسی لیے ایمان لاتے ہیں کہ اللہ کے رسول نے ہمیں ان کے بارے میں بتایا ہے اور فرمایا ہے کہ فرشتوں پر ایمان لانا ضروری ہے۔

فرشتوں کی طرح کتابوں پر ایمان لانا بھی ضروری ہے۔ جس طرح اللہ تعالی نے انسانوں کی ہدایت و رہنمائی کے لیے رسول اور پیغمبر بھیجے اسی طرح ان رسولوں میں سے کچھ کو اپنی ہدایات کتابوں کی صورت میں بھی دیں تا کہ ان کے گزر جانے کے بعد بھی لوگ ان ربانی ہدایات سے فائدہ اٹھاتے رہیں۔ لیکن جس طرح انسان رسولوں کی تعلیمات کو بھلاتا اور ان سے گریز کرتا رہا اسی طرح کتابوں میں درج ہدایات کو بھی چھوڑتا رہا ہے۔ بلکہ اس سے بھی بڑھ کر بہت سی وہ باتیں جو رسولوں نے نہیں کہی تھیں جس طرح ان کی جانب منسوب کرتا رہا اسی طرح کتابوں میں بھی کچھ چیزوں کا اضافہ اور کچھ کمیاں کرتا رہا۔ اللہ تعالی نے ہر قوم، علاقے اور زبان کے لوگوں میں نبی اور رسول بھیجے‘ اسی طرح اس نے متعدد قوموں اور علاقوں میں ان کی زبانوں میں کتابیں بھی نازل کیں لیکن جس طرح ہمیں تمام رسولوں کے بارے میں نہیں معلوم اسی طرح تمام آسمانی کتابوں کی بھی ہمیں خبر نہیں۔ جس طرح اس نے کچھ رسولوں کے نام ہمیں بتا دیے اسی طرح کچھ آسمانی کتابوں کے نام اور جن انبیاء پر وہ نازل ہوئیں ان کے نام بھی ہمیں بتائے ہیں۔ ان کتابوں پر ان کے نام کے ساتھ ایمان لانا ضروری ہے۔ بقیہ جن کے بارے میں ہمیں نہیں معلوم ان کے بارے میں خاموشی اختیار کرنے کی ہدایت دی گئی ہے۔ اللہ کے آخری رسول حضرت محمدؐ کو دی جانے والی کتاب قرآن مجید آخری آسمانی کتاب ہے۔ اب جس طرح اللہ کے رسولؐ کے بعد رہتی دنیا تک کوئی نبی نہیں آئے گا اسی طرح جب تک دنیا قائم ہے انسانوں کی ہدایت کے لیے قرآن مجید ہے۔ اس سے پہلے جو کتابیں نازل ہوئیں ان میں انسانوں نے تحریف کردی۔ قرآن مجید انسانی تحریف سے محفوظ ہے کیوں کہ اللہ تعالی نے اس کی حفاظت کی ذمہ داری خود لی ہے۔ اور اس کی حفاظت کے انتظامات بھی کیے ہیں۔

اس لیے قرآن مجید اپنی اصل شکل و صورت اور زبان میں جیسا کہ اللہ کے رسول پر نازل ہوا تھا آج بھی موجود ہے اور قیامت تک محفوظ رہے گا۔

4.1 مقاصد

اس اکائی کا مقصد اس اکائی کا مقصد یہ ہے کہ اللہ کی نورانی مخلوق فرشتوں اور انسانوں کی ہدایت کے لیے رسولوں کو عطا کی جانے والی کتابوں کے بارے میں جانا جائے۔ یہ معلوم کیا جائے کہ فرشتے کون ہیں؟ دنیا کے مختلف مذہبوں میں فرشتوں کا کیا تصور ہے؟ وہ کون سے کام ہیں جو اللہ تعالی فرشتوں سے لیتا ہے؟ مشہور فرشتے کون سے ہیں؟ اور ان پر ایمان لانے کا مقصد کیا ہے؟ اسی طرح اس اکائی میں ہم یہ بھی جاننے کی کوشش کریں گے کہ رسولوں کو دی جانے والی کتابوں کی حقیقت کیا ہے؟ ان پر ایمان لانا کیوں ضروری ہے؟ معلوم آسمانی کتابیں کتنی اور کون سی ہیں؟ اور قرآن مجید اللہ کی آخری آسمانی کتاب کیوں ہے؟

4.2 فرشتے

فرشتہ فارسی زبان کا لفظ ہے اردو میں ہم نے یہ لفظ وہیں سے لیا ہے۔ عربی میں اس کے لیے قرآن مجید میں ملائکہ کا لفظ استعمال ہوا ہے۔

4.2.1 معنی و مفہوم

فرشتوں کے لیے عربی زبان میں ملائکہ کا لفظ استعمال ہوتا ہے۔ ملائکہ جمع ہے اور اس کا واحد ملک مِلاک اور مالک تین طرح سے استعمال ہوتا ہے۔ لغت یا ڈکشنری میں ملائکہ کے معنی ”قاصد“ اور ”رسول“ کے ہیں۔ اس لیے قرآن مجید میں ملائکہ کے لیے رُسُل کا لفظ بھی استعمال ہوا ہے جس کے معنی قاصد اور پیغام رساں کے ہیں۔

اصطلاح میں ملائکہ سے مراد وہ غیر مادّی مخلوق نیک ہستیاں یا ارواح ہیں جو اللہ تعالی کے حکم اور مرضی سے کائنات اور اس کے اسباب و علل کے کاروبار کو چلا رہی ہیں۔ فرشتے اس کائنات کے کارخانے کو اللہ تعالی کے احکام اور قوانین کے مطابق چلا رہے ہیں گویا وہ خالق اور اس کی مخلوقات کے درمیان پیام رسانی اور سفارت کاری کی خدمت اس طرح انجام دے رہے ہیں کہ اللہ تعالی اپنے حکم اور مرضی کو ان پر القا کرتا ہے اور وہ ایک بے اختیار محکوم کی طرح اس حکم اور مرضی کو مخلوقات کے درمیان جاری اور نافذ کر دیتے ہیں۔ یہاں ایک بات خاص طور پر یاد رکھنے کی یہ ہے کہ فرشتے سراپا اطاعت اور بندگی ہیں، وہ اللہ کے حکم اور مرضی کے بغیر ایک تنکا بھی ادھر سے ادھر نہیں کر سکتے۔ ان کا نہ تو کوئی ذاتی ارادہ ہے اور نہ ہی انہیں اس عالم کون و مکان میں کسی طرح کا کوئی اختیار حاصل ہے۔ اللہ تعالی نے انہیں اس لیے پیدا کیا ہے کہ وہ اس کی اطاعت و فرماں برداری کریں اور اس کے حکموں کو جس طرح کہ وہ چاہتا ہے ٹھیک اسی طرح بجا لائیں۔

4.2.2 دنیا کے مختلف مذاہب میں فرشتوں کا تصور

دنیا کے تمام مذاہب میں کسی نہ کسی شکل میں فرشتوں کا تصور موجود ہے۔ یہاں تک کہ قدیم زمانے کے یونانی و مصری فلسفیانہ نظریات میں بھی ایسی ہستیوں کے وجود کو تسلیم کیا گیا ہے جو فرشتوں جیسے کام انجام دیتی ہیں یا ان سے مشابہت رکھتی ہیں۔ مثلاً یونانی و مصری فلسفے میں ان کو عقول عشرہ (دس عقلیں) سے تعبیر کیا گیا ہے۔ اس طرح صابی مذہب میں ستاروں اور سیاروں کو تقریباً وہی حیثیت حاصل ہے جو دیگر مذاہب میں فرشتوں کو۔

پارسی مذہب جس میں خدا کی دوئی کا تصور پایا جاتا ہے یعنی ایک خدا نیکی کا ہے اور ایک خدا بدی کا ہے، اس میں فرشتوں یا ان جیسی ہستیوں کو "امشاسپند" کے نام سے جانا جاتا ہے اور ان کی تعداد بے شمار ہے۔ جس طرح پارسی نیکی اور بدی کے دو خداؤں کے قائل ہیں اسی طرح ان کے یہاں "امشاسپند" بھی دونوں طرح کے ہیں۔ نیکی کے فرشتے نیکی کے کاموں کو انجام دیتے ہیں اور نیکی کی چیزوں سے وابستہ ہیں جب کہ برائی کے فرشتے برائی کے کام انجام دیتے ہیں، وہ مصیبتوں کو لاتے اور ہلاکتوں کا سبب بنتے ہیں۔ پارسیوں کے یہاں نر اور مادہ فرشتوں کا تصور بھی موجود ہے۔ نیکی کے فرشتے اپنے خدا کی طرف سے نیکیوں سے متعلق اشیاء پر حاکم سمجھے جاتے ہیں اور بدی کے فرشتے بری چیزوں کے حاکم باور کیے جاتے ہیں۔ اور اس طرح نیکی اور بدی کے خدا فرشتوں کی اپنی اپنی فوجوں کے ساتھ ایک دوسرے سے برسرپیکار رہتے ہیں۔ پارسی مذہب میں فرشتوں (امشاسپند) کی درجہ بندی بھی ہے۔ ان میں چھ امشاسپند سب سے زیادہ عالی مرتب خیال کیے جاتے ہیں۔ ان کے تحت تینتیس (33) دوسرے نسبتاً کم درجے کے امشاسپند ہیں اور پھر ان میں سے ہر ایک کے تحت ہزاروں کی تعداد میں فرشتے (امشاسپند) ہیں۔

ہندو مذہب دنیا کے قدیم ترین مذاہب میں سے ہے۔ دیگر مذاہب کی طرح یہاں بھی فرشتوں کا تصور موجود ہے۔ دیویوں اور دیوتاؤں کی شکل میں ہزاروں کی تعداد میں نر اور مادہ فرشتوں کا تصور ہندو مذہب کی خصوصیت ہے۔ ان میں سے ہر ایک کسی نہ کسی خاص کام سے وابستہ ہے اور اسی حیثیت سے وہ اس چیز کا یا کام کا دیوی یا دیوتا کہلاتا ہے۔ چونکہ ہندوں میں دیوی اور دیوتائوں کو کسی قدر با اختیار باور کیا جاتا ہے اس لیے نہ صرف یہ کہ انہیں حاجت روائی کے لیے پکارا جاتا ہے بلکہ ان کی پوجا اور پرستش بھی کی جاتی ہے۔ ہوا، پانی، پہاڑ، جنگل، اور دولت غرض ہر چیز کے الگ الگ دیوی دیوتا ہیں۔ کبھی وہ مخلوق کی صورت میں فرشتوں کی صورت میں نظر آتے ہیں تو کبھی ان کی حیثیت خدائی کے درجے تک بلند کر دی جاتی ہے۔

یہودی مذہب میں بھی فرشتوں کا تصور موجود ہے اور ان کے لیے اس مذہب کی مذہبی کتابوں میں 'کروبیم' کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ فرشتوں کو نہ صرف یہ کہ مقدس و محترم جانا جاتا ہے بلکہ ان کی تعریف و توصیف اس طرح کی جاتی ہے کہ کئی بار یہ امتیاز کرنا مشکل ہو جاتا ہے کہ خدا کی حمد و توصیف بیان کی جا رہی ہے یا فرشتوں کی ثناخوانی ہو رہی ہے۔ یہودی مذہب میں فرشتوں کی تعظیم و تکریم کی جاتی ہے، ان کے آگے جھکا جاتا ہے اور اکثر انہیں خداوند کہہ کر پکارا بھی جاتا ہے جو اس بات کا مظہر ہے کہ فرشتوں کو بھی خدائی کے اختیارات حاصل ہیں۔ یہودیوں کے یہاں بعض فرشتوں کے نام بھی ملتے ہیں مثلاً جبریل اور میکائیل وغیرہ۔

یہودی مذہب کی طرح عیسائیوں میں بھی فرشتوں کا تصور موجود ہے اور دونوں کی لفظیات اور دوسری چیزوں میں بڑی حد تک یکسانی اور مماثلت بھی پائی جاتی ہے۔ اور وہ بھی فرشتوں کو جبریل اور روح القدس جیسے الفاظ سے پکارتے ہیں اور ان میں سے کچھ کو پرستش کا مقام و مرتبہ بھی حاصل ہے‘ مثلاً روح القدس کو خدا کا جز تسلیم کر کے اسے عیسائی تثلیث کا ایک رکن بنا دیا گیا ہے۔

عرب کے کفار و مشرکین میں بھی فرشتوں کا تصور موجود تھا‘ وہ ان کو خدا کی بیٹیاں کہہ کر پکارتے تھے اور بہت سارے معاملات میں انہیں حاجت روا اور قابل پرستش بھی سمجھتے تھے۔

بہر حال فرشتے وہ غیر مادی ذی روح مخلوق اور ہستیاں ہیں جن کا تصور دنیا کے تقریباً سبھی مذہبوں میں پایا جاتا ہے۔ اور یہ ایک واسطہ کے طور پر خالق اور اس کی مخلوق کے درمیان اس کے حکم اور مرضی کے مطابق مفوضہ فرائض اور ذمہ داریاں ادا کرتے ہیں۔ ان کے فرائض اور ذمہ داریوں کی وجہ سے کئی بار ان کی شخصیت کو مشتبہ بنا دیا جاتا ہے اور ایک مخلوق کو خدائی کے درجے میں پہنچا دیا جاتا ہے۔

4.2.3 اسلامی تعلیمات میں فرشتوں کی حقیقت

سب سے پہلے تو یہ جان لینا ضروری ہے کہ فرشتوں اور ان کی حقیقت کے بارے میں ہمیں وہی معلوم ہے جو اللہ اور اس کے رسول نے ہمیں بتا دیا۔ ان کے علاوہ ہمارے پاس کوئی دوسرا ایسا ذریعہ نہیں ہے جس سے کہ ہم فرشتوں کی حقیقت کو معلوم کر سکیں۔

فرشتوں کے بارے میں مختلف مذاہب اور اقوام میں جو تصورات پائے جاتے تھے اسلام نے آ کر ان کی اصلاح کی اور یہ بتایا کہ فرشتے خدائی کی صفات سے محروم ہیں۔ ان کی پرستش اور عبادت نہیں کی جا سکتی۔ وہ بھی دنیا کی دیگر مخلوقات کی طرح اللہ کی ایک مخلوق ہیں اور اس کی عبادت و اطاعت ہی ان کا امتیاز ہے۔ وہ دن و رات اللہ تعالی کی عبادت اور اس کا حکم بجالانے میں مصروف رہتے ہیں۔ وہ اپنے ارادے اور اختیار سے کچھ بھی نہیں کرتے۔ جو بھی کرتے ہیں اللہ کی مرضی اور حکم سے کرتے ہیں۔ نہ وہ خدا کے بیٹے ہیں نہ بیٹیاں نہ دیوتا ہیں نہ دیویاں بلکہ جنس سے عاری اللہ کی مخلوق ہیں۔

قرآن مجید میں فرشتوں کے بارے میں جو کچھ کہا گیا اس کا خلاصہ یہ ہے کہ فرشتے اللہ تعالی کی پیدا کی ہوئی غیر مادی ذی روح مخلوق ہیں۔ ان کا کام یہ ہے کہ وہ اللہ تعالی کی تعریف اور بڑائی بیان کرتے رہیں اور بارگاہ رب سے جو حکم بھی ان کو ملے اس کو من و عن بجالائیں، اس میں کسی طرح کی کوئی کوتاہی نہ کریں۔ وہ خالق اور اس کی مخلوقات کے درمیان واسطہ اور پیغام رسانی کا ذریعہ ہیں۔ خدا کے حکم اور اس کی مرضی کے مطابق وہ مخلوقات کے کارخانے کو چلا رہے ہیں لیکن اس چلانے میں انہیں کسی طرح کا بھی ارادہ یا اختیار حاصل نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید میں فرشتوں کے لیے صرف مَلَک اور ”رسول“ کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں جس کے معنی اس کے سوا کچھ اور نہیں کہ وہ قاصد، پیغام رساں اور ایلچی ہیں اس سے زیادہ ان کی کوئی حقیقت نہیں۔ بلکہ انسان کو علم میں فرشتوں سے اعلی مرتبہ دیا گیا ہے اور اس بنیاد پر وہ ملائکہ (فرشتوں) کو سجدہ کرنے والا نہیں بلکہ ان کا مسجود ہے۔ دونوں اللہ کی مخلوق ہیں اور اس حیثیت میں دونوں ہی اس کے سامنے یکساں طور پر عاجز و درماندہ ہیں۔ فرق یہ ہے کہ انسانوں کو مادی جسم عطا کر کے انہیں مادی اشیاء پر کسی قدر اختیار دیا گیا ہے تا کہ وہ انہیں اپنے نفع و نقصان کے لیے استعمال کر سکیں۔ اور اس ارادہ و اختیار کی جزوی آزادی کے سبب انہیں جو اب دہ بھی بنایا گیا ہے جبکہ فرشتوں کو اللہ نے

نورانی وجود بخشا، انہیں ارادہ و اختیار کی آزادی سے محروم رکھ کر آسمان و زمین اور اللہ کی وسیع مملکت میں اللہ کے احکام و ہدایات پر عمل کرنے اور انہیں نافذ کرنے جیسے کام پر متعین کیا گیا۔ دنیا میں اسباب و علل کا جو کارخانہ قائم ہے وہ نہ تو دیوی دیوتاؤں کا کرشمہ ہے نہ ہی خود بخود جاری ہے بلکہ اللہ کی مرضی اور اس کے حکم کے مطابق فرشتے انہیں کام میں لگاتے ہیں۔

4.2.4 فرشتوں کے فرائض اور ذمہ داریاں

گزشتہ سطور سے یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ فرشتے نورانی (غیر مادی) ذمہ دار ہستیاں ہیں جو اللہ کی مرضی اور اس کے حکم سے کاموں کو انجام دیتے اور انہیں جاری و نافذ کرتے ہیں۔ اور ان کاموں کی انجام دہی میں ان کی ذمہ داری کا یہ عالم ہے کہ وہ خدا کے حکم سے ذرا بھی نہیں ہٹتے۔ فرشتے اللہ کے حکم سے کن فرائض اور ذمہ داریوں کو ادا کرنے پر مامور ہیں، ان کا قرآن مجید میں متعدد مقامات پر ذکر ہوا ہے۔ ذیل میں انہیں نمبر وار درج کیا جاتا ہے:

1. قرآن مجید کے مطابق فرشتوں کی سب سے پہلی اور اہم ذمہ داری سفارت و پیام رسانی ہے یعنی خالق کے احکام اور مرضی کو مخلوقات تک پہنچانا۔ البتہ اس میں ان کا اپنا کوئی اختیار نہیں ہے اپنی مرضی سے وہ کچھ بھی نہیں کر سکتے۔ قرآن مجید میں اللہ تعالی کا ارشاد ہے:

”خدا ہی ہے جو فرشتوں اور انسانوں میں سے پیام رساں اور قاصد منتخب کرتا ہے۔ بے شک خدا سننے والا اور دیکھنے والا ہے۔ ان کے آگے اور پیچھے کا حال جانتا ہے اور تمام امور اللہ ہی کی طرف پلٹائے جاتے ہیں۔“ (الحج:75۔76)

ایک دوسری آیت میں ان کی سفارت کاری اور بے اختیاری کا ذکر اس طرح ہے:

”تمام تعریف ہے اس خدا کے لیے جو آسمانوں اور زمین کا پیدا کرنے والا ہے اور فرشتوں کو دو دو، تین تین، چار چار شہپر بازوں والے پیام رساں بنانے والا ہے۔ وہ پیدائش میں جو چاہے بڑھا دے۔ وہ ہر چیز پر قادر ہے۔ وہ لوگوں کے لیے جو رحمت کھولے تو کوئی اس کا روکنے والا نہیں اور جو روک دے تو اس کے سوا کوئی چھوڑنے والا نہیں اور وہی غالب دانا ہے۔“ (فاطر:2)

اس سے اس بات کا پتہ چلتا ہے کہ فرشتوں کا کام پہنچا دینے کے سوا کچھ بھی نہیں۔ انہیں اس دنیا کی حکمرانی اور انتظامات میں کوئی دخل نہیں، کرنے والی ذات صرف اللہ کی ہے۔

2. فرشتے وہ پاکباز ہستیاں ہیں جو اللہ تعالی کے احکامات و مرضیات کو اس جہان رنگ و بو میں جاری و نافذ کرتے ہیں۔ قرآن مجید میں اللہ تعالی کا ارشاد ہے:

”(یاد کرو) جب تمہارا رب (پروردگار) فرشتوں کو وحی کر رہا تھا کہ میں تمہارے ساتھ ہوں۔ تم مومنوں کو ثابت قدم رکھو۔ (الانفال:12)

ایک دوسری جگہ ارشاد ہے: ”اس میں فرشتے اور روح اپنے پروردگار کے حکم سے ہر کام کو لے کر نیچے اترتے ہیں“ (القدر:4)

موت بھی اللہ کے حکم سے فرشتے دیتے ہیں:

"کہہ دو کہ موت کا فرشتہ جو تم پر نگراں بنایا گیا ہے، تم پر موت طاری کرے گا" (السجدہ:11)

3. فرشتے ہی اللہ اور اس کے رسولوں کے درمیان بھی سفارت کاری کا فریضہ انجام دیتے ہیں اور ان تک ان کے پروردگار کا حکم اور ہدایات پہنچاتے ہیں۔ اللہ تعالی کا ارشاد ہے:

"یا خدا (آدمی سے اس طرح باتیں کرتا ہے کہ) اپنا ایک ایک سفیر بھیجتا ہے تو وہ اس (خدا) کی اجازت سے جو وہ (خدا) چاہتا ہے وحی کرتا ہے۔" (الشوریٰ:51)

ایک دوسری جگہ ارشاد ہے:

"خدا روح کے ساتھ فرشتوں کو اپنے حکم سے اپنے بندوں میں سے جس پر چاہتا ہے اتارتا ہے" (النحل:)

"پس اس (جبریل فرشتہ) نے قرآن کو خدا کے حکم سے تمہارے دل پر اتارا" (البقرہ:97)

4. فرشتوں کی ایک ذمہ داری یہ بھی ہے کہ یہ لوگوں کے پاس بشارت (خوش خبری) لے کر جاتے ہیں اور عذاب لے کر بھی اترتے ہیں۔ اللہ تعالی کا ارشاد ہے: "ہمارے سفیر (فرشتے) ابراہیم کے پاس بشارت لے کر آئے"

ایک دوسری جگہ حضرت مریم کی خوش خبری کے حوالے سے ارشاد ہے:

"میں تیرے رب کا فرستادہ ہوں کہ تجھے ایک پاک لڑکا بخشوں" (مریم:19)

حضرت لوط کے پاس ان کی قوم کی بربادی کی خبر بھی فرشتے لے کر آئے تھے:

"کہا اے لوط! ہم تیرے پروردگار کے بھیجے ہوئے ہیں" (ھود:81)

5. انسان جو کچھ بھی کرتا ہے سب کچھ اللہ کی نظر میں ہے۔ لیکن اللہ تعالی انسانوں کی نگہبانی اور نگرانی کا کام فرشتوں سے بھی لیتا ہے۔ وہ نہ صرف انسانوں کی نگرانی کرتے ہیں بلکہ ان کے اچھے اور برے کاموں کا ریکارڈ بھی محفوظ رکھتے ہیں اللہ تعالی کا ارشاد ہے:

"بے شک تم پر نگہبان ہیں، جو بزرگ ہیں، لکھنے والے ہیں، تم جو کچھ بھی کرتے ہو اس کو وہ جانتے ہیں"۔ (الانفطار:12-10)

"کوئی بات منہ سے نہیں نکالتا لیکن اس کے پاس ایک نگہبان حاضر ہے" (ق:18)

"تم میں سے کوئی بات چھپا کر کہے یا زور سے کہے یا وہ رات میں چھپے یا دن کو کرے، خدا کے تعاقب کرنے والے اس کے سامنے سے اور اس کے پیچھے سے خدا کے حکم سے اس کی نگرانی کرتے ہیں۔" (الرعد 10۔11)

"اور وہ (خدا) تم پر نگراں بھیجتا ہے یہاں تک کہ تم میں سے جب کسی کی موت آتی ہے تو ہمارے قاصد (فرشتے) اس کی عمر پوری کرتے ہیں اور وہ اپنے اس کام میں کمی نہیں کرتے" (الانعام:61)

6. فرشتوں کی ایک ذمہ داری یہ بھی ہے کہ وہ انسانوں کے اعمال کے مطابق ان پر خدا کی رحمت یا لعنت کے نزول کا ذریعہ اور واسطہ

بھی بنتے ہیں:

قرآن مجید میں اللہ تعالی کے واضح ارشادات ہیں:

”نیکوکاروں کو وہ بڑی گھبراہٹ (قیامت) غم گین نہ کرے گی اور فرشتے ان کا آگے بڑھ کر استقبال کریں گے (کہ) یہی وہ دن ہے جس کا تم سے وعدہ کیا گیا تھا۔“ (الانبیاء:103)

”جن لوگوں نے یہ کہا کہ ہمارا پروردگار اللہ ہے، پھر اس پر قائم رہے، ان پر فرشتے یہ کہتے ہوئے اتریں گے کہ نہ ڈرو اور نہ غم کرو اور اس جنت کی خوش خبری سنو جس کا تم سے وعدہ کیا گیا تھا۔ ہم ہیں جو تمہاری پہلی اور اُس دوسری زندگی میں تمہارے رفیق ہیں۔“ (حم السجدہ:30-31)

7. جو لوگ اس دنیا میں اچھے کام کریں گے اس کے بدلے اللہ انہیں دوسری زندگی میں جنت دے گا اور جو برے کام کریں گے انہیں جہنم میں ڈالا جائے گا۔ جنت اور جہنم کا انتظام وانصرام بھی اللہ کے حکم سے فرشتوں کے ذمہ ہے۔ اللہ تعالی کا ارشاد ہے:

”اور کفر کرنے والے گروہ در گروہ کر کے جہنم کی طرف لے جائے جائیں گے، یہاں تک کہ جب اس کے پاس پہنچیں گے تو اس کے دروازے کھولے جائیں گے اور اس کے چوکی دار (فرشتے) کہیں گے کہ کیا تمہارے پاس تمہیں میں سے پیغمبر نہیں آئے۔“ (الزمر:72)

”اور جو اپنے پروردگار سے ڈرتے تھے، وہ گروہ در گروہ جنت میں لے جائے جائیں گے، یہاں تک کہ جب وہ اس کے پاس پہنچیں گے اور اس کے دروازے کھولے جائیں گے اور اس کے پاسبان (فرشتے) کہیں گے تم پر سلامتی ہو۔ خوش خوش جنت میں ہمیشہ کے لیے داخل ہو جاؤ۔ (الزمر:73)

8. فرشتے اللہ تعالی کی بارگاہ قدس کے حاضر باش ہیں اور قیامت کے دن تخت الٰہی کو وہی اٹھائے ہوئے ہوں گے۔

”اور تم فرشتوں کو دیکھو گے کہ عرش کے اردگرد احاطہ کیے ہوئے اپنے پروردگار کی حمد و ثنا میں مصروف ہوں گے۔“ (الزمر: 75)

”مجھے خدا کے بلند درباریوں کا علم نہیں جب وہ باتیں کرتے ہیں۔“ (ص:69)

9. فرشتے خدا سے سرکشی اور نافرمانی نہیں کرتے۔ ہمیشہ اس کی بڑائی و بزرگی اور حمد و تعریف بیان کرتے رہتے ہیں۔ وہ ہمیشہ اللہ تعالی کے جلال و قدرت سے ڈرتے رہتے ہیں اور اللہ کے حضور میں زمین والوں کے لیے عام طور پر اور نیکی کرنے والوں کے لیے خاص طور پر مغفرت کی دعا کرتے رہتے ہیں۔ لیکن اس سے یہ دھوکا بھی نہیں ہونا چاہیے کہ فرشتوں کی دعا رحمت و برکت کا ذاتی سبب ہے بلکہ بخشش و رحمت کرنے والا صرف اور صرف اللہ تعالی ہے:

”اور فرشتے حمد کے ساتھ اپنے رب کی تسبیح کرتے رہتے ہیں اور زمین والوں کی بخشایش کی دعا مانگا کرتے ہیں۔ ہشیار کہ بخشنے والا اور رحم کرنے والا خدا ہی ہے۔“ (الشوریٰ:5)

”بلکہ وہ بزرگ بندے ہیں جو بات میں اس (خدا) پر پیش دستی نہیں کرتے اور اس کے حکم پر عمل کرتے ہیں۔۔۔۔ اور وہ اس کے خوف سے ترساں رہتے ہیں“ (الانبیاء:26۔28)

4.2.5 بعض فرشتوں کے نام اور ان کی ذمہ داریاں

فرشتوں کے بارے میں ہمیں یہ معلوم ہو چکا ہے کہ وہ نورانی ہستیاں ہیں جو اللہ کے حکم اور اس کی مرضی سے مختلف کام انجام دیتے ہیں۔ فرشتے نہ مرد ہیں نہ عورت۔ اللہ تعالی نے انہیں جن کاموں پر لگا دیا ہے انہیں کاموں پر وہ لگے ہوئے ہیں۔ ان کی تعداد بے شمار ہے۔ البتہ ان میں سے کچھ کا ذکر قرآن مجید اور احادیث میں آیا ہے۔ ان میں چار فرشتے اللہ تعالی کے نہایت مقرب ہیں اور ان کے بارے میں کچھ تفصیلات بھی ملتی ہیں۔ ذیل میں ان کا مختصراً ذکر کیا جاتا ہے۔

1. حضرت جبریلؑ

اللہ تعالی کے مقرب فرشتے ہیں۔ اللہ کی جانب سے پیغمبروں تک پیغام رسانی کا کام انہیں کے ذمہ تھا۔ یہ اللہ کے حکم سے وحی پیغمبروں کے پاس لاتے تھے جس میں کہ بندگان خدا کے لیے احکام وہدایات ہوتی تھیں۔ اللہ کے آخری رسول حضرت محمدؐ کے پاس بھی وحی لے کر حضرت جبریلؑ آتے تھے۔ احادیث کی رو سے کم از کم دوبار اللہ کے رسولؐ نے حضرت جبریلؑ کو ان کی اصل صورت میں دیکھا ہے۔ اسی طرح انسانوں کی شکل میں بھی حضرت جبریلؑ رسولؐ اللہ کے پاس آیا کرتے تھے۔ دنیا میں خدا کے باغیوں اور نافرمانوں پر عذاب بھی اللہ تعالی نے حضرت جبریلؑ کے ذریعہ بھیجا ہے اور اب بھی یہ کام ان کے ذمہ ہے۔ اس کے علاوہ جس طرح سارے فرشتے خدا کے ذکر و تسبیح میں ہر وقت لگے رہتے ہیں حضرت جبریلؑ بھی ہر وقت اللہ کے ذکر و تسبیح میں مشغول رہتے ہیں۔

2. حضرت میکائیلؑ

قرآن مجید میں جن دو فرشتوں کا صراحت کے ساتھ ذکر ہے ان میں حضرت جبریلؑ کے علاوہ حضرت میکائیلؑ ہیں۔ اللہ کی طرف سے حضرت میکائیلؑ مخلوقات کو روزی پہنچانے کے کام پر مامور ہیں۔ بارش کا انتظام بھی ان کی ذمہ داریوں میں شامل ہے۔ فرشتوں کی ایک جماعت ان کی ماتحتی میں مختلف کام انجام دیتی ہے۔ خاص طور پر بادلوں، ہواؤں، پہاڑوں، دریاؤں وغیرہ پر یہ فرشتے مقرر ہیں اللہ کے حکم اور مرضی کے مطابق سونپے گئے کاموں کو انجام دیتے ہیں۔

3. حضرت اسرافیلؑ

ہر مسلمان کا عقیدہ ہے کہ ایک دن یہ دنیا ختم ہو جائے گی اسے قیامت کہتے ہیں۔ قیامت کا قیام ایک بھیانک زور دار آواز سے ہوگا اور دنیا کا یہ کارخانہ پوری طرح ختم ہو جائے گا۔ اللہ تعالی نے دنیا کے خاتمے کے کام پر جس فرشتے کو مامور کیا ہے ان کا نام اسرافیلؑ ہے۔ وہ صور منہ میں لیے کان لگائے اللہ کے حکم کے منتظر ہیں۔ جیسے ہی اللہ کا حکم ہوگا وہ صور میں پھونک ماریں گے۔ ایک زور دار گڑگڑاہٹ والی آواز پیدا ہوگی اور یہ دنیا اور اس میں جو کچھ بھی ہے سب تہس نہس ہو جائے گا' کوئی بھی ذی روح زندہ نہ بچے گا۔ سب کچھ ختم ہو جائے گا۔ پھر ایک عرصہ بعد حضرت اسرافیلؑ اللہ کے حکم سے دوبارہ صور میں پھونک ماریں گے۔ پھر ایک آواز پیدا ہوگی جسے سن کر سارے اگلے پچھلے

انسان، جو کبھی بھی دنیا میں پیدا ہوئے تھے، ایک بار پھر زندہ ہو کر اٹھ کھڑے ہوں گے۔ ایک دوسرا جہاں قائم ہو گا۔ حشر کے میدان میں سب اکٹھا ہوں گے اور پھر سب کا حساب کتاب ہو گا۔ اعمال کے مطابق انہیں بدلہ دیا جائے گا اللہ کے فرماں بردار جنت میں جائیں گے اور نافرمانوں کا ٹھکانہ جہنم ہو گی۔

4. حضرت عزرائیلؑ

اللہ کی طرف سے مخلوقات کی جان نکالنے پر جو فرشتہ مامور ہے اس کا نام عزرائیلؑ ہے۔ ان کی ماتحتی میں بے شمار فرشتے اس کام میں لگے ہوئے ہیں۔ کچھ فرشتے ہیں جو اللہ کے نیک بندوں کی جان نکالتے ہیں اور کچھ ہیں جو نافرمانوں کی جان نکالنے پر مامور ہیں۔

ان چار فرشتوں کے بارے میں کہا جاتا کہ اللہ تعالی کے سب سے مقرب فرشتے ہیں۔ قرآن مجید اور احادیث میں ان چار کے علاوہ بھی بعض فرشتوں کے نام اور کاموں کا ذکر ہے مثلاً۔

کراما کاتبین: یعنی وہ فرشتے جو انسانوں کی ڈائری مرتب کرتے ہیں یا ان کے اعمال کا ریکارڈ رکھتے ہیں۔ اللہ تعالی نے ہر انسان کے ساتھ دو فرشتے لگا رکھے ہیں جو انسان کے ایک ایک اچھے برے عمل کو نوٹ کرتے اور لکھتے ہیں اور اس طرح انسان کی اچھائیوں اور برائیوں کا ریکارڈ تیار ہوتا رہتا ہے۔ قرآن میں انہیں کراما کاتبین (بزرگ لکھنے والے) کے نام سے یاد کیا گیا ہے۔

حَفَظَہ: اللہ تعالی نے کچھ فرشتوں کو انسانوں کی آفتوں اور بلاؤں سے حفاظت کے لیے مقرر کر رکھا ہے۔ جن لوگوں کے بارے میں اللہ کا حکم اور مرضی ہوتی ہے ان کی یہ آفتوں، مصیبتوں اور بلائوں سے حفاظت کرتے ہیں۔ ان کو حَفَظَہ اس لیے کہا جاتا ہے کہ یہ حفاظت کرنے کے کام پر مامور ہیں۔

منکر نکیر: یہ وہ فرشتے ہیں جو موت کے بعد اور دوسری زندگی شروع ہونے سے پہلے عالم برزخ میں انسانوں سے سوالات کرنے پر اللہ کی جانب سے مامور ہیں۔ مرنے کے بعد ہر انسان کے پاس دو فرشتے آتے ہیں، جنہیں وہ پہچانتا نہیں ہوتا ہے، اور اس سے تین سوال کرتے ہیں پہلا سوال اس کے رب کے بارے میں یعنی مَنْ رَبُّکَ؟ تمہارا رب کون ہے یعنی کون سی ہستی ہے جو تمہیں پالتی اور پرورش و پرداخت کرتی ہے اور تم نے کسے دنیا میں خالق، مالک، رب اور معبود تسلیم کیا۔ دوسرا سوال دین کے بارے میں ہو گا یعنی مادینک تمہارا دین کیا ہے۔ تم نے کس دین اور راستے کی پیروی کی اور کس کے بتائے ہوئے طریقے پر چلتے ہوئے عمر گزاری۔ تیسرا سوال نبی کے بارے میں ہو گا یعنی اس کے سامنے اس کے نبی کو پیش کر کے پوچھا جائے گا من هذا؟ یہ کون ہے؟ تم نے اس کی باتوں کو سنا تھا یا سن کر ان سنی کر دی تھی۔ چونکہ یہ فرشتے اجنبی شکل و صورت کے ہوں گے اس لیے ان کو منکر نکیر کہا جاتا ہے۔

جنت و جہنم کے منتظم فرشتے: اللہ تعالی نے کچھ فرشتوں کو جنت و جہنم کے انتظام پر لگا رکھا ہے اور وہ ان کی دیکھ بھال کرتے ہیں۔ جو فرشتہ جنت کے انتظام پر مامور ہے اسے رضوان کہتے ہیں' اور جس فرشتے کے ذمہ جہنم کا انتظام ہے اسے مالک کہتے ہیں۔ یعنی جنت کا داروغہ و منتظم رضوان اور جہنم کا داروغہ و منتظم مالک نام کے فرشتے ہیں۔

حاملین عرش: کچھ فرشتے ہیں جو اللہ تعالی کے عرش کو اٹھائے ہوئے ہیں۔ ان فرشتوں کو حاملین عرش کہا جاتا ہے۔

عابد و ذاکر فرشتے: ان گنت فرشتے ہیں جو دن رات چوبیس گھنٹے اللہ تعالی کی عبادت اور اس کے ذکر میں مشغول رہتے ہیں۔ ذکر اور عبادت ہی ان کا مشغلہ ہے۔ اس کے علاوہ ان کے ذمہ کوئی دوسرا کام نہیں ہے۔

4.2.6 فرشتوں پر ایمان لانا کیوں ضروری ہے؟

فرشتے اللہ کی غیر مادی نورانی مخلوق ہیں۔ انسان مادی اور غیر مادی دونوں طرح کی چیزوں سے متاثر ہوتا ہے اور جب اس کا یہ تاثر ایک خاص سطح تک پہنچ جاتا ہے تو پھر وہ ان اشیاء کی بندگی اور پرستش کرنے لگتا ہے اور یہ سمجھتا ہے کہ جو کچھ بھی ہوتا ہے انہیں کے ذریعے ہوتا ہے۔ اللہ تعالی نے اس کی نفی کی ہے۔ مادی اشیاء ہوں یا غیر مادی انہیں کسی بھی طرح کی قدرت حاصل نہیں۔ جو کچھ بھی ہوتا ہے اللہ کی مرضی اور حکم سے ہوتا ہے۔ انسان جب لا الہ الا اللہ کا اقرار کرتا ہے تو ان ساری ماڈی و غیر مادی مخلوقات کی طاقت و قدرت کی نفی کر دیتا ہے۔ البتہ مادیت اور غیر مادیت سے پرے بھی بعض خواص ہیں جو انسانی نظر سے اوجھل رہتے ہیں۔ کائنات کے بہت سے امور انہیں کے ذریعے انجام پذیر ہوتے ہیں۔ کوئی بھی زمانہ رہا ہو انسان نے مختلف ناموں اور مظاہر کے تحت ان نہ نظر آنے والی قوتوں کا نہ صرف ادراک کیا ہے بلکہ اکثر انہیں اللہ کا شریک اور ساتھی بھی بناتا رہا ہے۔ فرشتوں پر ایمان لانا اس لیے ضروری ہے کہ اس کے بعد انسان کو یہ پتہ چل جاتا ہے کہ جو بھی ماڈی یا غیر مادی، جان دار و بے جان اشیاء جن کا ہم ادراک کرتے ہیں ان کی قوت نہ تو ذاتی ہے اور نہ ہی جو قوتیں ان کے پیچھے کار فرما ہیں ان کی ہے، بلکہ جو کچھ بھی ہو رہا ہے اللہ کے حکم اور مرضی سے ہو رہا ہے۔ زمین و آسمان اور ان کے درمیان دنیا کا جو کارخانہ چل رہا ہے اس کو چلانے والے اللہ کے حکم اور مرضی کے پابند ہیں وہ اللہ کے حکم سے ذرا بھی ہٹ نہیں سکتے۔ ان کے اندر یہ صلاحیت ہی نہیں کہ وہ اللہ کی نافرمانی کر سکیں اس لیے اللہ کو چھوڑ کر یا اللہ کے ساتھ ان کی بندگی و عبادت نہیں کی جانی چاہیے۔ چہ جائے کہ ان کی پرستش اور پوجا کی جائے وہ تو انسان کے برابر بھی نہیں ہیں۔ ان کی پرستش انسانیت کی توہین ہے کیونکہ خود اللہ تعالی نے ان سے انسان کو سجدہ کرایا ہے اور اس طرح انسانیت کی تکریم کی ہے۔

ہم جب فرشتوں پر ایمان لاتے ہیں تو اس سے دو مقاصد حاصل ہوتے ہیں۔

1. ایک یہ کہ اسلام سے پہلے بہت سی قوموں اور مذاہب میں فرشتوں کو خدائی کا درجہ حاصل تھا یا ان کے بارے میں یہ باور کیا جاتا تھا کہ فرشتے بھی خدا کی خدائی میں شریک ہیں۔ فرشتوں پر ایمان لانے کے بعد ان کی یہ حیثیت ختم ہو جاتی ہے اور پتہ چلتا ہے کہ فرشتے بھی اللہ تعالی کی مخلوقات میں سے ایک مخلوق ہیں اور انہیں کوئی اختیار حاصل نہیں۔ وہ بے اختیار ہیں اپنی مرضی اور ارادے سے کچھ بھی نہیں کر سکتے۔ اس طرح فرشتوں پر ایمان لانا کلمۂ توحید کی تکمیل کرنا ہے۔
2. فرشتوں پر ایمان لانے سے دوسرا مقصد یہ حاصل ہوتا ہے کہ مادہ پرست انسان ماڈی اشیاء کے خواص اور خوبیوں کو دیکھ کر یہ سمجھنے لگتا ہے کہ ان کے خواص اور خوبیاں ان کی اپنی ذاتی ہیں اور اس طرح وہ خدا کا انکار کر بیٹھتا ہے۔ فرشتوں پر ایمان لانے کا مطلب یہ ہے کہ ان قوتوں کے پیچھے کچھ روحانی قوتیں کار فرما ہیں اور وہ اللہ کے حکم اور مرضی سے ان کو چلا رہی ہیں اور اس طرح مادیت کا

بُت ہمیشہ کے لیے پاش پاش ہو جاتا ہے۔

4.3 آسمانی کتابیں

جس طرح فرشتوں پر ایمان لانا ضروری ہے اسی طرح اللہ کی نازل کردہ کتابوں پر ایمان لانا بھی ضروری ہے۔ اللہ تعالی نے رسولوں کی طرح ہر زمانے میں کتابیں بھی انسانوں کی ہدایت کے لیے بھیجیں۔ اب یہ الگ بات ہے کہ جس طرح انسان رسولوں کی تعلیمات کو بھلاتا رہا اسی طرح اس نے کتابوں میں مذکور ہدایات کو بھی بھلا دیا یا ان کی من مانی تاویلات کیں۔ سب سے آخر میں اللہ تعالی نے آخری کتاب قرآن مجید اپنے آخری رسول حضرت محمدؐ پر نازل کی۔ اس کتاب کے الفاظ و ہدایات سب قیامت تک کے لیے محفوظ ہیں اور اس میں کسی طرح کی تبدیلی یا ترمیم و اضافہ نہیں کیا جا سکتا۔

4.3.1 معنی و مفہوم

کتب کتاب کی جمع ہے۔ یہ عربی زبان کا لفظ ہے اور اس کی اصل ک ت ب ہے جس کا معنی لکھنا ہے۔ عربی زبان میں کتاب مکتوب (لکھا ہوا) کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ لغوی طور پر لفظ کتاب کا اطلاق ہر لکھی ہوئی چیز پر ہوتا ہے خواہ وہ تحریر مختصر ہو یا طویل یہاں تک کہ خط اور مراسلے کے لیے بھی کتاب کا لفظ استعمال ہوتا ہے۔

کتاب کا لفظ قرآن مجید میں مختلف معنوں میں استعمال ہوا ہے البتہ قرآن میں کتاب کا جو مفہوم سب سے نمایاں ہے وہ یہ کہ کتاب اس مقدس تحریر کو کہتے ہیں جو اللہ تعالی کی وحی پر مشتمل ہو اور اللہ تعالی نے اسے اپنے بندوں کی ہدایت اور رہنمائی کے لیے نازل کیا ہو۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید میں یہودیوں اور عیسائیوں کو---جن کے پاس اللہ تعالی کی کتابیں توراۃ اور انجیل تھیں---اہل کتاب کے نام سے یاد کیا گیا ہے۔ اسی طرح الکتاب کی اصطلاح قرآن مجید کے لیے استعمال ہوئی ہے۔

4.3.2 کتابوں پر ایمان لانے کی اہمیت اور ضرورت

اللہ کے فرشتوں کی طرح اللہ تعالی کی نازل کردہ کتابوں پر بھی ایمان لانا ضروری ہے۔ جب تک کوئی شخص کتابوں پر ایمان نہیں لاتا، اس کا اسلام کا دعوی جھوٹا ہے۔ اور کتابوں پر ایمان لانے کا مطلب یہ نہیں کہ آخری رسولؐ حضرت محمدؐ پر جو کتاب یعنی قرآن مجید نازل ہوئی صرف اسی پر ایمان لانا کافی ہے، بلکہ قرآن مجید کے ساتھ دیگر آسمانی کتابوں پر بھی ایمان لانا ضروری ہے خواہ ان کے نام اور جن انبیاء پر وہ نازل ہوئیں ان کے نام ہمیں معلوم ہوں جیسا کہ توریت، زبور اور انجیل کے بارے میں ہم جانتے ہیں یا ان کتابوں اور جن پر وہ نازل ہوئیں ان کے نام ہمیں معلوم نہ ہوں، ان پر بھی ایمان لانا ضروری ہے کیونکہ اللہ تعالی نے دنیا کی ہر قوم، زبان اور خطے میں رسول اور کتابیں بھیجی ہیں۔

کتابوں پر ایمان لانے کی ایک اہمیت یہ ہے کہ اس طرح ایک مسلمان کا انسانیت کا تصور بہت وسیع ہو جاتا ہے۔ وہ یہ جان لیتا ہے کہ سبھی انسان اللہ کے بندے اور غلام ہیں اور اللہ تعالی نے سب کی ہدایت اور رہنمائی کے لیے نبیوں، رسولوں اور کتابوں کو بھیجا۔ اور جب سب

کے پاس رسول اور کتابیں آئیں تو اس حیثیت سے سب کی بنیادی تعلیمات ایک ہی رہی ہوں گی' یہ الگ بات ہے کہ بعد میں ان کے ماننے والوں نے ان کتابوں میں تحریف کر دی اور ان کی تعلیمات کو بھلا دیا۔

کتابوں پر ایمان لانے کی اہمیت یہ بھی ہے کہ رسولوں کو صرف رسول مان لینا ہی کافی نہیں ہے بلکہ اس کے ساتھ ہی انہیں وحی کا جو صحیفہ دیا گیا اس پر بھی ایمان لانا ضروری ہے۔ انسان جب کتاب پر ایمان لاتا ہے تو وہ اس بات کا اقرار ہی نہیں کرتا ہے کہ وہ اس پر ایمان لاتا ہے بلکہ اس پر کتاب میں مذکور ہدایات و تعلیمات پر عمل کرنا بھی واجب ہوتا ہے۔ اس میں جن کاموں کو کرنے کا حکم دیا گیا ہے ان کا کرنا اس کے لیے ضروری ہے اسی طرح جن کاموں کو کرنے سے روکا گیا ہے ان سے رک جانا بھی اس کے لیے لازم ہے۔ ایک مسلمان جب قرآن مجید کو اللہ تعالی کی کتاب تسلیم کرتا ہے تو گویا وہ یہ بات بھی تسلیم کرتا ہے کہ اس کتاب الہی میں عقائد و عبادات و اعمال سے متعلق جو بھی علمی و عملی ہدایات موجود ہیں ان سب پر عمل پیرا ہونے کی یقین دہانی کرا رہا ہے۔

اسلام اور پیغمبر اسلام نے اپنے ماننے والوں کو صرف قرآن مجید پر ایمان لانے کی تعلیم نہیں دی بلکہ ایک مسلمان کا ایمان بالکتاب اس وقت تک مکمل ہوتا ہی نہیں جب تک کہ وہ سبھی آسمانی کتابوں کی تصدیق نہیں کرتا۔

تمام آسمانی کتابوں پر ایمان لانا اس لیے بھی ضروری ہے کہ اس طرح ایک مسلمان اس بات کا بھی اعلان کرتا ہے کہ اللہ تعالی کی بنیادی ہدایات و تعلیمات تمام آسمانی کتابوں میں ایک ہی ہیں۔ قرآن مجید انہیں ہدایات و تعلیمات کو آخری اور مکمل شکل میں پیش کرتا ہے جو پہلے کی کتابوں میں دی گئی تھیں اور جن میں ان کے پیروؤں نے تحریف کر ڈالی۔

4.3.3 قرآن مجید اور دوسری آسمانی کتابوں کی حیثیت میں فرق:

ایک سوال یہاں یہ پیدا ہو سکتا ہے کہ جب تمام آسمانی کتابوں پر ایمان لانا ضروری ہے تو پھر عمل قرآن مجید کی تعلیمات پر ہی ضروری کیوں؟ دوسری کتابوں کی تعلیمات پر عمل کر کے بھی تو نجات حاصل ہو سکتی ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ قرآن مجید اور پہلے کی آسمانی کتابوں کی حیثیتوں میں فرق ہے۔ ہم اس فرق کو تفصیل کے ساتھ بیان کرتے ہیں:

1. سب سے پہلی بات تو یہ کہ قرآن مجید اللہ کی آخری کتاب ہے اور اس طرح وہ پہلے نازل ہونے والی تمام کتابوں کی ناسخ ہے' پہلی کتابوں کی صرف تصدیق ضروری ہے عمل قرآنی ہدایات پر کیا جائے گا۔
2. پہلے جو کتابیں انبیاء پر نازل ہوئیں وہ اپنی اصلی صورت میں باقی نہیں رہیں۔ ان کے اصلی نسخے ہی غائب ہو گئے صرف ترجمے باقی رہ گئے۔ ترجمے اور اصل کا فرق ہر کوئی آسانی سے سمجھ سکتا ہے۔ جب کہ قرآن مجید اپنی اصل صورت میں بعینہ موجود ہے۔ قرآن مجید کا جن الفاظ میں محمدؐ عربی پر نزول ہوا تھا بعینہ انہیں الفاظ میں وہ آج بھی موجود ہے اس کا ایک ایک حرف بلکہ ایک ایک شوشہ بغیر کسی تبدیلی اور تغیر کے محفوظ ہے۔
3. قرآن مجید سے پہلے کی کتابیں اپنی اصل شکل میں باقی نہیں رہیں ان میں اللہ کے کلام کے ساتھ ساتھ انسانی کلام بھی ملا دیا گیا۔ کتاب ایک ہی ہے لیکن اس میں کلام الہی بھی ہے، قومی تاریخ بھی ہے، بزرگوں کے حالات بھی مذکور ہیں، تفسیر و تشریح بھی ہے

اور شرعی مسئلوں کا بیان بھی ہے۔ ان کتابوں میں یہ سب چیزیں اس طرح گھل مل گئی ہیں کہ اس میں سے کلام الہی کو الگ کرنا ممکن نہیں ہے۔ اس کے برعکس قرآن مجید پوری طرح محفوظ ہے۔ وہ صرف اور صرف کلام الٰہی ہے۔ قرآن مجید میں ذرہ برابر بھی کسی دوسرے کلام کی ملاوٹ نہیں ہے۔ دیگر موضوعات پر اسلامی تاریخ میں جو کچھ بھی لکھا گیا بالکل الگ ہے یہاں تک کہ اللہ کے رسول کے کلام کو بھی حدیث کی الگ کتابوں کی شکل میں مدون کیا گیا۔ قرآن میں ایک لفظ کی بھی ملاوٹ نہیں ہوئی۔

4. قرآن مجید سے پہلے جو بھی آسمانی کتابیں نازل ہوئیں، ان کی تاریخی شہادت کوئی بھی نہیں پیش کر سکتا یعنی تاریخی طور پر ان کا ثبوت نہیں ملتا۔ تاریخی طور پر ان کے بارے میں یہ بھی نہیں ثابت کیا جا سکتا کہ جن انبیاء کی طرف ان کی نسبت کی جاتی ہے، واقعہ میں انہیں انبیاء پر وہ نازل بھی ہوئی تھیں۔ ان میں بعض کتابیں ایسی بھی ہیں جن کا نہ تو زمانہ نزول معلوم ہے اور نہ ہی یہ معلوم ہے کہ کس نبی پر وہ نازل ہوئی تھیں۔ اس کے برعکس قرآن مجید تاریخی طور پر بھی بالکل مستند کتاب ہے۔ قرآن مجید کس زمانے میں نازل ہوا اور کس نبی پر نازل ہوا اس کی تاریخی شہادتیں اتنی مضبوط ہیں کہ کسی کو اس کی نبی کی طرف نسبت اور زمانے کے بارے میں ذرا بھی شک وشبہ نہیں ہو سکتا۔ قرآن مجید کے بارے میں ایسی شہادتیں بھی موجود ہیں کہ اس کی کون سی سورہ اور آیت کب اور کہاں نازل ہوئی۔
5. قرآن مجید سے پہلے کی آسمانی کتابیں جن زبانوں میں نازل ہوئیں، وہ سب مردہ ہو چکی ہیں۔ اب نہ تو وہ بولی جاتی ہیں نہ لکھی جاتی ہیں اور ایسے لوگ بھی بہت کم ہیں جو ان زبانوں کو سمجھ سکتے ہوں۔ اگر ایسی کتابیں اپنی صحیح حالت میں بھی موجود رہتیں تو ان کو صحیح ڈھنگ سے سمجھنا اور پھر ان پر عمل کرنا ممکن نہیں تھا۔ اس کے برعکس قرآن مجید واحد آسمانی کتاب ہے جو ایک زندہ زبان میں ہے۔ دنیا میں کروڑوں کی تعداد میں لوگ اس زبان کو بولتے ہیں۔ جاننے اور سمجھنے والوں کی تعداد اس سے بھی زیادہ ہے۔ دنیا میں ہر جگہ اس کی تعلیم کا نظم ہے۔ جو بھی چاہے اس کو سیکھ سکتا ہے یا ان لوگوں سے اس کے معنی معلوم کر سکتا ہے جو براہ راست عربی زبان میں قرآن مجید کو پڑھتے اور سمجھتے ہیں۔
6. قرآن سے پہلے کی آسمانی کتابوں کے مخاطب کسی خاص قوم یا علاقے کے لوگ ہوا کرتے تھے۔ ان کی ہدایات سے لگتا ہے کہ وہ ایک خاص زمانے حالات اور ضروریات کے لحاظ سے تھیں۔ کسی بھی کتاب کی ہدایات عالم گیر اہمیت کی حامل نہیں۔ اس کے برعکس قرآنی تعلیمات میں دوام اور ہمہ گیری ہے۔ اس میں بار بار خطاب انسانوں سے کیا گیا ہے‘ کسی خاص زمانے یا علاقے کے لوگوں کو مخاطب نہیں کیا گیا ہے۔ قرآن کی تعلیمات ایسی ہیں کہ ان پر ہر زمانے میں اور ہر جگہ عمل کیا جا سکتا ہے۔
7. قرآن سے پہلے کی آسمانی کتابوں میں الگ الگ تعلیمات اور اخلاقی قدروں پر زور ملتا ہے۔ ان میں سے کوئی بھی ایسی نہیں جسے جامع اور مکمل قرار دیا جا سکے۔ اس کے برعکس قرآن تمام خوبیوں کا جامع ہے۔ اس میں نہ صرف یہ کہ پچھلی تمام کتابوں کی الگ الگ خوبیاں جمع کر دی گئی ہیں بلکہ جو خوبیاں پچھلی کتابوں میں نہیں تھیں انہیں بھی اس میں شامل کر دیا گیا ہے۔
8. قرآن سے پہلے کی آسمانی کتابوں میں چونکہ انسانی کلام کی آمیزش ہو گئی ہے اس لیے ان میں بہت سی باتیں نہ صرف خلاف عقل

ہیں بلکہ غیر منصفانہ بھی ہیں۔ اس کے برعکس قرآن مجید خالص اللہ کا کلام ہے اس لیے اس میں کوئی بھی ایسی بات نہیں ہے جو عقل وانصاف کے خلاف ہو۔

قرآن مجید اور دوسری آسمانی و مذہبی کتابوں میں یہی وہ بنیادی فرق ہے جس کی وجہ سے لوگوں سے مطالبہ کیا گیا کہ وہ تصدیق تو تمام کتابوں کی کریں لیکن عمل صرف اور صرف قرآن مجید کی ہدایات پر کریں۔ کیونکہ دنیا میں انسان کو زندگی گزارنے کے لیے جن ہدایات کی ضرورت ہے وہ سب کی سب قرآن مجید میں بیان کر دی گئی ہیں۔ اس لیے کسی دوسری کتاب کی ضرورت باقی نہیں رہی۔ اب آخری اور فائنل کتاب صرف اور صرف قرآن مجید ہے۔

4.3.4 چار معلوم آسمانی کتابیں

اللہ تعالی نے انسانوں کو پیدا کر کے یوں ہی نہیں چھوڑ دیا بلکہ ان کی ضروریات کا انتظام بھی کیا۔ جس طرح اللہ تعالی نے انسانوں کی مادی ضروریات کی تکمیل کے لیے کائنات کا یہ پورا کارخانہ چلا رکھا ہے اسی طرح انسانوں کی روحانی ضروریات کی تکمیل کے لیے ہر دور اور ہر زمانے میں انسانوں میں سے ہی ایسے افراد کا انتخاب کیا جو اللہ کی مرضی اور احکامات کو ان تک پہنچائیں۔ حضرت آدم سے لے کر سیدنا حضرت محمدؐ تک انبیاء ورسل کا ایک طویل سلسلہ ہے جس نے ہر دور اور ہر زمانے میں یہ ذمہ داری پوری کی ہے۔ اللہ نے انسانوں تک اپنی مرضی کی ترسیل کے لیے صرف نبی ہی نہیں بھیجے بلکہ ان کی ایک تعداد کو کتابیں بھی دیں تا کہ ان کے بعد بھی ان کتابوں سے لوگ ہدایت حاصل کرتے رہیں۔ اللہ تعالی نے کتنی کتابیں نازل کیں ہم میں سے کسی کو اس کا علم نہیں۔ زمانے اور انسانوں کی دست برد سے جو آسمانی کتابیں موجود رہ گئی ہیں اور جن کی تصدیق آخری آسمانی کتاب قرآن مجید سے ہوتی ہے وہ چار ہیں۔

1. تورات۔ یہ کتاب حضرت موسی پر نازل ہوئی۔
2. زبور۔ مناجات اور دعاؤں کا یہ مجموعہ حضرت داؤد پر نازل ہوا۔
3. انجیل۔ یہ کتاب حضرت عیسیٰ پر نازل ہوئی۔
4. قرآن مجید۔ اللہ کی یہ آخری کتاب سیدنا حضرت محمدؐ پر نازل ہوئی۔

قرآن مجید میں ان چار کتابوں کے علاوہ حضرت ابراہیم کے صحیفوں کا بھی ذکر ہے لیکن وہ محفوظ نہیں رہے۔ بقیہ کتابیں کسی نہ کسی صورت میں باقی رہیں۔ آیندہ سطور میں ہم ان میں سے ایک ایک کا زمانی ترتیب کے اعتبار سے تعارف کرائیں گے۔ یہاں یہ ذکر بھی فائدے سے خالی نہ ہو گا کہ قرآن مجید کے علاوہ بقیہ تینوں الہامی کتابیں موجودہ بائبل یا کتاب مقدس کا حصہ ہیں۔ اس طرح بائبل ایک الہامی کتاب نہ ہو کر مختلف الہامی کتابوں کا مجموعہ ہے۔

1. تورات

موجودہ دور میں جو بائبل یا کتاب مقدس ہمیں دیکھنے یا پڑھنے کو ملتی ہے وہ کوئی ایک الہامی کتاب نہیں بلکہ مختلف (تین) الہامی کتابوں کا مجموعہ ہے، کتاب مقدس یا بائبل بنیادی طور پر دو حصوں میں تقسیم ہے ایک عہد نامہ قدیم اور دوسرا عہد نامہ جدید۔ عہد نامہ قدیم

بھی تین حصوں میں تقسیم ہے:

1. تورات (قانون وشریعت Law)　　2. صحائف انبیاء (Prophet`s books)

3. صحائف مقدسہ (Hagiographa) یا (Writings)

گویا تورات کے نام سے جو الہامی کتاب ہمارے پاس موجود ہے وہ نہ تو مکمل بائبل ہے اور نہ ہی پورا کا پورا عہد نامہ قدیم بلکہ یہ ان کا ایک حصہ ہے اور اس کے علاوہ بھی صحائف عہد نامہ قدیم کا حصہ ہیں اور یہودیوں کے نزدیک مقدس ہیں۔ البتہ تورات چونکہ عہد نامہ قدیم کا بڑا، اہم اور خاص حصہ ہے اس لیے تقدس اور اہمیت کی وجہ سے کبھی کبھی پورے عہد نامہ قدیم کے لیے بھی تورات کا لفظ استعمال کر لیا جاتا ہے۔

تورات کو حضرت موسی کی طرف منسوب کیا جاتا ہے اور قرآن مجید اس کی تصدیق کرتا ہے۔ اس کی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں انسانیت کے آغاز سے لے کر بنی اسرائیل کے زمانے تک کی تاریخ یہاں تک کہ حضرت موسی کی وفات تک کے واقعات سے بحث کی گئی ہے گویا تورات انسانی تاریخ کا حضرت موسیٰ کے زمانے تک ایک تاریخی مرقع ہے۔ البتہ اس کی خاص اہمیت یہ ہے کہ اس تاریخی سفر میں انسانی معاشرہ جن حالات سے گزرا، ان کا تذکرہ موجود ہے۔ تورات میں معاشرتی اور مذہبی قوانین بھی درج کیے گئے ہیں اور یہی چیز اسے کتاب شریعت بناتی ہے۔

تورات اصلاً پانچ حصوں یا صحیفوں پر مشتمل ہے جنہیں صحائف خمسہ یا صحائف موسی کے نام سے جانا جاتا ہے:

1. کتاب تکوین (Genesis): یہ تورات کا وہ حصہ ہے جس میں حضرت موسی کے زمانے سے پہلے کی تاریخ کا اجمالی بیان ہے۔ اس میں حضرت یعقوبؑ کی اولاد کی اہمیت نمایاں ہے اور مذہب میں اخلاق کی اہمیت کی وضاحت کی گئی ہے۔
2. کتاب خروج (Exodus): کتاب خروج تورات کا وہ حصہ ہے جس میں حضرت موسیٰؑ کی ولادت سے لے کر طور سینا تک کے واقعات کا ذکر ہے جس دوران کہ حضرت موسی بنی اسرائیل کو مصر سے نکال کر صحرائے سینا میں لے جاتے ہیں اور جہاں کہ ان سے مقدس عہد (میثاق) لیا گیا اور ان کے لیے مختلف قوانین وضع کیے گئے۔
3. کتاب لاوی (Leviticus) یہ تورات کا تیسرا حصہ ہے اور اس حصے میں خصوصیت کے ساتھ ان احکام کا ذکر ہے جو عبادات سے متعلق ہیں۔
4. کتاب اعداد (Numbers): تورات کے اس حصے میں کتاب خروج کے بعد کے واقعات کا ذکر ہے اور یہ بتایا گیا ہے کہ کس طرح بنی اسرائیل نے صحرائے سینا سے نکل کر دریائے اردن اور اس کے پار کا علاقہ فتح کیا۔ جگہ جگہ اس کتاب میں بھی احکام و قوانین درج ہیں۔
5. کتاب تثنیہ (Deuteronomy): تورات کا یہ آخری حصہ ہے۔ اس میں تاریخی پس منظر کے بیان کے ساتھ ساتھ قوانین کا ایک مجموعہ بھی پیش کیا گیا ہے۔ تورات کا یہ حصہ حضرت موسی کی وفات کے ذکر پر ختم ہوتا ہے۔

تورات کی اصل زبان عبرانی ہے، آرامی و یونانی زبانوں میں اس کے ترجمے بعد میں ہوئے۔ تورات اپنی اصل زبان میں ہے تاریخی و دیگر شواہد اس کی توثیق نہیں کرتے' بلکہ تاریخی روایات سے پتہ چلتا ہے کہ یہودیوں کے اصل مقدس صحائف (تورات و دیگر) زمانے کی دست برد سے محفوظ نہیں رہ پائے اور جو تورات آج موجود ہے وہ بعد کے زمانے میں تالیف و ترتیب پائی ہے اور اب یہ اپنی اصل شکل و صورت میں نہیں ہے بلکہ بعد کے زمانوں میں اس میں تحریف بھی ہوتی رہی ہے۔ اس کی تصدیق قرآن مجید سے بھی ہوتی ہے جس نے چودہ سو برس قبل نہ صرف یہ کہ تورات کے بارے میں یہ اعلان کیا کہ اصلاً یہ اللہ کی کتاب ہے جو حضرت موسیٰ کو دی گئی 'لیکن بعد والوں نے اس میں معنوی و دیگر تحریفات کر ڈالیں۔ اس کے کچھ حصے حذف کر دیے اور بعض حصوں کا اس میں اضافہ کر دیا۔ اس لیے آج جو تورات یہودیوں اور عیسائیوں کے پاس موجود ہے وہ اصل تورات نہیں ہے بلکہ تورات کی محرف شکل ہے۔

2. زبور

زبور کی جمع زُبُر ہے۔ زَبُرَ یَزبُرُ کے معنی ہیں لکھنا اور زبور لکھی ہوئی چیز کے لیے بھی بولا جاتا ہے۔ یعنی ایسی کتاب جو جلی خط میں اور صاف صاف واضح لکھی ہوئی ہو۔ اصطلاح میں زبور اس آسمانی کتاب کا نام ہے جو اللہ نے حضرت داؤدؑ پر نازل کی۔ اس میں حکمت کے اقوال بیان ہوئے ہیں اور شرعی احکام موجود نہیں ہیں (اس کی وجہ یہ ہے کہ شریعت حضرت داؤد کے لیے بھی وہی تھی جو حضرت موسی کو ملی تھی اور جو تورات میں ہے)۔

موجودہ زبور مناجات کی ایک کتاب ہے اور اس میں پانچ دیوان شامل ہیں۔ اس مجموعے میں حضرت داؤد کے علاوہ عبرانی زبان کے بعض دوسرے شعرا کا کلام بھی شامل ہو گیا ہے۔ اور اس طرح آج کی زبور میں الہامی اور غیر الہامی کلام باہم مخلوط ہو گیا ہے۔ قرآن مجید میں زبور کے نام سے جس کتاب کا ذکر ہے وہ صرف وہ کتاب ہے جو حضرت داؤد پر نازل ہوئی تھی۔

جس طرح تورات میں یہودیوں نے تحریف کی اسی طرح زبور بھی تحریف سے محفوظ نہیں رہی۔ اس میں بھی بہت ساری چیزیں بعد میں شامل کر دی گئیں اور بہت ساری عبارتوں کو حذف کر دیا گیا۔ نتیجہ یہ ہے کہ آج جو کتاب بائبل میں زبور کے نام سے موجود ہے وہ اصل کلام الٰہی نہ ہو کر اس کی محرف شکل ہے۔

3. انجیل

عیسائیوں کی مقدس کتاب کا نام انجیل ہے جو حضرت عیسیٰؑ پر نازل ہوئی۔ انجیل یونانی زبان کا لفظ ہے جس کا لغوی معنی بشارت اور خوش خبری ہے۔ آکسفورڈ ڈکشنری میں اس کا ایک معنی پیغامبر بھی دیا ہے۔

اور انجیل کو انجیل اس لیے کہا جاتا ہے کہ یہ بشارتوں کی کتاب ہے یعنی اس میں ایک نبی آخر الزماں کی خوش خبری دی گئی ہے۔ جو حضور نبی کریم ہو سکتے ہیں یا پھر یہ کہ حضرت عیسی کا ظہور پرانی کتابوں کی بشارتوں کے مطابق ہوا تھا۔

تورات کی طرح انجیل بھی بائبل کا ایک حصہ ہے جو عہد نامہ جدید کے بیشتر حصّوں پر مشتمل ہے۔ موجودہ دور میں عیسائیوں کے نزدیک انجیل سے مراد بنیادی طور پر وہ چار کتابیں ہیں جو حضرت عیسی کے حالات زندگی، معجزات اور تعلیمات سے متعلق مختلف وقفوں میں

لکھی گئیں اور متی، مرقس، لوقا اور یوحنا کی طرف منسوب ہیں اور اسی نسبت کی وجہ سے انجیل متی، انجیل مرقس، انجیل لوقا اور انجیل یوحنا کہلاتی ہیں۔ البتہ جس طرح کبھی کبھی پورے عہد نامہ قدیم کے لیے تورات کا لفظ بولا جاتا ہے اس طرح کبھی کبھی عہد نامہ جدید کے لیے بھی انجیل کا لفظ استعمال ہوتا ہے۔ عیسائیت کے ابتدائی دور میں بہت سی انجیلیں موجود تھیں لیکن چوتھی صدی عیسوی (325ء) میں عیسائی مذہبی رہنماؤں کی ایک کانفرنس نے ان میں سے چار انجیلوں کو معتبر قرار دے کر لے لیا اور باقی کو مسترد کر کے ترک کر دیا۔

جیسا کہ ذکر ہوا عہد نامہ جدید میں چار انجیلوں کے علاوہ بھی چیزیں شامل ہیں۔ ان کی ترتیب اس طرح ہے۔

1. اناجیل اربعہ یعنی متی، مرقس، لوقا اور یوحنا کی انجیلیں۔ 2. رسولوں کے اعمال۔

3. پولس (رسول) کے تیرہ مکتوب۔

4. عبرانیوں کے نام خط۔ جس کے لکھنے والے کا تعین نہیں ہو سکا کچھ محققین اسے پولس کا خط مانتے ہیں جب کہ دیگر محققین کے نزدیک یہ پولس کے کسی شاگرد کا خط ہے۔

5. یعقوب، پطرس، یوحنا اور یہودا کے آٹھ خطوط۔ 6. مکاشفہ یوحنا۔

موجودہ انجیل کی زبان یونانی ہے جس کے دنیا کی سیکڑوں زبانوں میں ترجمے ہو چکے ہیں لیکن یونانی حضرت عیسی کی زبان نہ تھی بلکہ ان کی زبان عبرانی، آرامی یا سریانی تھی اس لیے انجیل بھی انہیں زبانوں میں سے کسی زبان میں رہی ہو گی۔ بعد میں یونانیوں کے غلبے کے دور میں اس کا صرف یونانی ترجمہ باقی رہا اصل زبان میں انجیل ضائع ہو گئی۔

انجیل کے بارے میں خود عیسائیوں میں یہ نقطہ نظر پایا جاتا ہے کہ یہ کتاب تحریفات سے محفوظ نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ مختلف ادوار میں انجیل کی تصحیح کی کوششیں بھی ہوتی رہیں لیکن ان کوششوں نے مزید تحریفات کو جنم دیا۔ اس کے چلتے انجیل کے بارے میں عیسائی دنیا میں مختلف نقاط نظر وجود میں آئے۔ ان میں سے تین کا ہم ذکر کرتے ہیں:

1. قدامت پسند عیسائیوں کا نقطہ نظر: یہ لوگ صرف انجیل کو ہی نہیں بلکہ پوری بائبل کو خدا کا بے خطا اور غلطی سے پاک کلام مانتے ہیں۔ ان کے نزدیک عہد نامہ قدیم اور عہد نامہ جدید دونوں الہامی کتابیں ہیں۔ ان کے مضامین کے ساتھ ساتھ الفاظ بھی الہامی ہیں۔
2. انجیل کے بارے میں دوسرا نقطہ نظر ان علما کا ہے جو جدید تحقیقات کی پیروی کرنے کے ساتھ ساتھ مذہب کے بھی پابند ہیں۔ ان کے خیال میں بائبل بھی دنیا کی دوسری کتابوں کی طرح ایک کتاب ہے اور اس کا مطالعہ ذہنی تحفظات کے بغیر کیا جانا چاہیے۔ یہ انسان کے معتقدات اور کردار کی رہنمائی کے لیے ایک کتاب ہے یہ کوئی تاریخی ریکارڈ نہیں ہے۔ اس نقطہ نظر کے حاملین کے نزدیک الفاظ و واقعات کی کچھ زیادہ اہمیت نہیں ہے بلکہ اصل اہمیت اس روح کی ہے جو اس میں کارفرما ہے۔
3. انجیل کے بارے میں عیسائی دنیا میں تیسرا نقطہ نظر یہ ہے کہ انجیل اور عہد نامہ جدید کی دیگر کتابیں بھی زیادہ تر پولس (رسول) کے

خیالات کا آئینہ ہیں۔ یہ خدا یا عیسی مسیح کے الفاظ نہیں بلکہ انہیں مصنفین کی تحریریں ہیں جن کی طرف کہ یہ منسوب ہیں۔

یہ بات پایہ ثبوت کو پہنچی ہوئی ہے کہ وہ کتابیں جنہیں آج ہم انجیل کے نام سے جانتے ہیں یہ کتابیں وہ انجیل نہیں ہیں جو حضرت عیسی پر نازل ہوئی تھی۔ قرآن مجید کی رہنمائی کے مطابق انجیل سے مراد وہ کتاب اور تعلیم ہے جو اللہ تعالی نے حضرت عیسی پر نازل کی۔ یہ انجیل زمانے اور حضرت عیسی کے پیروؤں کے ہاتھوں ضائع ہو گئی۔ اس کے کچھ حصے ہی باقی رہ گئے ہیں جو عہد نامہ جدید میں ادھر اُدھر بکھرے ہوئے ہیں۔ متی، مرقس، لوقا اور یوحنا کی انجیلیں وہ کتابیں ہیں جن میں ان مصنفین نے حضرت عیسی کے حالات اور اقوال اپنے طور پر بیان کیے ہیں لہذا ان انجیلوں کو ہم وہ انجیل نہیں کہہ سکتے جو حضرت عیسی پر نازل کی گئی تھی۔

4. قرآن مجید

قرآن عربی زبان کا لفظ ہے جس کی اصل قَرَاَیَقْرَءُ ہے۔ قرآن کا لفظی معنی پڑھنا ہے البتہ عربی زبان میں مصدر کئی مرتبہ مفعول کے معنی میں بھی بولا جاتا ہے اس لیے قرآن مَقْرُوء کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے اور اس کا مطلب ہے وہ کتاب جو پڑھی جائے یا بار بار پڑھی جائے۔

اصطلاح میں قرآن سے مراد اللہ تعالی کا وہ کلام ہے جو اس نے اپنے آخری رسول حضرت محمدؐ پر نازل کیا۔ یہ مختلف سورتوں اور آیات کا مجموعہ ہے۔ اسی طرح نبی سے پہلے جو بھی رسول آئے اور جتنی بھی کتابیں نازل ہوئیں ان سب کا عطر اور خلاصہ اس کتاب میں جمع کر دیا گیا ہے۔ قرآن مجید میں عبرت کے لیے پچھلے زمانوں کے قصوں واقعات اور اہم حالات و حوادث کو مناسب انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ کیا کرنا ہے اور کیا نہیں کرنا ہے، اچھے کاموں پر اجر اور برے کاموں پر سزا کا بیان بھی ہے۔ قرآن مجید مختلف علوم و معارف کا بہترین مجموعہ ہے۔

قرآن مجید کو قرآن کے علاوہ بھی اللہ تعالی نے مختلف ناموں سے پکارا ہے۔ امام ابن جریر طبری (مشہور مفسر) کے مطابق اللہ تعالی نے قرآن مجید کے چار نام ذکر کیے ہیں۔ 1۔ القرآن 2۔ الفرقان 3۔ الکتاب 4۔ الذکر۔

قرآن مجید کو قرآن اس لیے کہا جاتا ہے کہ یہ پڑھا جاتا ہے اور آیتوں اور سورتوں کا مجموعہ ہے۔ اس میں احکام و ہدایات اور علوم و قصص کا ذکر ہے۔

قرآن مجید کو الفرقان اس لیے کہا گیا ہے کہ اس کتاب نے حق و باطل کے درمیان امتیازی لکیر کھینچ دی ہے۔

قرآن مجید کو الکتاب اس لیے کہا جاتا ہے کہ یہ لکھی ہوئی ہے اور اس کو لکھے جانے کا اہتمام کیا گیا ہے۔

قرآن مجید کو الذکر کے نام سے اس لیے یاد کیا گیا ہے کہ اس میں بندوں کے لیے یاد دہانی ہے اور انہیں نصیحتیں کی گئی ہیں۔

ان چار ناموں کے علاوہ مفسرین نے بڑی تعداد میں قرآن کے صفاتی ناموں کا بھی ذکر کیا ہے اور ان کی تعداد پچاس سے لے کر نناوے تک بیان کی ہے۔

قرآن مجید کو اللہ تعالی نے حضرت محمدؐ پر وحی کے ذریعے نازل کیا۔ پہلی وحی آپؐ کے پاس حضرت جبریلؑ غار حرا میں لے کر آئے

اس موقعے پر سورہ ”اقرأ“ کی ابتدائی پانچ آیتیں نازل ہوئیں۔ اس کے بعد نبیؐ پر وحی کا سلسلہ 23 برس تک جاری رہا اور اس دوران نبیؐ کے پاس مختلف طریقوں سے وحی آتی رہی۔ نبوت کے بعد کے ان 23 برسوں میں سے شروع کے تیرہ برس آپ نے مکّے میں گزارے۔ اس دوران جو سورتیں اور آیتیں مکے میں نازل ہوئیں انہیں مکی سورت یا آیات کہتے ہیں۔ زندگی کے آخری دس برس آپؐ کے مدینہ میں گزرے۔ مدینہ میں نازل ہونے والی آیات اور سورتوں کو مدنی کہتے ہیں۔ قرآن مجید میں کل 30 پارے، 114 سورتیں، سات منزلیں، 6218 آیتیں ہیں۔ ان میں 86 سورتیں مکی ہیں اور 28 سورتیں مدنی ہیں۔ قرآن مجید میں بہت سی سورتیں مکی ہیں لیکن ان میں مدنی آیات بھی ہیں اسی طرح مدنی سورتوں میں بھی بعض مکی آیات ہیں۔

قرآن مجید اللہ کی آخری کتاب ہے جو اللہ کے آخری رسول حضرت محمدؐ پر نازل ہوئی۔ یہ فصیح اور واضح عربی زبان میں ہے۔ کوئی بھی عربی داں اسے پڑھ اور سمجھ سکتا ہے۔ جس طرح آپؐ نے اسے پڑھا اسی طرح سن کر صحابہ کرام نے بھی پڑھا اور اپنے بعد والوں تک پہنچایا۔ اس طرح جو قرآن مجید آج ہمارے سامنے ہے وہ بالکل وہی ہے جو اللہ تعالی نے حضرت جبریل امین کے ذریعہ محمدؐ پر نازل کیا۔ اس کی ترتیب بھی وہی ہے جو آپؐ نے صحابہ کرام کے ذریعہ کتابت کروائی، انہیں یاد کرایا، خود تلاوت کی اور صحابہ کرام کو بھی تلاوت کی تلقین کی۔ آج جو قرآن مجید ہمارے سامنے موجود ہے اس کے الفاظ، حروف، آیات، سورتوں کی ترتیب اور طریقہ تلاوت بالکل وہی ہے جو حضورؐ کے زمانے میں تھا اس میں کہیں بھی کسی قسم کی ذرا بھی تبدیلی نہیں ہوئی ہے۔ کیونکہ قرآن مجید کی حفاظت کا ذمہ خود اللہ تعالی نے لیا ہے۔ ”**ان علینا جمعه و قرآنه**“ (القیامۃ: 17) (بلاشبہ اس (قرآن) کا جمع کرنا اور پڑھانا ہمارے ہی ذمہ ہے) آپؐ پر جب بھی کوئی وحی نازل ہوتی آپؐ خود اسے یاد کرتے، اپنے صحابہ کو یاد کرواتے اور صحابہ کی وہ ٹیم جو لکھنا جانتی تھی ان میں سے کسی کو بلا کر اس کی کتابت بھی کرواتے۔ اس طرح پورا قرآن مجید 23 سال میں آپؐ پر نازل ہوا اور آپؐ نے اپنی زندگی میں ہی اس کو کتابت شدہ شکل میں بھی محفوظ کرا دیا اور صحابہ کرام کے سینوں میں بھی۔ آپؐ کے بعد حضرت ابو بکرؓ کے زمانہ خلافت میں قرآن مجید کو سرکاری سطح پر جمع کیا گیا اور ایک مکمل و مستند نسخہ تیار کر دیا گیا تاکہ کسی کو بھی اگر قرآن مجید کی نقل تیار کرنی ہے تو اس مستند نسخے سے تیار کرے۔ اس طرح قرآن مجید بغیر کسی تحریف اور تبدیلی کے قیامت تک کے لیے محفوظ ہو گیا اور اب یہی انسانوں کے لیے پیغام ہدایت و رہنمائی ہے۔ ایک مسلمان کے لیے تمام آسمانی کتابوں پر اس طور پر ایمان لانا ضروری ہے کہ وہ اپنے زمانوں میں آسمانی ہدایت تھیں لیکن ان کے ماننے والوں نے ان میں تحریف کر دی اس لیے ان پر عمل نہیں کیا جائے گا اور نہ یہ تسلیم کیا جائے گا کہ یہ بعینہ وہی کتابیں ہیں جو متعلقہ انبیائے کرام پر نازل ہوئیں جب کہ قرآن مجید آخری کتاب ہدایت کے طور پر ہمیشہ کے لیے محفوظ ہے اور اب اس پر ایمان لانے کے ساتھ ساتھ اس کی ہدایات پر عمل بھی ضروری ہے۔

4.4 عقیدہ ایمان بالکتب کا اثر انسانی سماج پر

اسلام اپنے ماننے والوں کو ایک عالمی انسانی برادری کا تصور دیتا ہے۔ قرآن مجید میں اکثر خطاب ”**یا ایها الناس**“ (اے لوگو!) کے الفاظ سے ہوا ہے۔ وہ دنیا بھر کے انسانوں کو مشترکہ اقدار پر اتحاد و اتفاق کی دعوت دیتا ہے یعنی ”**تعالوا الی کلمة سواء بیننا و**

بینکم"۔ دنیا کے دیگر تمام مذاہب من و تو کی انسانی تقسیم کا شکار ہیں۔ یہودی ہوں، عیسائی ہوں، پارسی ہوں، ہندو ہوں ان سب کے ماننے والے اپنی کتاب کے علاوہ دوسری کتابوں کا یا تو انکار کرتے ہیں یا پھر ان کے بغیر بھی نجات اور سرخروئی کے متمنی ہو سکتے ہیں۔ لیکن اسلام وہ واحد مذہب ہے جس کے ماننے والوں کے لیے ضروری اور ناگزیر ہے کہ اپنی الہامی کتاب قرآن مجید پر ایمان لانے اور عمل کرنے کے ساتھ دیگر مذاہب کی الہامی کتابوں پر بھی ایمان لائیں۔ اسی طرح دیگر مذاہب میں اپنے اور غیر کی جو صرف دو تقسیمیں تھیں، جب اسلامی قانون (فقہ) کا ارتقاء ہوا تو اقوام عالم کی چار گروپوں میں قانونی تقسیم عمل میں آئی یعنی 1. مسلمان' 2. اہل کتاب' 3. شبہ اہل کتاب' اور 4. کفارو مشرکین۔ اور اس کے مطابق سب کی الگ الگ قانونی حیثیتیں متعین ہوئیں۔

1. مسلمان: جو قرآن اور دوسری الہامی کتابوں کو اللہ کی کتاب مانتے ہیں وہ مسلمان ہیں۔ ان میں کا ہر فرد دوسرے کا بھائی ہے اور ہر اچھے بھلے میں ایک دوسرے کا شریک ہے۔ ان میں آپس میں شادی بیاہ ہو سکتا ہے۔ اور وہ ایک دوسرے کا ذبیحہ کھا سکتے ہیں۔
2. اہل کتاب: جن کتابوں کا قرآن مجید میں ذکر ہوا ہے ان کے پیرو اہل کتاب کہلاتے ہیں۔ ان کا ذبیحہ مسلمان کھا سکتے ہیں اور ان کی عورتوں سے مسلمان مرد شادی بھی کر سکتے ہیں۔
3. شبہ اہل کتاب: جو قرآن اور اس میں مذکور کتابوں (تورات، زبور اور انجیل) پر تو ایمان نہیں رکھتے لیکن کسی آسمانی کتاب کے پیرو ہونے کا دعوی کرتے ہیں۔ مسلمان ان کا ذبیحہ نہیں کھا سکتے اور نہ ان کی عورتوں سے نکاح کر سکتے ہیں۔
4. کفارو مشرکین: یہ وہ لوگ ہیں جو کسی آسمانی کتاب کے حامل نہیں، نہ اس کا دعوی رکھتے ہیں۔ مسلمانوں اور ان کی شادی نہیں ہو سکتی ہے۔ اور نہ ان کا ذبح کیا ہوا جانور مسلمان کھا سکتے ہیں۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلام کی تعلیم میں انسانی سماج کے اندر امن وامان کو بنیادی اہمیت حاصل ہے۔ اسلام کا یہی وہ نظریہ تھا جس کے تحت مسلمان اپنے مذہب اور شریعت کی پابندی کرتے ہوئے اس کے اہل ہو سکے کہ دوسری قوموں کے ساتھ مشارکت کریں اور ان سے میل جول رکھیں۔ اور ایک ایسے زمانے میں جب گلوبلائزیشن کا کوئی تصور نہیں تھا ایک عالمی گاؤں میں مختلف مذاہب کے ماننے والے کیسے رہ سکتے ہیں، اس کے اصول دیے۔

4.5 اکتسابی نتائج

اس اکائی میں آپ نے درج ذیل نکات سیکھے:

- فرشتوں اور آسمانی کتابوں پر ایمان لانا ضروری ہے۔ کوئی شخص اس وقت تک مسلمان نہیں ہو سکتا جب تک کہ وہ یہ اقرار نہ کرلے کہ اللہ نے انسانی ضروریات سے عاری ایک غیر مادی مخلوق پیدا کی ہے جو اس کی اجازت اور حکم سے مختلف امور کو انجام دیتی او رہمہ وقت اس کی عبادت واطاعت میں مصروف رہتی ہے۔
- اسی طرح ایک مسلمان کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ اللہ کی بھیجی ہوئی آسمانی کتابوں پر ایمان لائے۔ مسلمان ہونے کے لیے صرف قرآن مجید پر ایمان لانا کافی نہیں ہے بلکہ اس کے ساتھ ہی اس پر بھی ایمان لانا ضروری ہے کہ اللہ تعالی انسانوں کی ہدایت

کے لیے ہر زمانے اور ہر علاقے میں اپنی ہدایت بھیجی۔ قرآن مجید اللہ کی آخری الہامی کتاب ہے جو حضرت محمدؐ پر نازل ہوئی۔ یہ کتاب پوری طرح محفوظ ہے۔

4.6 نمونہ امتحانی سوالات

4.6.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات

1. فرشتہ کس زبان کا لفظ ہے“؟

(a). فارسی (b). ہندی (c). عربی (d). یونانی

2. اللہ کے حکم سے پیغمبروں کے پاس وحی کون لاتے تھے؟

(a). حضرت جبریلؑ (b). حضرت میکائیلؑ (c). حضرت اسرافیلؑ (d). حضرت عزرائیلؑ

3. مخلوقات کو روزی پہنچانے کے کام پر کون مامور ہے؟

(a). حضرت میکائیلؑ (b). حضرت جبریلؑ (c). حضرت اسرافیلؑ (d). حضرت عزرائیلؑ

4. دنیا کے خاتمے پر کس فرشتے کو اللہ نے مامور کیا ہے؟

(a). حضرت اسرافیلؑ (b). حضرت میکائیلؑ (c). حضرت جبریلؑ (d). حضرت عزرائیلؑ

5. اللہ کی طرف سے مخلوقات کی جان نکالنے پر کون مامور ہے؟

(a). حضرت عزرائیلؑ (b). حضرت میکائیلؑ (c). حضرت جبریلؑ (d). حضرت اسرافیلؑ

6. اللہ کی آخری کتاب کون سی ہے؟

(a). تورات (b). زبور (c). انجیل (d). قرآن

7. تورات کس پر نازل ہوئی؟

(a). حضرت موسیٰؑ (b). حضرت نوحؑ (c). حضرت عیسیٰؑ (d). حضرت داؤد

8. تورات اصلاً کس زبان میں نازل ہوئی؟

(a). عبرانی (b). عربی (c). فارسی (d). انگریزی

9. حضرت داؤدؑ پر کون سی کتاب نازل ہوئی؟

(a). زبور (b). تورات (c). انجیل (d). قرآن

10. کراماً کاتبین کس کام پر مامور ہیں؟

(a). اعمال کا ریکارڈ رکھنے پر (b). دنیا کے خاتمے پر (c). جان نکالنے پر (d). روزی پہنچانے پر

4.6.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات

1. اسلامی تعلیمات کی روشنی میں فرشتوں کی حقیقت بیان کیجیے۔
2. مشہور فرشتوں پر ایک مضمون لکھیے۔
3. کتاب الٰہی پر ایمان لانے کی اہمیت اور ضرورت بیان کیجیے۔
4. دو مشہور آسمانی کتابوں کا مختصر تعارف کرائیے۔
5. فرشتے کے معنی و مفہوم پر روشنی ڈالیے۔

4.6.3 طویل جوابات کے حامل سوالات

1. دنیا کے مختلف مذاہب میں فرشتوں کے تصور پر روشنی ڈالیے۔
2. قرآن مجید اور دوسری آسمانی کتابوں کی حیثیت میں فرق بیان کیجیے۔
3. انجیل کی بابت اپنی معلومات قلم بند کیجیے۔

4.7 تجویز کردہ اکتسابی مواد

---

1. عقیدہ اسلامی : علامہ محمد غزالی / محمد عنایت اللہ اسد سبحانی
2. دینیات : مولانا سید ابوالاعلی مودودی
3. اسلام ایک نظر میں : مولانا صدر الدین اصلاحی
4. اسلامی تعلیمات : مولانا محمد سلیمان فرخ آبادی
5. اسلامی عقائد : علامہ عفیف عبد الفتاح طباہر / ڈاکٹر عبید اللہ فہد فلاحی
6. سیرۃ النبی (جلد چہارم) : علامہ سید سلیمان ندوی

اکائی 5: تقدیر

اکائی کے اجزا:

5.0 تمہید
5.1 مقاصد
5.2 تقدیر: معنی و مفہوم
5.3 قرآن میں تقدیر کا بیان
5.4 تقدیر کی بابت اسلام کا موقف
5.5 تقدیر کے بارے میں مختلف نقاط نظر کا خلاصہ
5.6 عقیدہ تقدیر کا اثر انسانی زندگی پر
5.7 کلیدی الفاظ
5.8 اکتسابی نتائج
5.9 نمونہ امتحانی سوالات
  5.9.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات
  5.9.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات
  5.9.3 طویل جوابات کے حامل سوالات
5.10 تجویز کردہ اکتسابی مواد

5.0 تمہید

تقدیر کا عقیدہ ایمانیات و عقائد کے باب میں شامل ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کو پیدا کیا، اس کا خالق ہونے کے ناطے اللہ کو اس کی زندگی پر ہر طرح کا اختیار و اقتدار حاصل ہے لیکن اس کے ساتھ ہی اللہ تعالیٰ نے انسان کو ایک ذمہ دار مخلوق بھی بنایا اور اس ذمہ داری کی وجہ سے اسے ارادہ و اختیار کی آزادی بھی دی ہے۔ ارادہ و اختیار کی یہی آزادی ہے جو انسان کو ذمہ دار بنانے کے ساتھ ساتھ اسے اپنے اعمال کے

لیے جزاء سزا کا مستحق بھی ٹھہراتی ہے۔ تقدیر یہ ہے کہ کائنات میں اب تک جو کچھ ہوا، جو کچھ ہو رہا ہے اور آئندہ جو کچھ بھی ہونے والا ہے وہ سب کچھ نہ صرف یہ کہ اللہ رب العزت کے علم میں ہے بلکہ اس کے فیصلے کے مطابق ہوا، ہوتا ہے اور ہوگا۔ اللہ تعالیٰ کے بارے میں ہم جانتے ہیں اور عقیدہ توحید کے باب میں اسے ہم اچھی طرح سمجھ بھی چکے ہیں کہ اللہ نے کائنات کو صرف پیدا ہی نہیں کیا بلکہ وہ اس کائنات کا مدبر اور منتظم بھی ہے۔ اس نے اپنے علم غیب سے ہر کام کے ہونے کی جگہ اور وقت کا تعین کر رکھا ہے۔ دنیا کے تمام کام اس کے علم اور فیصلے کے مطابق ہوتے ہیں، اس نے جہاں ایک طرف انسان کو بہت سے معاملوں میں مجبور بنایا اور پیدا کیا وہیں اس نے اسے بہت ساری آزادیاں بھی دی ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ انسان اپنی ذمّے داری کے دائرے میں رہتے ہوئے آزاد ہے اور اپنے خالق و مالک کی فرماں بردار اس وسیع کائنات کا حصہ ہوتے ہوئے اس کا غلام بھی ہے۔

5.1 مقاصد

تقدیر پر ایمان لانا اسلام کے بنیادی عقائد میں شامل ہے۔ قرآن مجید میں اور اللہ کے رسولؐ کی حدیثوں میں اس عقیدے کا ذکر بار بار ہوا ہے۔ کوئی بھی شخص اس وقت تک مسلمان نہیں ہو سکتا جب تک کہ وہ منجملہ دیگر بنیادی عقائد کے تقدیر کے عقیدے پر بھی ایمان نہ لائے۔ یہی وجہ ہے کہ جب بھی اور جہاں کہیں بھی اسلام کے بنیادی عقائد کا ذکر ہوتا ہے تقدیر کے عقیدے کا ذکر بھی ضرور ہوتا ہے۔ اسلامی عقائد سے متعلق اس اکائی میں ہماری کوشش ہوگی کہ سب سے پہلے تقدیر کا معنی و مفہوم بیان کیا جائے۔ اس کے بعد عقیدہ تقدیر کی اہمیت اور ضرورت کا مختصراً ذکر ہوگا۔ بعد ازاں قرآن میں تقدیر کے بیانات کا ذکر کرتے ہوئے اسلام کے تقدیر کے بارے میں موقف کو بیان کیا جائے گا۔ اکائی کے آخر میں یہ بھی بتانے کی کوشش کی جائے گی کہ عقیدہ تقدیر کے کیا اثرات انسانی زندگی پر مرتب ہوتے ہیں۔

5.2 تقدیر: معنی و مفہوم

قرآن مجید میں تقدیر کے عقیدے کے لیے دو لفظ استعمال ہوئے ہیں۔

پہلا لفظ قدر ہے إِنَّا كُلَّ شَيْءٍ خَلَقْنَاهُ بِقَدَرٍ (القمر:49)

(ہم نے ہر چیز کو اندازہ سے پیدا کیا)۔

دوسرا لفظ قضا کا استعمال کیا ہے۔ هُوَ الَّذِي خَلَقَكُم مِّن طِينٍ ثُمَّ قَضَىٰ أَجَلًا (الانعام:2)

(وہی ہے جس نے تم کو مٹی سے پیدا کیا پھر ایک وقت کا فیصلہ کیا۔)

قدر کا لغوی معنی اندازہ کرنا ہے اور اس کی دلالت مذکورہ بالا آیت میں موجود ہے۔ قضا کا لغوی معنی فیصلہ کرنا اور حکم دینا ہے۔ اس کی دلیل بھی سورہ انعام کی مذکورہ آیت میں موجود ہے۔

قضا و قدر کے الفاظ جب ایک اسلامی اصطلاح کے طور پر استعمال ہوتے ہیں تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ کائنات کو وجود بخشنے سے پہلے ہی اللہ تعالیٰ نے کائنات کی ہر چیز کے بارے میں اپنے اندازے اور تقدیر سے ہر ایک چیز کا ایک فیصلہ کر کے اسے متعین کر دیا ہے۔ اللہ

تعالیٰ کے اسی فیصلے اور تعین کے مطابق کائنات کا پورا کارخانہ جاری و ساری ہے۔ اس میں کہیں بھی ذرا سی بھی تبدیلی اور تغیر کا امکان نہیں۔ اللہ تعالیٰ نے جن چیزوں کے لیے بھی جو اصول متعین فرما دیے ہیں وہ انہیں اصولوں کے مطابق مکمل فرض شناسی کے ساتھ اپنی اپنی ذمہ داریاں ادا کر رہی ہیں۔ سورج، چاند، ستارے، سیارے، زمین، آسمان، فنا و بقا غرض تمام چیزیں اللہ کے متعین کردہ اصولوں کے مطابق اپنے اپنے فرائض ادا کرنے میں مشغول ہیں۔ گویا لوگ جسے عام طور پر قانونِ قدرت کہتے ہیں فی الواقع وہی تقدیر الٰہی ہے اور اس تقدیر الٰہی سے کوئی بھی چیز ہٹتی نہیں ہے۔ چونکہ اللہ تعالیٰ عالم الغیب ہے اس لیے اگلی پچھلی کوئی بھی چیز اس کے علم سے پوشیدہ نہیں۔ اسے ایک مثال سے ہم یوں سمجھ سکتے ہیں کہ طالب علموں کی ایک کلاس ہے جسے ایک ماہر استاد پڑھاتا ہے۔ کلاس میں ہر طرح کے طالب علم ہوتے ہیں کچھ بہت زیادہ پڑھنے والے کچھ اوسط درجے کے پڑھنے والے اور کچھ کھیلنے کودنے والے، استاد اپنے تجربے سے چند ہی کلاسوں کے بعد یہ جان لیتا ہے کہ کون سا طالب علم کیسا ہے؟ اب اگر وہ اپنے علم اور تجربے کی روشنی میں کسی طالب علم کے بارے میں یہ کہتا ہے یا کسی ڈائری میں یہ لکھ دیتا ہے کہ کلاس کا فلاں طالب علم سالانہ امتحان میں کامیاب ہو گا اور فلاں طالب علم ناکام ہو جائے گا۔ سالانہ امتحان ہوتا ہے اور نتائج آتے ہیں تو بعینہٖ وہی ہوتا ہے جو استاد نے کہا تھا۔ اس کا یہ مطلب کوئی نہیں نکلتا کہ طالب علموں کو کامیابی یا ناکامی استاد کے کہنے یا لکھنے کی وجہ سے ملی بلکہ کامیاب ہونے والا طالب علم اس لیے کامیاب ہوا کہ اس نے اپنی پڑھائی پر توجہ دی اور ناکام ہونے والا طالب علم اس لیے ناکام ہوا کہ وہ پڑھائی پر توجہ دینے کے بجائے پورا سال کھیل کود اور تفریح میں ضائع کرتا رہا۔ ایسا ہی معاملہ انسانوں کے حوالے سے اللہ کی تقدیر کا ہے اللہ تعالیٰ جو کہ عالم الغیب ہے اس نے اپنے علم غیب کی بنیاد پر لکھ دیا ہے کہ کون سا انسان اپنی آئندہ زندگی میں کیا کرنے والا ہے۔

5.3 قرآن میں تقدیر کا بیان

تقدیر کے باب میں قرآن مجید کی آیات کا ذکر کرنے سے پہلے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ چند جملوں میں تقدیر کی حدود کو بیان کر دیا جائے کیونکہ تقدیر کے مسئلے کو لے کر مشکل اسی وقت پیش آتی ہے جب ہم ان حدود کے تعین میں ناکام ہو جاتے ہیں اور اسی وجہ سے قرآنی آیات کو سمجھنے میں بھی دشواری پیش آتی ہے۔

جب ہم کائنات کے کارخانے اور انسانی زندگی کے واقعات و حادثات پر نظر ڈالتے ہیں تو ہمیں اس میں تقدیر کی دو بہت ہی واضح صورتیں نظر آتی ہیں۔ جب ہم اس پر غور کرتے ہیں تو یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ تقدیر کی یہ دونوں صورتیں اپنی حدود اور دائروں میں تو الگ الگ ہیں ہی احکام و نتائج کے لحاظ سے بھی ان میں واضح فرق ہے۔

تقدیر کی ایک صورت تو وہ ہے جس میں انسان ہی نہیں پوری کائنات اللہ کی مرضی اور قدرت کے سامنے مجبور ہے۔ اس صورت میں جو کچھ بھی پیش آتا ہے وہ صرف اور صرف اللہ کی مرضی اور قدرت کا کرشمہ ہوتا ہے انسان کی پسند و ناپسند اور ارادہ و اختیار کو اس میں کسی طرح کا کوئی دخل نہیں ہوتا۔ اسے مثال کے ذریعے ہم یوں سمجھ سکتے ہیں کہ ایک انسان کا قد و قامت کیسا ہے؟ اسے عقل اور ذہانت کس درجے کی ملی ہے؟ وہ خوب صورت ہے یا بد صورت؟ وہ خوش حال گھرانے میں پیدا ہوتا ہے یا تنگ حالی سے دوچار خاندان میں؟ صحت مند

ہے یا بیمار یا اس طرح کی اور بھی بہت سی چیزیں ہو سکتی ہیں جن کے بارے میں ہم خود فیصلہ کر سکتے ہیں کہ ان معاملات میں انسان مجبور ہے، اس کا ارادہ و اختیار ان میں شامل نہیں ہوتا۔ یہ انسان کی وہ تقدیر ہے جو پورے طور پر اللہ کے ہاتھ میں ہے وہ جیسے چاہتا ہے اسے بناتا اور بگاڑتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ تقدیر کی اس صورت میں انسان سے کسی طرح کا نہ تو مواخذہ ہوگا اور نہ ہی حساب و کتاب یا جزا و سزا کا اس سے کوئی تعلق ہے، یعنی انسان سے یہ نہیں پوچھا جائے گا کہ وہ کسی خاندان میں کیوں پیدا ہوا یا اس کا قد چھوٹا یا بڑا کیوں ہے وغیرہ۔ یہ وہ معاملات ہیں جن کا فیصلہ اللہ تعالیٰ کر چکا ہے اور ایک مومن کی شان یہ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے ان فیصلوں کو خوش دلی کے ساتھ تسلیم کرتا ہے اور ان چکروں میں نہ پڑتے ہوئے اپنی مفوضہ ذمہ داریاں ادا کرتا ہے۔

تقدیر کی دوسری صورت وہ ہے جس کا تعلق انسان کی شعوری اور عملی زندگی سے ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کو تقدیر کے اس شعبے میں مکمل آزادی دے رکھی ہے۔ مثال کے طور پر عقل و شعور بے دار ہو جانے کے بعد انسان کیا کرے اور کیا نہ کرے، اس بارے میں اللہ تعالیٰ نے اسے پوری آزادی دی ہے۔ ہر انسان ارادہ و عمل کی اس آزادی کو خود محسوس کر سکتا ہے۔ اس کی مزید وضاحت یوں ہو سکتی ہے کہ انسان ہدایت کے راستے پر چلے یا گمراہی کا راستہ اختیار کرے، یا اسی طرح اچھے کام کرے یا غلط کاموں میں پڑا رہے، اس کا فیصلہ انسان کو خود کرنا ہوتا ہے اور چونکہ انسان یہاں پر فیصلوں کے کرنے میں اور اپنے ارادہ و اختیار میں آزاد ہے اسی لیے اللہ تعالیٰ ان معاملات میں یعنی انسانی اعمال میں جن میں کہ انسان کو ارادہ و اختیار کی آزادی ملی ہوئی ہے، انسان سے نہ صرف سوال جواب کرے گا بلکہ ان اعمال کا حساب کتاب کر کے اچھا یا برا بدلہ بھی دے گا۔ مسئلہ تقدیر کی اسی صورت میں پیش آتا ہے جب لوگ یہ سوال کرتے ہیں کہ ہمارے تمام اعمال اللہ کے علم میں ہیں اور نوشتۂ الٰہی میں لکھے ہوئے ہیں تو پھر ارادہ و عمل کی آزادی کیا معنی رکھتی ہے؟ حالانکہ یہ کوئی پیچیدہ مسئلہ نہیں ہے اگر ہم اللہ تعالیٰ کو عالم الغیب جانتے ہیں تو پھر ارادہ و عمل کی آزادی اور ہمارے اعمال کے نوشتۂ تقدیر میں لکھے ہونے میں کوئی تضاد باقی نہیں رہ جاتا۔ اسے ایک مثال کے ذریعے یوں سمجھا جا سکتا ہے۔

ایک صاف شفاف آئینہ ہے۔ اس کے سامنے جو بھی چیز لائی جائے گی، اس کا عکس ویسا ہی آئینے میں نظر آئے گا۔ اگر چیز خوبصورت ہے تو آئینے میں بھی وہ چیز خوبصورت نظر آئے گی اور اگر بدصورت ہے تو آئینے میں بھی بدصورت ہی نظر آئے گی آئینہ اس کی خوبصورتی یا بدصورتی کو بدل نہیں سکتا۔ نوشتۂ تقدیر یا علم الٰہی کی مثال بھی ایک آئینے کی سی ہے جس میں کہ اعمال کا صحیح عکس موجود ہے۔ تقدیر الٰہی کا آئینہ انسانی عمل کو ویسا ہی دکھاتا ہے جیسا کہ فی الواقع وہ ہوتا ہے۔ وہ اپنی جانب سے کچھ نہیں کرتا۔ بس اس آئینے کی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں اگلے پچھلے - یعنی ماضی، حال اور مستقبل کے تمام عکس محفوظ ہیں اور دکھائی دیتے ہیں اور ایسا اس وجہ سے ہے کہ اللہ کا علم زمان و مکان کی تمام حدود کو محیط ہے۔ وہاں نہ کوئی ماضی ہے نہ حال نہ مستقبل، سب کچھ اس کے علم میں ہے۔

اب ہم تقدیر کی دونوں صورتوں سے متعلق آیات و احادیث کو الگ الگ نقل کرتے ہیں:

إِنَّ اللّٰهَ لاَ يَخْفَىٰ عَلَيْهِ شَيْءٌ فِي الأَرْضِ وَلاَ فِي السَّمَاءِ هُوَ الَّذِي يُصَوِّرُكُمْ فِي الأَرْحَامِ كَيْفَ يَشَاءُ لاَ إِلَٰهَ إِلاَّ هُوَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ (آل عمران:6-5)

ترجمہ: زمین و آسمان کی کوئی چیز اللہ سے پوشیدہ نہیں ہے۔ وہی تو ہے جو رحم مادر میں جس طرح چاہتا ہے تمہاری صورت گری کرتا ہے، اس کے علاوہ کوئی معبود نہیں۔ وہ زبردست اور حکمت والا ہے"۔

وَرَبُّکَ یَخْلُقُ مَا یَشَاءُ وَیَخْتَارُ مَا کَانَ لَهُمُ الْخِیَرَةُ سُبْحَانَ اللّٰہِ وَتَعَالَی عَمَّا یُشْرِکُونَ وَرَبُّکَ یَعْلَمُ مَا تُکِنُّ صُدُورُهُمْ وَمَا یُعْلِنُونَ وَهُوَ اللّٰہُ لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ لَهُ الْحَمْدُ فِیْ الْأُولَی وَالْآخِرَةِ وَلَهُ الْحُکْمُ وَإِلَیْهِ تُرْجَعُونَ (القصص: 68-70)

ترجمہ: تیرا رب پیدا کرتا ہے جو کچھ چاہتا ہے اور جسے چاہتا ہے وہ منتخب کرتا ہے۔ ان لوگوں کو کچھ بھی اختیار نہیں حاصل۔ اللہ تعالیٰ پاک ہے اور بہت بلند ہے اس شرک سے جسے یہ کرتے ہیں۔ اور تیرا رب جانتا ہے جو کچھ ان کے سینے چھپائے ہوئے ہیں اور جو کچھ یہ علانیہ کرتے ہیں۔ وہی حقیقی معبود ہے، اس کے علاوہ کوئی معبود نہیں۔ ساری تعریف اسی کے لیے ہے اس دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی اور فرماں روائی اسی کی ہے اور اسی کی طرف تمہیں پلٹنا ہے۔

وَمَا تَحْمِلُ مِنْ أُنثَی وَلَا تَضَعُ إِلَّا بِعِلْمِهِ وَمَا یُعَمَّرُ مِن مُّعَمَّرٍ وَلَا یُنقَصُ مِنْ عُمُرِهِ إِلَّا فِیْ کِتَابٍ إِنَّ ذَلِکَ عَلَی اللّٰہِ یَسِیْرٌ (اَلفاطر: 11)

ترجمہ: اور کوئی عورت حمل میں نہیں رکھتی اور نہ جنتی ہے لیکن خدا کے علم سے، اور نہ کسی دراز عمر کو عمر کی درازی ملتی ہے یا اس کی عمر کم کی جاتی ہے لیکن وہ کتاب میں ہے، بے شک یہ اللہ پر آسان ہے۔

مَا أَصَابَ مِن مُّصِیْبَةٍ فِیْ الْأَرْضِ وَلَا فِیْ أَنفُسِکُمْ إِلَّا فِیْ کِتَابٍ مِّن قَبْلِ أَن نَّبْرَأَهَا إِنَّ ذَلِکَ عَلَی اللّٰہِ یَسِیْرٌ لِکَیْلَا تَأْسَوْا عَلَی مَا فَاتَکُمْ وَلَا تَفْرَحُوا بِمَا آتَاکُمْ وَاللّٰہُ لَا یُحِبُّ کُلَّ مُخْتَالٍ فَخُورٍ (الحدید: 22-23)

ترجمہ: کوئی مصیبت نہیں آتی زمین میں اور نہ خود تم (زمین کے بسنے والوں) میں مگر یہ کہ وہ ایک کتاب (الٰہی) میں اپنی پیدائش سے پہلے درج ہوتی ہے۔ یہ اللہ پر آسان ہے۔ ایسا اس لیے کیا گیا تاکہ تم اس پر جو تم سے جاتا رہے غم نہ کھایا کرو اور جو تم کو (اللہ) دے اس پر اترایا نہ کرو اور اللہ کسی اترانے والے بڑائی مارنے والے کو پسند نہیں کرتا۔

لَّن یُصِیْبَنَا إِلاَّ مَا کَتَبَ اللّٰہُ لَنَا هُوَ مَوْلاَنَا وَعَلَی اللّٰہِ فَلْیَتَوَکَّلِ الْمُؤْمِنُونَ (التوبہ: 51)

ترجمہ: ہم پر کوئی آفت آ ہی نہیں سکتی لیکن جو خدا نے ہمارے لیے لکھ دیا ہے، وہ ہمارا آقا ہے اور ایمان والوں کو اللہ ہی پر بھروسہ کرنا چاہئے۔

قرآن مجید کی یہ آیات تقدیر کی پہلی صورت کی وضاحت کرتی ہیں جن میں انسان مجبور ہے اور جو کچھ ہوتا ہے وہ اللہ کی مرضی اور فیصلے کے مطابق ہوتا ہے۔ آگے قرآن مجید کی ایسی آیات بیان کی جارہی ہیں جن کا تعلق تقدیر کی دوسری صورت سے ہے یعنی انسان کو ارادہ و اختیار کی آزادی حاصل ہے۔

وَقُلِ الْحَقُّ مِن رَّبِّكُمْ فَمَن شَاء فَلْيُؤْمِن وَمَن شَاء فَلْيَكْفُرْ (الکہف:29)

ترجمہ: کہہ دو! یہ حق آیا ہے تمہارے رب کی طرف سے تو جس کا جی چاہے مانے، جس کا جی چاہے نہ مانے۔

قُلْ يَا أَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَاءكُمُ الْحَقُّ مِن رَّبِّكُمْ فَمَنِ اهْتَدَى فَإِنَّمَا يَهْتَدِي لِنَفْسِهِ وَمَن ضَلَّ فَإِنَّمَا يَضِلُّ عَلَيْهَا وَمَا أَنَاْ عَلَيْكُم بِوَكِيلٍ (یونس:108)

ترجمہ: کہہ دو اے لوگو! تمہارے پاس حق آیا ہے تمہارے رب کی طرف سے تو جو ہدایت کی راہ اختیار کرے گا تو اپنے آپ کو ہدات یاب کرے گا۔ (یعنی اس کا ثمرہ اسی کو ملے گا) اور جو گمراہی اختیار کرے گا تو اس گمراہی کا وبال اسی کے اوپر ہو گا اور میں تمہارے اوپر کوئی حوالہ دار نہیں ہوں۔

عِلْمُهَا عِندَ رَبِّي فِي كِتَابٍ لَّا يَضِلُّ رَبِّي وَلَا يَنسَى (طٰہٰ:52)

ترجمہ: ان کے سلسلے کی معلومات میرے رب کے پاس ایک نوشتے میں ہیں۔ میرا رب نہ چوکتا ہے نہ بھولتا ہے۔

وَأَن لَّيْسَ لِلْإِنسَانِ إِلَّا مَا سَعَى وَأَنَّ سَعْيَهُ سَوْفَ يُرَى (النجم:39-40)

ترجمہ: اور انسان کے لیے نہیں ہے لیکن وہی جس کی اس نے کوشش کی اور بے شک اس کی کوشش (خدا کے حضور) دیکھی جائے گی۔

قرآن مجید کی یہ وہ آیات ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ انسان اپنے ارادہ و عمل میں پوری طرح آزاد ہے۔ اور ان کو سمجھنا آسان بھی ہے۔ البتہ مشکل وہاں پیش آتی ہے جہاں قرآن مجید میں انسان کی ہدایت و گمراہی کو اللہ تعالیٰ کی جانب منسوب کیا گیا ہے لیکن یہ غلط فہمی اس لیے پیش آتی ہے کہ لوگ کسی ایک آیت یا اس کے کسی ایک حصے کو پکڑ لیتے ہیں۔ نہ زبان کا اسلوب پیش نظر ہوتا ہے اور نہ ان آیات کو دیگر آیات کے وسیع تر تناظر میں دیکھنے اور سمجھنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ ذیل میں ہم ایسی چند آیتوں کو ذکر کر کے ان کا صحیح تناظر اور مفہوم جاننے کی کوشش کریں گے۔

قرآن مجید میں متعدد ایسی آیتیں ہیں جن میں ہدایت یا گمراہی کو اللہ تعالیٰ کی جانب منسوب کیا گیا ہے مثلاً کہیں کہا گیا کہ **یضل من یشاء** (وہ (اللہ) جسے چاہتا ہے گمراہ کر دیتا ہے) اور کہیں یہ کہا گیا: **یھدی من یشاء** (وہ (اللہ) جسے چاہتا ہے ہدایت دیتا ہے) اگر ہم ان آیتوں کو قرآن مجید کی دیگر آیتوں کی روشنی میں پڑھیں تو پتہ چلتا ہے کہ آیتوں کا مفہوم وہ نہیں ہے۔ جو ظاہر الفاظ کو دیکھ کر سامنے آتا ہے۔ اصل معنی و مفہوم کی تعیین اس طرح کی تمام آیات کو سامنے رکھ کر ہوتی ہے۔ مثال کے طور پر جب گمراہی کی نسبت اللہ کی طرف کی جاتی ہے یعنی یہ کہا جاتا ہے کہ اللہ نے گمراہ کر دیا تو اصلاً گمراہ کرنے والی ذات اللہ کی نہیں ہوتی بلکہ وہ شخص خود گمراہی کو پسند کرتا ہے اس لیے اللہ تعالیٰ بھی اس کے لیے وہ راستہ ہموار کر دیتا ہے۔ قرآن مجید کی سورہ صف میں اس کی وضاحت موجود ہے:

فَلَمَّا زَاغُوا أَزَاغَ اللَّهُ قُلُوبَهُمْ وَاللَّهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْفَاسِقِينَ (الصف:5)

ترجمہ: توجب انہوں نے کجی اختیار کی، اللہ نے ان کے دلوں کو کج کر دیا۔ اللہ تعالیٰ فاسق لوگوں کو ہدایت نہیں دیا کرتا۔

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے بہت واضح بیان کر دیا ہے کہ گمراہی انسان خود اختیار کرتا ہے اللہ تعالیٰ اسے زبردستی ہدایت نہیں دیتا اس کے لیے وہی راستہ آسان کر دیتا ہے جسے کہ وہ پسند کرتا ہے اور جس پر کہ وہ چلنا چاہتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اس کے ارادہ و اختیار کی آزادی میں کہیں حائل نہیں ہوتا۔

ایک دوسری آیت میں انسان کے ارادہ و اختیار کی آزادی کو اس طرح بیان کیا گیا ہے:

وَمَن يُشَاقِقِ الرَّسُولَ مِن بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُ الْهُدَى وَيَتَّبِعْ غَيْرَ سَبِيْلِ الْمُؤْمِنِيْنَ نُوَلِّهِ مَا تَوَلَّى وَنُصْلِهِ جَهَنَّمَ وَسَاءتْ مَصِيْراً (النساء:115)

ترجمہ: اور جو رسول کی مخالفت کرے گا جب کہ ہدایت بالکل واضح ہو چکی اور مومنین کے راستے سے ہٹ کر کوئی اور راستہ اختیار کرے گا تو جو چیز اس نے اپنے لیے پسند کی ہو گی اس چیز سے ہم اسے ہمکنار کریں گے اور اسے جہنم میں جھونک دیں گے اور وہ کتنا برا ٹھکانہ ہے۔

اللہ تعالیٰ گمراہ کسے کرتا ہے اس کی وضاحت اس آیت میں کھول کر کر دی ہے:

وَمَا يُضِلُّ بِهِ إِلاَّ الْفَاسِقِيْنَ الَّذِيْنَ يَنقُضُونَ عَهْدَ اللَّهِ مِن بَعْدِ مِيْثَاقِهِ (البقرہ:26-27)

ترجمہ: اور اس سے گمراہ نہیں کرتا ہے مگر فاسقوں کو جو اللہ کا عہد توڑتے ہیں اسے باندھنے کے بعد۔

اسی طرح ہدایت بھی اللہ تعالیٰ اُسی کو دیتا ہے جو ہدایت حاصل کرنا چاہتا ہے اور اس میں اصل اہمیت انسانی ارادے کو حاصل ہے ، مثلاً اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

قُلْ إِنَّ اللّهَ يُضِلُّ مَن يَشَاءُ وَيَهْدِيْ إِلَيْهِ مَنْ أَنَابَ الَّذِيْنَ آمَنُواْ وَتَطْمَئِنُّ قُلُوبُهُم بِذِكْرِ اللّهِ أَلاَ بِذِكْرِ اللّهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوبُ (الرعد:27-28)

ترجمہ: کہہ دو! اللہ گمراہ کر دیتا ہے جسے چاہتا ہے اور ہدایت دیتا ہے اسے جو اس کی طرف آتا ہے 'وہ لوگ جو ایمان لائے اور یادِ الٰہی سے انہیں قرار ملتا ہے، سن لو! یادِ الٰہی سے ہی دلوں کو قرار ملتا ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ اللہ ہدایت دیتا ہے مگر اس کو جو ہدایت حاصل کرنا چاہتا ہے اور اس کے لیے کوشش بھی کرتا ہے۔ اب سوال یہ رہ جاتا ہے کہ انسان کے عمل اور اللہ تعالیٰ کی توفیق و ہدایت کی حدود کیا ہیں تو اسے اس بچے کی مثال سے سمجھا جاسکتا ہے جو اپنی پیدائش کے ابتدائی دنوں میں نہ بولنا جانتا ہے نہ چلنا جانتا ہے۔ پہلے وہ بچہ چلنے اور بولنے کی کوشش خود کرتا ہے تو اس کے والدین اسے چلنا اور بولنا سکھاتے ہیں۔ بچہ ہاتھ پاؤں مارتا ہے والدین اس کی مدد کر کے چلنا سکھا دیتے ہیں۔ بچہ زبان ہلاتا ہے، اس کے منھ سے بے معنی آوازیں نکلتی ہیں والدین اسے بامعنی الفاظ سکھاتے ہیں اور اس طرح دونوں کی کوششیں مل کر بار آور ہوتی ہیں۔ اللہ کی تقدیر اور انسان کے عمل کا

معاملہ بھی کچھ ایسا ہی ہے۔ انسان عمل کا ارادہ کرتا ہے تقدیر الٰہی اس کے لیے راستے ہموار کرتی ہے۔

5.4 تقدیر کی بابت اسلام کا موقف

تقدیر کے بارے میں اسلام کے موقف کو جاننے اور سمجھنے سے پہلے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس باب میں دنیا کی دیگر مذہبی روایتیں کیا کہتی ہیں اسے بھی جان لیا جائے۔ کیونکہ تقدیر کا عقیدہ صرف اسلام کے ساتھ خاص نہیں ہے۔ یہ عقیدہ دنیا کے دوسرے مذاہب اور روایتوں میں بھی موجود تھا، اسلام کا امتیاز یہ ہے کہ اس نے دوسری روایتوں کے اس مبہم اور موہوم عقیدہ تقدیر کو واضح اور مبرہن کر کے مکمل کر دیا۔ یہودیوں کی مقدس کتاب تورات میں جہاں آدمؑ، شیطان اور ہابیل و قابیل کے قصے بیان ہوئے ہیں، ان قصوں میں عقیدہ تقدیر کے اشارات موجود ہیں۔ اسی طرح حضرت یوسفؑ کے خواب میں بھی اس حقیقت کی تعبیر پائی جاتی ہے۔ آسمانی کتاب زبور میں بھی تقدیر کی تعلیم موجود ہے‘ مثلاً زبور کا ایک ترانہ حمد اس طرح شروع ہوتا ہے:

”۔۔۔ خداوند کے نام کی ستائش کریں کہ اس (خدا) نے حکم دیا اور وہ (مخلوقات) موجود ہو گئے۔ اس نے ان کو پائیداری بخشی۔ اس نے ایک تقدیر مقرر کی جو ٹل نہیں سکتی۔“

عیسائیوں کی مذہبی کتاب انجیل میں بھی تقدیر کی تعلیم ”خدا کی مرضی“ کے عنوان سے موجود ہے مثلاً عیسائیوں کے عقیدے کے مطابق حضرت عیسیٰؑ اپنی زندگی کی آخری رات میں جو دعا فرماتے ہیں اس کا ایک ٹکڑا یہ ہے:

”میری مرضی نہیں تیری مرضی پوری ہوتی ہے۔“(متی:26-39)

اسلام اللہ کا آخری دین ہے جسے اس نے اپنے آخری رسول سیدنا حضرت محمدؐ کے ذریعہ انسانوں کی ہدایت کے لیے بھیجا۔ اسلام نے جس طرح عقائد سے متعلق دیگر تعلیمات کی تکمیل کی اسی طرح اس دین نے عقیدہ تقدیر کو بھی مکمل کیا۔ قرآن پاک اور احادیث مبارکہ میں تقدیر کے مسئلے کی حقیقت کو واضح کیا گیا ہے اور اس عقیدے کی حکمت اور مصلحت بھی بیان کی گئی ہے۔ ایسا ایک دو بار نہیں کیا گیا بلکہ بار بار اسے دہرایا گیا تاکہ سننے اور پڑھنے والوں کے دلوں میں یہ عقیدہ گھر کر جائے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ خاتم النبیین حضرت محمدؐ کی تربیت میں دنیا کے عظیم انسانوں کا جو گروہ تیار ہوا اور جسے ہم گروہ صحابہؓ کے نام سے جانتے ہیں، وہ صبر و شکر کا پیکر تھا۔ دنیا کی کوئی بھی مصیبت آجائے اور چاہے کیسے ہی حالات ہو جائیں صحابہ کرامؓ بالکل گھبراتے نہ تھے اور اپنی مرضی کو خدا کی مرضی کے تابع کر کے ہر طرح کے دنیوی وساوس سے آزاد ہو جاتے تھے۔ اسلام کا کارنامہ یہ ہے کہ اس نے عقیدۂ تقدیر کو محض نظری اور فلسفیانہ بحث تک محدود نہیں رکھا بلکہ اس کے عملی اور اخلاقی پہلوؤں پر زیادہ زور دیا تاکہ اسلام کے ماننے والے ہر طرح کے حالات میں صبر و ثبات کو اختیار کریں۔ مصیبتوں میں صبر و تسلی ان کے دامن گیر رہے تو کامیابیوں میں عجز و شکر ان کا شیوہ ہو۔

انسان کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان برحق ہے کہ وہ بہت ہی عجلت پسند واقع ہوا ہے۔ اسے اپنی کوشش میں ذرا سی بھی کامیابی اگر ملتی ہے تو فخر و غرور کے نشے میں چور ہو جاتا ہے اور سمجھ بیٹھتا ہے کہ جو کامیابی بھی اسے ملی ہے وہ محض اس کی جد و جہد کا نتیجہ ہے۔ اسی

طرح کسی کام میں انسان کو اگر اک ذرا سی ناکامی ہوتی ہے تو اسے اس کا ایسا صدمہ پہنچتا ہے کہ وہ دل شکستہ ہو کر ہمت ہار بیٹھتا ہے اور کچھ بھی کرنے سے فرار کا راستہ اختیار کرنے لگتا ہے۔ یہ انسان کی وہ اخلاقی برائیاں ہیں جو اس وجہ سے پیدا ہوتی ہیں کہ اس کے نزدیک اپنے عمل کی اہمیت سب سے زیادہ ہوتی ہے۔ وہ سمجھنے لگتا ہے کہ نتائج وہی نکلیں گے جو کچھ کہ وہ کرے گا۔ یہی وجہ ہے کہ کامیابی اسے مغرور بناتی ہے اور ناکامی سے وہ دل برداشتہ ہوتا ہے۔ کامیابی پر خوشی سے پھول جانا اور ناکامی پر ملول ہو جانا یہ دونوں کیفیتیں کسی بھی فرد یا قوم کی تعمیر و ترقی میں صحت مند علامتیں نہیں ہیں۔ اسلام جو اللہ کا آخری دین ہے اور جسے رہتی دنیا تک انسانوں کی ہدایت و رہنمائی کا کام کرنا ہے اس نے اس اخلاقی بیماری کا علاج عقیدۂ تقدیر کے ذریعہ کیا ہے۔ یہ ایسا عقیدہ ہے جو کامیابی اور ناکامی دونوں طرح کے مواقع پر انسان کو بے لگام اور حد سے زیادہ مایوس نہیں ہونے دیتا۔ یہ عقیدہ انسان کو بتاتا ہے کہ اسے جو بھی کامیابی ملتی ہے وہ براہ راست اس کی کوششوں کا نتیجہ نہیں ہوتی بلکہ کامیابی اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے حاصل ہوتی ہے، کوشش انسان کرتا ہے۔ اس لیے کامیابی پر فخر و غرور کا رویہ اختیار کرنے کے بجائے انسان کو شکر کی روش پر چلنا چاہیے کہ اس نے ایک کوشش کی اور اللہ نے اسے کامیابی سے ہم کنار کیا۔ اسی طرح انسان کو اگر کسی کام میں ناکامی ہاتھ آتی ہے تو اس سے بھی اسے بہت زیادہ ملول نہیں ہونا چاہئے بلکہ اسے اللہ تعالیٰ کی حکمت اور مصلحت کا نتیجہ سمجھنا چاہیے اور ایک بار پھر عمل کے لیے تیار ہو جانا چاہیے۔

اس کی وضاحت اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں بڑے ہی اچھے انداز میں کی ہے:

مَا أَصَابَ مِن مُّصِيبَةٍ فِي الْأَرْضِ وَلَا فِي أَنفُسِكُمْ إِلَّا فِي كِتَابٍ مِّن قَبْلِ أَن نَّبْرَأَهَا إِنَّ ذَٰلِكَ عَلَى اللَّهِ يَسِيرٌ لِكَيْلَا تَأْسَوْا عَلَىٰ مَا فَاتَكُمْ وَلَا تَفْرَحُوا بِمَا آتَاكُمْ وَاللَّهُ لَا يُحِبُّ كُلَّ مُخْتَالٍ فَخُورٍ (الحدید:22-23)

ترجمہ: کوئی مصیبت نہیں آتی زمین میں اور نہ خود تم (اس زمین کے بسنے والوں) میں مگر یہ کہ وہ ایک کتاب میں اپنی پیدائش سے پہلے درج ہوتی ہے، یہ اللہ پر آسان ہے۔ ایسا اس لیے کیا گیا تاکہ تم اس پر جو تم سے جاتا رہے غم نہ کھایا کرو اور جو تم کو (اللہ) دے اس پر اترایا نہ کرو، اور اللہ کسی اترانے والے بڑائی مارنے والے کو پسند نہیں کرتا۔

ان دو آیتوں میں تقدیر کے مسئلے کو اس خوبی کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے سلجھا دیا ہے کہ اس کے بعد اب کسی اور تشریح و توضیح کی ضرورت باقی نہیں رہ جاتی۔ صحابہ کرام ان آیات کو سمجھنے اور ان پر عمل کرنے والے تھے اس لیے وہ نہ تو کامیابیوں پر اتراتے تھے اور نہ ہی ناکامیوں سے گھبراتے اور دل برداشتہ ہوتے تھے بلکہ وہ اللہ کی ذات پر پورا پورا الیقین رکھتے تھے اور کسی حال میں بھی اللہ کی رحمت سے مایوس نہیں ہوتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ایک مختصر سی مدت میں کامیابیوں کا جو معیار انہوں نے قائم کیا دنیا آج تک اس سے قاصر ہے۔

یہ غلط فہمی ہے کہ تقدیر کا عقیدہ تسلیم کر لینے سے انسان خود کو مجبور محض سمجھنے لگتا ہے اور عمل سے ناکارہ ہو جاتا ہے۔ بلکہ اوپر کی آیات پر اگر ہم غور کریں تو پتہ چلتا ہے کہ تقدیر کا عقیدہ انسان کو بے عمل بنانے کے بجائے اس کے اندر تازہ جوش وولولہ پیدا کرتا ہے۔ اسے ناکامیوں پر مایوس نہیں ہونے دیتا اور اس کے اندر یہ حوصلہ پیدا کرتا ہے کہ وہ عمل کا سلسلہ جاری رکھے۔

5.5 تقدیر کے بارے میں مختلف نقاط نظر کا خلاصہ

تقدیر کے حوالے سے ہی عام طور پر جبر و قدر کا مسئلہ بھی اٹھایا جاتا ہے یعنی یہ کہ انسان اپنے عمل اور ارادے میں مجبور محض ہے یا پھر اسے عمل اور ارادے کی کھلی آزادی حاصل ہے۔ تقدیر کے باب میں یہ وہ گرہ ہے جس کو کھولنے میں اسلام سے پہلے مذہب اور فلسفہ دونوں بری طرح ناکام رہے ہیں۔ اسلام سے پہلے کے مذاہب اور نظریات کا جتنا بھی مطالعہ کیا جائے معلوم ہوتا ہے کہ انسانی ارادہ و اختیار کی آزادی اور مجبوری کے مسئلے کو یہ حل کرنے میں ناکام رہے ہیں۔ ہندو مذہب ہو، یہودیت ہو، عیسائیت ہو یا مجوسی عقائد اور نظریات کو ماننے والے لوگ، سب نے اس میدان میں ٹھوکر کھائی ہے اور اپنے پیروکاروں کے درمیان افراط و تفریط پیدا کرنے کا سبب بنے ہیں۔ اور انہیں کے زیر اثر مسلمانوں کے بعض فرقے بھی ارادہ و اختیار کے مسئلے کو لے کر گمراہی کا شکار ہوئے اور امت میں افتراق و انتشار کا سبب بھی بنے۔ حالانکہ اسلام نے اپنی تعلیمات میں انسانی ارادہ و عمل کی آزادی و مجبوری یعنی جبر و قدر کو لے کر ایک متوازن اور واضح نقطۂ نظر پیش کیا ہے۔ یہاں ہم ان تمام مذاہب، فلسفیانہ افکار اور فرقوں کے نقاط نظر کو الگ الگ پیش کر کے ان کا تجزیہ و تحلیل کرنے کی پوزیشن میں نہیں ہیں۔ البتہ ہماری کوشش ہے کہ جبر و قدر کرے حوالے سے ان کے درمیان جو بنیادی تقسیم ہے اس کا تعارف کرانے کے بعد اسلام کے متوازن موقف کو پیش کر دیں۔

جبر و قدر کا مسئلہ ہمیشہ سے انسانی سماج میں فکری و عملی افتراق و انتشار کا سبب بنتا رہا ہے اور اسے عام طور پر دو گروہوں میں تقسیم کرتا رہا ہے۔ ایک وہ جس کے تحت یہ رجحان پروان چڑھتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی دیگر مخلوقات کی طرح انسان بھی مجبور محض ہے۔ اسے ارادہ و اختیار کی بالکل ہی آزادی حاصل نہیں ہے۔ وہ جو کچھ بھی کرتا ہے اس میں اس کی اپنی آزادی کو ذرا بھی دخل نہیں ہے، جو کچھ اللہ نے چاہا اور جو کچھ اس نے نوشتۂ تقدیر میں لکھ دیا انسان وہی کچھ کرنے پر مجبور ہے۔ ہندو مت، عیسائیت اور یہودیت جیسے مذاہب میں جبر کے اسی تصور کی جانب میلان نمایاں ہے، خود مسلمانوں میں بھی جبریہ کا فرقہ اسی سے متاثر تھا۔ جبر کے اس تصور کو مان لینے کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ انسان پوری طرح بے عمل اور نکھٹو بن جاتا ہے۔ یا تو وہ کچھ کرتا ہی نہیں یا جو کچھ بھی کرتا ہے سب کچھ خدا کے کھاتے میں ڈال کر اور خود کے مجبور ہونے کا بہانہ بنا کر الگ ہو بیٹھتا ہے۔ ظلم اور بے انصافی کے فروغ کا سبب بنتا ہے اور بے حیائی و بد عملی کے راستے ہموار کرتا ہے۔

دوسرا گروہ وہ ہے جو قدر کی جانب میلان رکھتا ہے یعنی یہ کہ انسان اپنے ہر عمل کا خالق خود ہے۔ وہ اس دنیا میں پوری طرح آزاد اور بااختیار ہے۔ جو چاہے اور جس طرح چاہے کرتا پھرے اس کے لیے کوئی روک ٹوک نہیں ہے۔ خدا نے انسان اور کائنات کو بنا کر خود کو ان سے الگ کر لیا ہے۔ اس نے جو اصول اور ضابطے بنا دیے اور انسان کو جو آزادی دے دی اس کے آگے اب خود بھی مجبور اور بے بس ہے۔ وہ چاہے بھی تو اس میں اب کسی طرح کی تبدیلی نہیں کر سکتا۔ اللہ تعالیٰ کا علم غیب اور اس کی بنیاد پر نوشتۂ تقدیر کا لکھنا سب کچھ اس گروہ کے نزدیک بے معنی ہے۔ یہ خدا کے علم غیب کا انکار کرتا ہے اور یہ کہتا ہے کہ انسان اگلے لمحے کیا کرنے والا ہے اللہ کو اس کی خبر نہیں یہاں تک کہ ان کے بعض فرقوں کے نزدیک فرشتوں پر بھی اللہ تعالیٰ کو کسی طرح کا قابو اور اختیار حاصل نہیں ہے۔ قدر یعنی انسان اپنے ارادے اور عمل میں پوری طرح آزاد ہے، کو مان لینے کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ انسان خود کو ہی سب کچھ سمجھنے لگتا ہے اور ایک طرح سے خدا کا وجود یا عدم

وجود اس کے لیے بے معنی ہو جاتا ہے۔

اسلام اور پیغمبر اسلام سیدنا حضرت محمدؐ کا امتیاز یہ ہے کہ انہوں نے جبر و قدر کی اس افراط و تفریط کے درمیان ایک شاہراہِ اعتدال قائم کی۔ اس حقیقت میں کوئی شبہ نہیں کہ اللہ تعالیٰ کی قدرت بے پایاں ہے اور کائنات کا ایک ذرّہ بھی اس کی دسترس سے باہر نہیں اور ساتھ ہی یہ بھی حقیقت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی مخلوقات میں سے انسان کو ارادہ و اختیار کی آزادی بخشی ہے۔ اسلام ان دونوں سچائیوں کو تسلیم کرتا ہے اور بتاتا ہے کہ یہ دونوں ہی چیزیں اپنی اپنی جگہ پر درست اور صحیح ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی قدرت تمام عالم کو محیط ہے۔ زمین و آسمان میں کوئی بھی چیز نہیں جو اللہ تعالیٰ کی مرضی اور منشا کے بغیر ایک ذرّہ برابر بھی حرکت کر سکے۔ اللہ تعالیٰ نے جو کچھ بھی تخلیق کیا ہے وہ اس کے حکم کا پابند ہے۔ انسان بھی اللہ تعالیٰ کی اس مشیت کے عموم میں شامل ہے۔ انسان کے اعضاء و جوارح اور اس سے صادر ہونے والے اعمال بھی اللہ تعالیٰ کی قدرت اور اس کی مشیت سے باہر نہیں۔ وہ چاہے تو انسان بھی اس کی قدرت اور مشیت کا اسی طرح پابند اور مجبور ہو جائے جس طرح کہ کائنات کی دیگر مخلوقات ہیں۔ اگر کوئی فرد یا معاشرہ اللہ تعالیٰ کی ایسی قدرت کو تسلیم نہیں کرتا تو گویا وہ ایک ایسا خدا مانتا ہے جو یا تو اختیارات رکھتا ہی نہیں یا جس کے اختیارات محدود ہیں، جس کی قدرت عام نہیں بلکہ خام ہے اور جس کا اقتدار و بادشاہی ناقص اور نا تمام ہے۔

لیکن اسلام جہاں ایک طرف اللہ تعالیٰ کی قدرت کاملہ و مطلقہ کی تصدیق کرتا ہے وہیں یہ بات بھی تسلیم کرتا ہے کہ جس خدا کی قدرت و اختیار لا محدود اور بے پایاں ہیں اسی خدائے بزرگ و برتر نے اپنی مخلوقات میں سے ایک یعنی انسانوں کو اپنے اعمال کی انجام دہی میں ارادہ و اختیار کی آزادی بھی ایک حد تک عطا کی ہے اور اسی آزادی کے تحت انسان بہت سارے کام اپنے ارادہ و اختیار سے کرتا ہے۔ انسان کے لیے ارادہ و اختیار کی اس آزادی کو اگر تسلیم نہ کیا جائے تو انسان دنیا کی دیگر مخلوقات کی طرح مجبور محض بن جائے گا اور اس کا دیگر مخلوقات کے ساتھ امتیاز ختم ہو جائے گا۔ اور جب وہ بھی دوسری مخلوقات کی طرح مجبور و پابند مخلوق قرار پائے گا تو پھر اس کے لیے شریعت، کتاب، تعلیم، انبیاء کی بعثت، خیر و شر کا تصور، حساب و کتاب اور اعمال کی جزاء سزا جیسی تمام چیزیں بے کار اور بے معنی ہو کر رہ جائیں گی۔ بلکہ یہ تو اس کے خلاف سراسر ظلم و ناانصافی قرار پائے گا کہ اسے ان کاموں کی جزا و سزا ملے جن کے کرنے کا اختیار اسے حاصل ہی نہیں تھا۔

اسلام اپنے پیروؤں کو بتاتا ہے کہ مذکورہ بالا دونوں ہی سچائیاں اپنی اپنی جگہ پر درست اور صحیح ہیں یعنی یہ کہ اللہ تعالیٰ کی قدرت و اختیار مطلق ہے، اس کی حکمرانی ذرّے ذرّے پر قائم ہے اور اس کی مرضی کے بغیر ایک تنکا بھی اپنی جگہ سے حرکت نہیں کر سکتا، اسی طرح یہ بھی کہ اس مطلق و مختار خدا نے انسان کو اپنے عمل میں ارادہ و اختیار کی آزادی عطا کی ہے اور اس آزادی کی وجہ سے انسان اپنے عمل کا ذمہ دار اور اس کے لیے جواب دہ قرار پاتا ہے۔ انسان کی یہی آزادی ہے جس کے سبب وہ اچھے کاموں پر تعریف اور جزا کا مستحق قرار پاتا ہے اور اسی کی وجہ سے برے کاموں پر اسے ملامت کی جاتی اور سزا دی جاتی ہے اور اسی جواب دہی اور ذمہ داری کے تقاضے کے تحت اللہ تعالیٰ نے انسانوں کی ہدایت اور رہنمائی کے لیے رسول اور کتابیں بھیجیں۔

اسلام کی کتاب ہدایت قرآن مجید اور پیغمبر اسلام حضرت محمدؐ کا اسوۂ حسنہ ایک ایک کر کے پڑھتے اور ملاحظہ کرتے جایئے اللہ تعالیٰ کی قدرت کاملہ اور انسان کو عطا کردہ ارادہ و اختیار کی آزادی دونوں سچائیوں کو تفصیل کے ساتھ واضح کیا گیا ہے اور ایک ایسی روشن راہ اعتدال

ابھر کر سامنے آتی ہے جس میں نہ تو کامل جبر ہے اور نہ اختیار کلی۔ قرآن مجید ایک طرف یہ واضح کرتا ہے کہ "اللہ کی اجازت کے بغیر ایک پتہ بھی گر نہیں سکتا" تو دوسری طرف وہ یہ بھی بتاتا ہے کہ "ہر جان اپنے اعمال کے ہاتھوں گروی ہے"۔ مطلب یہ کہ اللہ تعالیٰ کی قدرت بے پایاں ہے، اس کا اختیار لامحدود ہے اور اس کی مرضی اور مشیت کے بغیر کچھ بھی نہیں ہوتا۔ اس کے باوجود خود اللہ تعالیٰ نے اپنی حکمت کے تحت انسان کو ارادے اور عمل کی آزادی عطا کی ہے اور یہی آزادی دے کر اللہ تعالیٰ نے انسان کو ذمہ دار اور جواب دہ بنایا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قانون و شریعت میں انسان پر اس کے کسی ایسے عمل کی ذمہ داری نہیں ڈالی جاتی جس میں کہ اس کا ارادہ اور نیت شامل نہ ہو۔ اللہ کے رسولؐ کا روشن ارشاد ہے "انما الاعمال بالنیات" (انسانی کاموں کا دارومدار نیتوں پر ہے)۔ قرآن مجید کے ذریعہ دکھائی جانے والی اگر یہ روشن ہدایت نظروں میں ہو تو کوئی بھی ذہن جبر و قدر اور پھر تقدیر کی بھول بھلیوں میں نہ بھٹکے کیونکہ اس کے مطابق نہ تو اللہ تعالیٰ کی قدرت و اختیار میں کسی قسم کی کوئی کمی آتی ہے اور نہ ہی انسان مجبور محض ہے۔ اللہ کو قدرت حاصل ہے وہ جب چاہے اپنی عطا کردہ ارادہ و اختیار کی آزادی انسان سے سلب کر لے لیکن اس نے ایسا نہیں کیا بلکہ انسان کو عمل کی آزادی دی تاکہ وہ اپنی جنت بھی خود ہی بنائے اور جہنم میں جائے تو اپنے کرتوتوں کے بدلے جائے۔

5.6 عقیدہ تقدیر کا اثر انسانی زندگی پر

تقدیر کے حوالے سے مختلف نقاط نظر کو سمجھنے اور جان لینے کے بعد اس عقیدے کے اثرات کو انسانی زندگی پر بخوبی محسوس کیا جاسکتا ہے۔ ایک ایسا سماج اور معاشرہ جو جبر کا قائل ہو اور جس کے افراد خود کو خدا کی قدرت کے ہاتھوں مجبور محض سمجھتے ہوں۔ وہ تقدیر کا بہانہ بنا کر عمل، تخلیق اور حوصلہ مندی جیسی صلاحیتوں سے خود کو دھیرے دھیرے عاری کر لیتا ہے اور پھر وہ معاشرہ زوال کے راستے پر ہی نہیں چل پڑتا بلکہ زوال اس کا مقدر بن جاتا ہے۔ اس معاشرے کے افراد کے اندر خواہ کتنی ہی اور کیسی ہی صلاحیتیں کیوں نہ موجود ہوں، رفتہ رفتہ ان میں زنگ لگ جاتا ہے۔ چونکہ ایسے سماج میں عمل کی رفتار رک جاتی ہے اور لوگ بے عملی کا شکار ہو جاتے ہیں اس لیے اس معاشرے میں بارآوری اور تخلیق کا عمل بھی رک جاتا ہے۔ اور جب ایسا ہوتا ہے تو پھر اس معاشرے سے حوصلہ مندی کی صفت بھی ختم ہو جاتی ہے اور جب حوصلہ مندی جاتی رہی تو پھر محرومی اور محکومی سے اس معاشرے کو دنیا کی کوئی بھی قوت نہیں بچا سکتی۔ اسی طرح جس معاشرے اور اس کے افراد میں قدر کا عقیدہ اپنی جڑیں گہری بنا لیتا ہے، اس کے افراد اپنے آپ کو کلی طور پر با اختیار سمجھنے لگتے ہیں اور یہ سوچتے ہیں کہ جو کچھ بھی کرتے ہیں اسے وہی کرتے ہیں، خدا کی ذات ایک شئ معطل ہے جس نے کائنات کے اس پورے کارخانے کو بنا کر خود کو اس سے الگ کر لیا ہے اور اب بیٹھا آرام کر رہا ہے۔ جو معاشرہ اور اس کے افراد اپنے عمل کو ہی سب کچھ سمجھنے لگیں وہ بھی زیادہ دیر کامیابی اور ترقی کے راستے پر آگے نہیں بڑھ سکتے۔ کیونکہ جن کا صرف اپنے عمل اور ظاہر اسباب پر یقین ہوتا ہے انہیں بہت معمولی ناکامی بھی بہت جلد دل برداشتہ کر دیتی ہے۔ وہ جو کچھ کرنا چاہتے ہیں اگر اس میں کامیابی نہیں ملتی تو دل برداشتہ اور مایوس ہو جاتے ہیں یہاں تک کہ ان میں خودکشی کا رجحان بھی بڑھنے لگتا ہے۔

اسلام کا پیش کردہ عقیدہ تقدیر متوازن اور مکمل ہے۔ اس میں قدرت کاملہ صرف اور صرف ذات باری تعالیٰ کو حاصل ہے اور اسی

نے اپنی حکمت سے انسان کو ایک محدود دائرے میں ارادہ و عمل کی آزادی عطا کی ہے۔ تقدیر کا یہ عقیدہ انسان سے مطالبہ کرتا ہے کہ وہ سب کچھ خدا پر چھوڑ کر نہ بیٹھ رہے بلکہ اپنی حد تک اسے عمل کی جو آزادی ملی ہوئی ہے اسے پوری طرح انجام دے اور نتیجہ کار کو اللہ کی ذات پر چھوڑ دے۔ اس کی مثال اس کسان کی سی ہے جو کھیت میں ہل چلا کر بیج ڈال دیتا ہے اب اس بیج کو بارآور کرنا اللہ کا کام ہے۔ اس کا فائدہ یہ ہے کہ انسانی سماج نہ تو بالکل معطل بیٹھ رہتا ہے اور نہ ہی مایوسی کا شکار ہوتا ہے۔ اس میں حوصلہ مندی ہوتی ہے وہ ناکامیوں سے گھبراتا نہیں بلکہ اگر اسے کسی کام میں ناکامی ہوتی ہے تو اللہ کی ذات پر بھروسہ کرتے ہوئے وہ ایک بار پھر اپنے کام میں لگ جاتا ہے اور اس طرح تعمیر و ترقی کا کام اس سماج میں مسلسل جاری رہتا ہے۔

5.7 کلیدی الفاظ

فرض شناسی	ذمہ داری سمجھنا، فرض کو پہچاننا، ایمان داری
موہوم	وہم کیا گیا، خیالی، تصوراتی
مبرہن	روشن، واضح، دلائل سے ثابت
ملول	غمگین، رنجیدہ، افسردہ

5.8 اکتسابی نتائج

اس اکائی میں آپ نے درج ذیل نکات سیکھے:

- تقدیر ایک ایسا عقیدہ ہے جس میں اللہ عالم الغیب نے کائنات کی ہر چیز کے بارے میں اپنے علم کی بنیاد پر ایک فیصلہ کر دیا ہے‘ اب کائنات کا کارخانہ اسی فیصلے کے مطابق جاری ہے، اس فیصلے میں کسی تغیر یا تبدیلی کا امکان نہیں۔ البتہ اپنی مخلوقات میں سے انسان کو اللہ تعالیٰ نے ایک محدود دائرے میں ارادہ و عمل کی آزادی دی ہے اور اسی ارادہ و عمل کی آزادی کی وجہ سے اللہ نے انسان کو جواب دہ بنایا ہے اور اسی بنیاد پر انسانی عمل کا جائزہ لیا جائے گا، حساب کتاب ہوگا اور عمل کے مطابق اچھا یا برا بدلہ بھی ملے گا۔ یہاں یہ بات ذہن میں رکھنی چاہیے کہ انسان کی جواب دہی انہیں اعمال میں ہے جن کا کہ اختیار اسے حاصل ہے۔ جو کام انسان کے اختیار میں نہیں اور جن میں اس کا ارادہ شامل نہیں، ان پر جواب دہی بھی نہیں ہے۔
- عقیدہ تقدیر کے حوالے سے دنیا کے مختلف مذاہب بے اعتدالی کا شکار ہوئے ہیں کچھ نے انسان کو خدا کی قدرت کاملہ کے آگے بالکل مجبور اور بے بس قرار دیا اور اس سے ارادہ و عمل کی آزادی چھین لی نتیجے میں ”جبر“ کا شکار ہوئے‘ جب کہ کچھ دوسرے مذاہب نے انسان کو ہی اختیار کلی عطا کر دیا اور خدا سے اختیار و اقتدار کی نفی کی یہاں تک کہ ”قدر“ کا شکار ہوئے۔ اسلام نے ایک شاہراہ اعتدال قائم کی‘ اس کے مطابق قدرت کاملہ اللہ کو حاصل ہے اور اسی نے اپنی قدرت سے انسان کو ایک محدود دائرے میں ارادہ و عمل کی آزادی دی ہے۔ اب انسان اس آزادی کا فائدہ اٹھاتے ہوئے چاہے تو اپنے لیے جنت تعمیر کرے یا خود کو جہنم کا

ایندھن بنالے۔

- پیغمبر اسلام حضرت محمدؐ نے عقیدۂ تقدیر پر ایمان لانے کے لیے جس شدت کے ساتھ تلقین فرمائی ہے، اسی شدت کے ساتھ اس میں بحث و مناقشہ سے منع بھی فرمایا ہے۔ ہمیں بھی چاہیے کہ ہم تقدیر پر ایمان لاتے ہوئے اپنی ذمہ داریوں کو کماحقہ ادا کرتے رہیں، کج بحثیوں میں پڑنے کے بجائے نتائج کو اللہ تعالیٰ کی ذات پر چھوڑ دیں۔ یہی حضرت محمدؐ کی تعلیم ہے اور اسی پر ایمان کی تعلیم دی گئی ہے۔

5.9 نمونہ امتحانی سوالات

5.9.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات

1. ”قدر“ کے لغوی معنی بتائیں؟

(a). اندازہ کرنا (b). ارادہ واختیار (c). عالم الغیب (d). سب غلط

2. ”قضا“ کے لغوی معنی کیا ہے؟

(a). فیصلہ کرنا (b). ناانصافی کرنا (c). ظلم کرنا (d). سب صحیح

3. تقدیر پر ایمان لانا اسلام کے بنیادی عقائد میں شامل ہے؟

(a). ہاں (b). نہیں (c). دونوں صحیح (d). سب غلط

4. آسمانی کتاب زبور میں تقدیر کی تعلیم موجود ہے؟

(a). ہاں (b). نہیں (c). دونوں صحیح (d). سب غلط

5. تقدیر کا عقیدہ کس کے ساتھ خاص ہے؟

(a). اسلام (b). یہودی (c). عیسائی (d). سب صحیح

5.9.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات

1. تقدیر کے معنی و مفہوم سے بحث کیجیے۔
2. تقدیر کے بارے میں اسلامی نقطۂ نظر کی وضاحت کیجیے۔
3. قرآن میں تقدیر کے بیان کا جائزہ لیجیے۔
4. پوری کائنات اللہ کی مرضی اور قدرت کے سامنے مجبور ہے؟ قرآنی تعلیمات کی روشنی میں واضح کیجیے۔
5. تقدیر میں انسان کو ارادہ واختیار کی آزادی حاصل ہے؟ قرآن کی روشنی میں جائزہ لیجیے۔

5.9.3 طویل جوابات کے حامل سوالات

1. تقدیر کی بابت اسلامی موقف واضح کیجیے۔
2. تقدیر کی بابت مختلف نقاط نظر کا جائزہ لیجیے۔
3. انسانی زندگی پر عقیدہ و توحید کے اثر کا جائزہ لیجیے۔

5.10 تجویز کردہ اکتسابی مواد

---

1. عقیدہ اسلامی : علامہ محمد غزالی / محمد عنایت اللہ اسد سبحانی
2. دینیات : مولانا سید ابو الاعلی مودودی
3. اسلام ایک نظر میں : مولانا صدرالدین اصلاحی
4. اسلامی تعلیمات : مولانا محمد سلیمان فرخ آبادی
5. اسلامی عقائد : علامہ عفیف عبد الفتاح طباہر / ڈاکٹر عبید اللہ فہد فلاحی
6. سیرہ النبی (جلد چہارم) : علامہ سید سلیمان ندوی

اکائی 6: نماز

اکائی کے اجزا:

6.0 تمہید
6.1 مقاصد
6.2 نماز کا تعارف
  6.2.1 نماز کی اہمیت
  6.2.2 حقیقت نماز
  6.2.3 نماز کی فرضیت
  6.2.4 نماز کے مصالح و فوائد
  6.2.5 پابندی وقت
  6.2.6 فرض شناسی
  6.2.7 مشکل اوقات میں ذریعہ امداد الٰہی
  6.2.8 برائیوں کے خلاف ڈھال
  6.2.9 نیکیوں کی قبولیت کا ذریعہ
6.3 طہارت جسمانی
6.4 اجتماعیت
6.5 کلیدی الفاظ
6.6 اکتسابی نتائج
6.7 نمونہ امتحانی سوالات
  6.7.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات
  6.7.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات
  6.7.3 طویل جوابات کے حامل سوالات

6.8 تجویز کردہ اکتسابی مواد

6.0 تمہید

نماز اسلام کی پہلی عملی عبادت ہے جو انسان اپنے عمل سے ادا کرتا ہے دوسرے الفاظ میں نماز خالص بدنی عبادت ہے۔ نماز ایک دن اور رات میں پانچ مرتبہ فرض ہے اور یہ ایسی عبادت ہے جو کسی حالت میں معاف نہیں ہے۔ ہر بالغ اور عاقل مسلمان کے لئے نماز پڑھنا ضروری ہے۔ اور پابندی وقت کے ساتھ نماز پڑھنا ضروری ہے۔

6.1 مقاصد

اس اکائی کا مقصد نماز کو اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے عماد الدین یعنی دین کا ستون کہا ہے۔ اسلام کی عمارت نماز پر قائم ہے۔ اس اکائی میں نماز کی اہمیت، معنویت اور طریقہ نماز طلبہ کو بتایا جائے گا تاکہ وہ اسلام کی اس اہم ترین عبادت سے پوری طرح واقف ہوسکیں۔ اور نماز کے طریقہ اور نماز کی اقسام سے بھی ان کو آگاہی مل سکے۔ فرض، سنت اور نفل نمازوں کا فرق معلوم ہوجائے اور ہر قسم کی نماز کی اہمیت سے آگاہ ہوجائیں۔

6.2 نماز کا تعارف

نماز کے لئے عربی زبان میں لفظ صلوٰۃ استعمال ہوا ہے، صلوٰۃ کے لغوی معنی دعا کے آتے ہیں جیسا کہ قرآن مجید میں ہے۔

وَصَلِّ عَلَيۡهِمۡ إِنَّ صَلَاتَكَ سَكَنٌ لَّهُمۡ (التوبہ:103)

”اور انہیں دعائیں دیجئے کہ آپ کی دعا ان کے لئے تسکین قلب کا باعث ہوگی“

حدیث میں بھی یہ لفظ اسی معنی میں استعمال ہوا ہے جیسے۔

صلوا علیه وسلموا تسلیما۔

درود بھیجو اس پر اور سلامتی۔

بعض علماء نے اس کے اور معنی بھی بیان کئے ہیں جن میں اللہ تعالیٰ کی عبادت اور اس کا قرب حاصل کرنا وغیرہ شامل ہیں۔

قرآن مجید میں صلوٰۃ اپنے لغوی معنی یعنی دعا اور اصطلاحی معنی یعنی نماز دونوں معانی میں استعمال ہوا ہے، اصطلاح شریعت میں نماز ایک مخصوص طریقہ عبادت ہے جس میں قیام، رکوع اور سجود شامل ہیں۔

6.2.1 نماز کی اہمیت

اسلام میں نماز فرض ہے اور تمام فرائض میں سب سے زیادہ اہم نماز ہے۔ حدیث شریف میں آیا ہے کہ قیامت کے دن سب

سے پہلے نماز کا ہی حساب ہو گا، اور قرآن مجید کی ایک آیت سے یہ مفہوم ہوتا ہے کہ نماز ترک کرنا شرک کے قریب پہنچا دیتا ہے۔ قرآن مجید میں ہے:

وَأَقِيْمُوا الصَّلاَةَ وَلاَ تَكُوْنُوا مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ (الروم:31)

”اور نماز کو قائم کرو اور مشرکین میں سے نہ ہو جاؤ“۔

قرآن مجید کی اور بہت سی آیات ہیں جن میں واضح طور پر نماز پڑھنے، نماز کے فرض ہونے اور نماز کی حفاظت کرنے کا حکم دیا ہے اور بہت سی آیات میں یہ بیان بھی وارد ہوا ہے کہ جن کو دنیا و آخرت میں کوئی عذاب دیا گیا اس کی وجہ یہ تھی کہ انہوں نے نمازوں کو چھوڑ دیا تھا، ایک آیت میں ہے۔

حَافِظُواْ عَلَى الصَّلَوَاتِ والصَّلاَةِ الْوُسْطَى وَقُومُواْ لِلّهِ قَانِتِيْنَ (البقرۃ:238)

”پابندی کرو نمازوں کی اور پابندی کرو بیچ کی نماز کی“۔

ایک آیت میں ہے:

إِنَّ الصَّلاَةَ كَانَتْ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ كِتَاباً مَّوْقُوتاً (النساء:103)

”بے شک نماز اہل ایمان پر مقرر وقتوں کے ساتھ فرض ہے“۔

ایک جگہ اپنی اولاد کو نماز پڑھنے کا حکم دیا ہے:

وَأْمُرْ أَهْلَكَ بِالصَّلاَةِ وَاصْطَبِرْ عَلَيْهَا (طٰہٰ:132)

”اور اپنے لوگوں کو نماز کا حکم دو اور اس کے پابند رہو“۔

ایک جگہ دنیا میں ناکام لوگوں کے ضمن میں آیا ہے۔

فَخَلَفَ مِن بَعْدِهِمْ خَلْفٌ أَضَاعُوا الصَّلاَةَ وَاتَّبَعُوا الشَّهَوَاتِ (مریم:59)

”پھر ان کے بعد ایسے ناخلف جانشیں ہوئے جنہوں نے نماز کو ضائع کر دیا اور وہ خواہشوں کے پیچھے پڑ گئے“۔

ایک جگہ جہنمیوں سے یہ پوچھے جانے کا ذکر ہے کہ تم کو جہنم میں کس چیز نے پہنچایا تو وہ پہلی بات یہی کہیں گے کہ ہم نماز نہیں پڑھتے تھے۔

مَا سَلَكَكُمْ فِيْ سَقَرَ ۔ قَالُوا لَمْ نَكُ مِنَ الْمُصَلِّيْنَ (المدثر:42-43)

”کسی چیز نے تم کو پہنچایا جہنم میں وہ کہیں گے ہم نماز نہیں پڑھتے تھے“۔

قرآن مجید میں نماز کے دنیاوی فوائد بھی بیان کئے گئے۔ ایک آیت میں ہے:

إِنَّ الصَّلاَةَ تَنْهَى عَنِ الْفَحْشَاء وَالْمُنكَرِ (العنکبوت:45)

”بے شک نماز بے حیائی سے اور برے کاموں سے روکتی ہے“۔

ایک جگہ کامیابی کا وسیلہ نماز کو بتایا گیا۔

قَدْ أَفْلَحَ مَن تَزَكَّى وَذَكَرَ اسْمَ رَبِّهِ فَصَلَّى (اعلیٰ:14-15)

”کامیاب ہوا جس نے اپنے کو پاک کیا۔ اور اپنے رب کا نام لیا، پھر نماز پڑھی“۔

ایک اور آیت میں ہے:

إِنَّ الْإِنسَانَ خُلِقَ هَلُوعاً ۔ إِذَا مَسَّهُ الشَّرُّ جَزُوعاً ۔ وَإِذَا مَسَّهُ الْخَيْرُ مَنُوعاً ۔ إِلَّا الْمُصَلِّينَ ۔ الَّذِينَ هُمْ عَلَى صَلَاتِهِمْ دَائِمُونَ (المعارج:19-23)

”بے شک انسان کم ہمت پیدا ہوا ہے۔ جب اس کو تکلیف پہنچتی ہے تو وہ گھبرا اٹھتا ہے۔ اور جب اس کو فارغ البالی ہوتی ہے تو وہ بخل کرنے لگتا ہے۔ مگر وہ نمازی۔ جو اپنی نماز کی پابندی کرتے ہیں“۔

ایک آیت میں نماز کو گناہوں سے پاک کرنے کا وسیلہ بتایا گیا۔

وَأَقِمِ الصَّلاَةَ طَرَفَيِ النَّهَارِ وَزُلَفاً مِّنَ اللَّيْلِ إِنَّ الْحَسَنَاتِ يُذْهِبْنَ السَّـيِّئَاتِ ذَلِكَ ذِكْرَى لِلذَّاكِرِينَ (سورہ ہود:114)

”اے پیغمبر آپ دن کے دونوں حصوں میں اور رات گئے نماز قائم کریں کہ نیکیاں برائیوں کو ختم کر دیتی ہیں۔ یہ ذکر خداوندی کرنے والوں کے لیے نصیحت ہے“۔

قرآن مجید میں ایک جگہ نماز اور صبر کو اللہ تعالیٰ سے مدد طلب کرنے کا ذریعہ بتایا گیا ہے۔

یا ایھا الذین آمنوا استعینوا بالصبر والصلوۃ (البقرہ:153)

”اے ایمان والو تم صبر اور نماز کے ساتھ مدد مانگو“۔

احادیث میں بھی نماز کی بڑی فضیلت وارد ہوئی ہے۔ ایک روایت میں اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میری آنکھوں کی ٹھنڈک نماز میں ہے۔ ایک روایت میں ہے کہ کفر اور انسان کے درمیان حد فاصل نماز ہے۔ (مسلم) ایک روایت میں آیا ہے کہ نماز دین کا ستون ہے۔ ایک اور روایت میں آیا ہے کہ اگر کوئی شخص نہر کے کنارے رہتا ہو اور روزانہ پانچ مرتبہ نہر میں غسل کرتا ہو تو جس طرح اس کے بدن پر کوئی میل باقی نہیں رہتا اسی طرح پانچ وقت کی نماز انسان کو گناہوں کے میل کچیل سے پاک کر دیتی ہے۔ (بخاری) ایک روایت میں آیا ہے کہ جو مسلمان دو نمازوں کو صحیح طور پر ادا کرتا ہے تو وہ نمازیں درمیان میں ہونے والے گناہوں کے لئے کفارہ بن جاتی ہیں۔ (بخاری و مسلم) ان احادیث کے علاوہ اور بھی بہت سی روایات میں نماز کی فضیلت وارد ہوئی ہے۔

6.2.2 حقیقت نماز

نماز دراصل عبادت کا اعلیٰ ترین مقام ہے، یہ خدا اور بندے کے درمیان ایک رابطہ اور وسیلہ ہے۔ تزکیہ و طہارت کا ذریعہ ہے

اور خدا کا ذکر ہے۔ قرآن مجید میں ہے۔

إِنَّنِيْ أَنَا اللّٰهُ لَا إِلٰهَ إِلَّا أَنَا فَاعْبُدْنِيْ وَأَقِمِ الصَّلَاةَ لِذِكْرِيْ (طٰہٰ:14)

"میں ہی اللہ ہوں۔ میرے سوا کوئی معبود نہیں۔ بس تم میری ہی عبادت کرو اور میری یاد کے لئے نماز قائم کرو"۔

اور ایک جگہ آیا ہے:

قَدْ أَفْلَحَ مَن تَزَكَّىٰ ۔ وَذَكَرَ اسْمَ رَبِّهِ فَصَلَّىٰ ۔ (الاعلیٰ:14-15)

کامیاب ہوا جس نے اپنے کو پاک کیا۔ اور اپنے رب کا نام لیا، پھر نماز پڑھی۔

حدیث شریف میں آیا ہے کہ نماز اللہ کا ذکر کرنے اس کی پاکی اور بڑائی بیان کرنے اور قرآن پڑھنے کا نام ہے، اس لئے نماز کو مومنین کی معراج کہا گیا ہے۔ نماز گویا خدا کے ساتھ انسان کا مکالمہ ہے۔ نماز ایک دعا ہے جس میں بندہ اپنے رب کی مدد طلب کرتا ہے اور صراط مستقیم پر گامزن رہنے کی دعا کرتا ہے۔ سورہ فاتحہ کے فضائل میں ہے کہ بندہ جب نماز میں سورہ فاتحہ پڑھتا ہے تو اللہ رب العزت اس کے ہر جملہ کا جواب مرحمت فرماتے ہیں۔ گویا وہ خدا کے سامنے کھڑا ہو کر اپنی عرض داشت رکھتا ہے اور خدا کے حضور سے اس کو فوراً جواب ملتا ہے

نماز سراپا دعا ہے۔ اور دعا کی بابت حدیث شریف میں آیا ہے کہ۔ الدعاء مخ العبادة۔ (ابو داؤد) (دعا عبادت کا مغز ہے) یعنی نماز کی اصل روح دعا ہے۔ اپنے تمام کاموں اور خاص طور پر ہدایت کے لئے دعا۔ اس یقین اور امید کے ساتھ کہ ہماری دعا رب العزت ضرور قبول فرمائے گا۔ وہ جو چاہتا ہے وہ ہر حال میں پورا ہوتا ہے اور جو نہ کرنا چاہے ساری کائنات مل کر بھی اس کو نہیں کر سکتی۔ اس لئے جو مانگنا ہے اسی سے مانگو چاہے اس دنیا میں سیدھے راستہ پر چلنے کی ہدایت ہو یا دنیا کی کوئی دنیاوی ضرورت، سب اس کے دربار میں پیش کرنا چاہیے' اور اس امید پر پیش کرنا چاہئے کہ انشاء اللہ ہم نے جو مانگا ہے وہ ہمارا رب ہم کو ضرور عطا فرمائے گا، چونکہ خود اسی کا فرمان ہے کہ جو کچھ تم نے مانگا ہم نے تم کو عطا کیا (ابراہیم:34)۔

نماز دراصل زندگی کا مختصر نمونہ ہے۔ انسان کو اپنی پوری زندگی کو اس نمونہ پر ڈھالنا چاہیے جو وہ روزانہ پانچ مرتبہ ادا کرتا ہے۔ جس طرح نماز کے تمام حرکات و سکنات اور اعمال ایک خاص نظام کے تحت انجام دئے جاتے ہیں کہ کب کھڑا ہونا ہے، کب بیٹھنا ہے، کب جھکنا ہے، کب کیا کرنا ہے اور کب کیا مانگنا ہے ٹھیک اسی طرح انسان کی زندگی ہونی چاہئے۔

نماز کا ایک دوسرا پہلو یہ ہے کہ نماز خدا کا ذکر ہے۔ خدا نے نماز کا ایک مقصد یہ بتایا ہے کہ اقم الصلوۃ لذکری (طہ:14) (میرے ذکر کے لیے نماز قائم کرو) قرآن میں متعدد جگہ نماز کو ذکر سے تعبیر کیا گیا ہے۔ ایک آیت میں ہے:

يَا أَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوا إِذَا نُودِيَ لِلصَّلَاةِ مِن يَوْمِ الْجُمُعَةِ فَاسْعَوْا إِلَىٰ ذِكْرِ اللّٰهِ (الجمعہ:9)

اے ایمان والو جب جمعہ کے دن نماز کے لیے پکارا جائے تو اللہ کے ذکر کی طرف تیزی سے چلو۔

نماز ذکر الٰہی ہے اور نماز کی مشروعیت جن اوقات میں ہے ان میں بھی یہ پہلو محسوس ہوتا ہے کہ عین وقت غفلت میں نماز

انسان کو خدا کی طرف متوجہ کر دیتی ہے۔ لذت خواب سحر کی غفلت میں فجر کی نماز، دوپہر ڈھلے تھکان اور غفلت میں ظہر کی نماز، بازار اور کاروبار حیات کی مصروف گھڑیوں میں عصر کی نماز، رات کے آغاز میں مغرب اور جب نیند کا خمار پلکوں کو بوجھل کرنے لگے اس وقت عشاء کی نماز۔ گویا ذکر الہی جو ہر وقت مطلوب ہے اس کا ایک طریقہ نماز ہے، نماز ہمیں عبدیت کا احساس دلاتی ہے اور اس بات کی یاددہانی کراتی ہے کہ ہم رب العالمین کے بندے ہیں۔ ہمیں اپنی زندگی میں اس کی اطاعت کرنی ہے۔

6.2.3 نماز کی فرضیت

نماز اسلام میں بنیادی فریضہ ہے اور یہ فریضہ اسلام سے پہلے کی امتوں پر بھی رہا ہے۔ توراۃ، زبور اور انجیل میں نماز پڑھنے کا تذکرہ ہے اور قرآن مجید سے تصدیق ہوتی ہے کہ پہلے انبیاء کی امتوں پر بھی نماز فرض تھی حضرت ابراہیمؑ کی دعا ہے کہ اے پروردگار مجھ کو اور میری اولاد میں سے لوگوں کو نماز قائم کرنے والا بنا (ابراہیم 65) حضرت اسماعیل کے بارے میں ہے کہ "وہ اپنے اہل وعیال کو نماز کا حکم دیتے تھے" (مریم۔55) حضرت لقمان نے اپنے بیٹے کو نصیحت کی "اے میرے بیٹے نماز قائم کر" (لقمان 17)۔ اور بہت سے انبیاء کے سلسلے میں نماز پڑھنے کا تذکرہ آیا ہے۔ احادیث وروایات سے اندازہ ہوتا ہے کہ رسول اللہؐ اور صحابہ کرام بالکل شروع سے ہی نماز پڑھا کرتے تھے۔ نماز پڑھنے کا طریقہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو حضرت جبرئیل نے سکھایا تھا۔ (ابوداؤد) پانچ وقت کی فرض نمازوں کی باضابطہ فرضیت ہجرت نبویؐ سے دو یا تین سال قبل واقعہ معراج کے موقع پر ہوئی تھی جیسا کہ ابوداؤد اور ترمذی کی روایات میں واضح طور پر مذکور ہے۔

6.2.4 نماز کے مصالح وفوائد

نماز اسلام کی اہم ترین عبادت ہے۔ یہ ہر بالغ وعاقل مسلمان پر دن ورات میں پانچ مرتبہ فرض ہے۔ نماز کے اوقات مقرر ہیں اور ان ہی اوقات مقررہ پر نماز کا پڑھنا ضروری ہے۔ نماز کسی بھی حالت میں معاف نہیں ہے، اگر انسان کھڑے ہونے کی طاقت نہ رکھتا ہو تو بیٹھ کر پڑھے، یہ بھی قدرت نہ ہو تو لیٹ کر پڑھے۔ اگر وضو پر قدرت نہ ہو تو تیمم کرکے پڑھے۔ لیکن نماز کسی بھی حالت میں معاف نہیں ہے۔ ہر حالت میں اسے ادا کرنا ضروری ہے۔

نماز کی اتنی اہمیت اور فضیلت دراصل اس لیے ہے کہ نماز وہ بنیادی رکن ہے جو انسان کی یومیہ زندگی کی عبادت ہے، اس لیے نماز کو دین کا ستون کہا گیا ہے۔ نماز عبدیت کا کامل اظہار ہے اور ایک مسلمان کی زندگی کو بقیہ لوگوں سے ممتاز کرتی ہے۔ نماز دین کا عملی اظہار ہے۔ نماز تذکیر الہی اور استحضار حکم خداوندی کا سب سے معتبر ذریعہ ہے۔ نماز سے انسانوں کے لئے دنیاوی فائدے بھی بہت ہیں۔ نماز سے انسان کی زندگی با معنی ہو جاتی ہے۔ نماز ایک تربیتی کورس ہے جو زندگی کو صحیح رخ پر ڈھال دیتا ہے۔ نماز کے چند اہم فوائد حسب ذیل ہیں:

6.2.5 پابندی وقت

نماز پابندی وقت کے ساتھ فرض کی گئی ہے۔ قرآن مجید میں ہے:

إِنَّ الصَّلاَةَ كَانَتْ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ كِتَاباً مَّوْقُوتاً (النساء:103)

"بے شک نماز اہل ایمان پر مقرر وقتوں کے ساتھ فرض ہے"۔

ایک جگہ آیا ہے:

أَقِمِ الصَّلاَةَ لِدُلُوكِ الشَّمْسِ إِلَى غَسَقِ اللَّيْلِ وَقُرْآنَ الْفَجْرِ (بنی اسرائیل:78)

"نماز قائم کرو سورج کے زوال سے لے کر رات کی تاریکی تک اور پڑھنا قرآن کا فجر کے وقت"۔

ایک آیت میں ہے:

حَافِظُواْ عَلَى الصَّلَوَاتِ والصَّلاَةِ الْوُسْطَى (البقرہ:238)

"پابندی کرو نمازوں کی اور پابندی کرو بیچ کی نماز کی"۔

تین نمازوں کا تذکرہ قرآن مجید میں وقت کی صراحت کے ساتھ موجود ہے۔

مِن قَبْلِ صَلاَةِ الْفَجْرِ وَحِينَ تَضَعُونَ ثِيَابَكُم مِّنَ الظَّهِيرَةِ وَمِن بَعْدِ صَلاَةِ الْعِشَاء ثَلاَثُ عَوْرَاتٍ لَّكُمْ (النور:58)

"نماز فجر سے پہلے اور جس وقت تم گرمی کی وجہ سے اپنے کپڑے اتار دیتے ہو اور عشاء کی نماز کے بعد، یہی تین وقت تمہارے لیے پردے کے ہیں"۔

نمازوں کو وقت پر پڑھنے، نمازوں کی حفاظت کرنے اور بیچ کی نماز کو اپنے وقت پر ادا کرنے سے انسان کے اندر وقت کی تنظیم کا عملی احساس پیدا ہوتا ہے اور وہ اپنے کاموں کو اس طرح منظم کرتا ہے کہ نماز کے لئے مقررہ وقت اس کے پاس بالکل فارغ ہو۔ نماز انسان کو وقت کی صحیح قدر و قیمت سے آگاہ کرتی ہے اور کاموں کے لئے اچھے آغاز کا سلسلہ بنتی ہے۔

6.2.6 فرض شناسی

نماز انسان کے اندر اپنے فرائض کو انجام دینے کا جذبہ بھی پیدا کرتی ہے۔ انسان کے اوپر سب سے بڑا فرض نماز ہے۔ جو شخص نماز میں غفلت کرے گا وہ کسی بھی ذمہ داری میں کبھی بھی غفلت یا بے پروائی کر سکتا ہے۔ اور جو شخص نماز وقت پر ادا کرے گا، اس کی تربیت اس طرح ہو گی کہ وہ تمام کاموں کو ان کی مطلوبہ ترجیح کے مطابق صحیح طرح انجام دے سکے۔ نماز میں کاہلی یا سستی کرنے والوں پر قرآن وحدیث میں سخت وعیدیں آئی ہیں۔ مثلاً قرآن مجید میں ایک جگہ منافقین کی علامت بتائی گئی ہے:

وَإِذَا قَامُواْ إِلَى الصَّلاَةِ قَامُواْ كُسَالَى (النساء:142)

"اور جب وہ نماز پڑھنے کو اٹھتے ہیں تو کسل مندی سے اٹھتے ہیں"۔

قرآن مجید میں ایک جگہ فرمایا ہے:

وَإِنَّهَا لَكَبِيرَةٌ إِلاَّ عَلَى الْخَاشِعِينَ (البقرہ:45)

"اور نماز بھاری چیز ہے مگر ان پر جو خشوع و خضوع کرتے ہیں"۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ نماز ایک بھاری ذمہ داری ہے، اس کو وہی شخص ادا کرے گا جس کو اپنی ذمہ داری کے ادا کرنے کا احساس اعلی درجہ کا ہو گا، گویا نماز انسان کو فرض شناس بناتی ہے۔

6.2.7 مشکل اوقات میں ذریعہ امداد الٰہی

انسان کے اوپر بسا اوقات مشکلات آجاتی ہیں اور بعض لوگ ان مشکلات میں پریشان بھی ہو جاتے ہیں۔ نماز ایسے لوگوں کے لیے اللہ کی طرف سے انعام اور عطیہ ہے۔ قرآن مجید میں اللہ تعالی نے فرمایا ہے:

وَاسْتَعِيْنُواْ بِالصَّبْرِ وَالصَّلاَةِ وَإِنَّهَا لَكَبِيْرَةٌ إِلاَّ عَلَى الْخَاشِعِيْنَ (البقرہ:45)

"اور مدد طلب کرو صبر اور نماز کے ذریعے اور بے شک وہ بھاری ہے مگر ان کے لئے جو خشوع کرتے ہیں"۔

یعنی نماز اور صبر اللہ تعالی کی مدد کا ذریعہ ہیں۔ ہر وقت کی نماز میں ہر شخص اس کا اثبات کرتا ہے کہ ہم صرف خدا سے ہی مدد مانگتے ہیں۔ مذکورہ آیت کی تفسیر میں ابن کثیر اور دوسرے بہت سے مفسرین نے ذکر کیا ہے کہ مشکلات میں نماز ایک ذریعہ امداد الٰہی ہے۔ اللہ کے رسول پر جب کوئی مشکل پیش آتی تو آپؐ نماز پڑھا کرتے تھے، قرآن مجید میں ایک اور جگہ انسان کی بشری کمزوریوں یعنی مصائب پر گھبرا جانے کا ذکر کرتے ہوئے بتایا گیا ہے کہ ان مواقع پر نماز پڑھنے والے ثابت قدم رہتے ہیں۔ (المعارج:22)

6.2.8 برائیوں کے خلاف ڈھال

نماز برائیوں اور منکرات کے مقابلے میں انسان کے لیے ایک ڈھال کا کام کرتی ہے۔ قرآن پاک میں ہے:

وَأَقِمِ الصَّلَاةَ إِنَّ الصَّلَاةَ تَنْهَى عَنِ الْفَحْشَاء وَالْمُنكَرِ (العنکبوت:45)

"اور نماز قائم کرو بے شک نماز فحش کاموں اور بری باتوں سے روکتی ہے"۔

نماز کے ذریعہ انسان کے اندر یہ صفت پیدا ہوتی ہے کہ وہ بے حیائی کے کاموں اور منکرات سے رکتا ہے۔ برے کاموں کے خلاف اس کے شعور و وجدان میں ایسا ملکہ پیدا ہو جاتا ہے کہ بدی کے راستہ پر اس کے قدم لرزاں و ترساں رہتے ہیں۔ نماز انسان کے اندر نہ صرف برائیوں سے رکے رہنے کا جذبہ پیدا کرتی ہے بلکہ برائیوں کو اچھائیوں سے بدل دیتی ہے اور گناہوں کا کفارہ بن جاتی ہے۔

6.2.9 نیکیوں کی قبولیت کا ذریعہ

نماز ایک ایسی عبادت ہے جو نہ صرف خود اہم عبادت ہے بلکہ دوسری عبادات کی قبولیت کا ذریعہ بھی ہے۔ قرآن میں ہے:

وَمَا مَنَعَهُمْ أَن تُقْبَلَ مِنْهُمْ نَفَقَاتُهُمْ إِلاَّ أَنَّهُمْ كَفَرُواْ بِاللّهِ وَبِرَسُولِهِ وَلاَ يَأْتُونَ الصَّلاَةَ إِلاَّ وَهُمْ كُسَالَى وَلاَ يُنفِقُونَ إِلاَّ وَهُمْ كَارِهُونَ (التوبہ:54)

"ان کی خیر و خیرات کے مقبول ہونے سے اور کوئی چیز بجز اس کے مانع نہیں ہوئی کہ انہوں نے اللہ کے ساتھ اور اس کے رسول کے ساتھ شرک کیا اور نماز نہیں پڑھتے مگر کاہلی سے اور نیک کام میں خرچ نہیں کرتے مگر گرانی سے"۔

نماز کے اور بھی بہت سے فوائد و مصالح ہیں۔ نماز انسان کو صحت مند بناتی ہے۔ اس کو سحر خیز بناتی ہے، انسان کے اندر اچھے خصائل پیدا کرتی ہے، عبدیت کا احساس زندہ رکھتی ہے۔ اور نماز قرب خداوندی کا ذریعہ ہے جو انسان کا رشتہ اپنے رب کے ساتھ استوار کرتی ہے اور آخرت کی مشکل ترین منزل میں انسان کے لیے سب سے اہم مددگار ہوتی ہے۔

6.3 طہارت جسمانی

نماز میں بندہ خدائے ذوالجلال کے حضور کھڑا ہوتا ہے۔ خدا کے دربار میں حاضری کے کچھ آداب و شرائط ہیں۔ نماز سے پہلے ان کی تکمیل ضروری ہے۔ اگر وہ شرائط پوری نہیں ہوں گی تو نماز ہی ادا نہیں ہوگی۔ ان شرائط میں سب سے اہم چیز طہارت ہے۔ طہارت مجموعی طور پر اسلام میں مطلوب ہے، لباس کی طہارت، جگہ کی طہارت، بدن کی طہارت اور قلب و نظر کی طہارت، لیکن ظاہری طہارت چونکہ آنکھوں سے دیکھی جاسکتی ہے اس لئے اس کو نماز کے بنیادی ارکان میں شامل کیا گیا ہے۔

طہارت کا مطلب ہے بدن کا نجاستون سے پاک ہونا۔ نجاست دو طرح کی ہوتی ہے۔ ایک نجاست حقیقی دوسری نجاست حکمی۔ نجاست حقیقی وہ ناپاکی ہے جو آنکھوں سے نظر آتی ہے اور نجاست حکمی وہ ناپاکی ہے جو آنکھوں سے نظر نہیں آتی لیکن شریعت نے اس کو نجاست قرار دیا ہے۔ یعنی حالت جنابت یا حیض یا نفاس والی عورت۔ نماز سے قبل دونوں طرح کی نجاست سے بدن کا پاک ہونا ضروری ہے۔

ناپاکی کے درجات کے اعتبار سے بھی اس کی دو قسمیں کی جاتی ہیں۔ ایک حدث اصغر دوسری حدث اکبر۔ حدث اصغر وہ ناپاکی ہے جس سے پاک ہونے کے لئے وضو کیا جاتا ہے۔ اور حدث اکبر وہ ناپاکی ہے جو وضو سے دور نہیں ہوتی بلکہ اس کے لئے غسل کرنا ضروری ہے۔ حدث اکبر مردوں اور عورتوں کے لئے حالت جنابت ہے اسی طرح عورتوں کے لئے حیض و نفاس سے پاک ہونے کے لئے بھی غسل کرنا ضروری ہے۔

حدث اصغر ہو تو اس کے لئے وضو کرنا ضروری ہے۔ قرآن مجید میں نماز سے قبل وضو کرنے کا حکم واضح الفاظ میں دیا گیا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُواْ إِذَا قُمْتُمْ إِلَى الصَّلاةِ فاغْسِلُواْ وُجُوهَكُمْ وَأَيْدِيَكُمْ إِلَى الْمَرَافِقِ وَامْسَحُواْ بِرُؤُوسِكُمْ وَأَرْجُلَكُمْ إِلَى الْكَعْبَيْنِ (المائدہ:6)

”اے ایمان والو، جب تم نماز کے لئے اٹھو تو اپنے چہروں اور اپنے ہاتھوں کو کہنیوں تک دھوؤ اور اپنے سروں کا مسح کرو اور اپنے پیروں کو ٹخنوں تک دھوؤ۔“

حدث اکبر سے پاکی کے لئے غسل ضروری ہونے کا حکم بھی قرآن مجید میں واضح طور پر موجود ہے۔

وَإِن كُنتُمْ جُنُباً فَاطَّهَّرُواْ (المائدہ:6)

”اور اگر تم حالت جنابت میں ہو تو غسل کرلو“۔

حکمی نجاست کے علاوہ اگر بدن پر کوئی حقیقی نجاست ہو چاہے غلیظہ (گاڑھی) جیسے پاخانہ، پیشاب وغیرہ ہو یا خفیفہ (ہلکی) ہو جیسے حلال جانوروں کا پیشاب وغیرہ تو اس کا بدن سے دھونا، اور اگر کپڑوں پر ہو تو کپڑے کا دھونا بھی ضروری ہے۔ جسم یا کپڑے کی نجاست بغیر پانی کے پاک نہیں ہو سکتی۔ اس لئے پانی کے ذریعہ اس نجاست کا دھونا یا زائل کرنا ضروری ہے۔

نماز کے لئے وضو شرط ہے، وضو کا طریقہ اوپر مذکور آیت میں موجود ہے، اس میں وضو کے چار فرائض بیان ہوئے ہیں، وہ یہ ہیں: 1. پورا چہرہ دھونا، 2. دونوں ہاتھوں کو کہنیوں تک دھونا، 3. سر کا مسح کرنا، 4. دونوں پیروں کو ٹخنوں تک دھونا۔ ان کے علاوہ وضو میں 15 سنتیں ہیں۔

1. وضو کی نیت کرنا، 2. بسم اللہ کہنا، 3. دونوں ہاتھوں کا گٹوں تک دھونا، 4. کلی کرنا، 5. مسواک کرنا، 6. ناک میں پانی ڈالنا، 7. داڑھی میں خلال کرنا، 8. ہاتھ پاؤں کی انگلیوں میں خلال کرنا، 9. ہر عضو کو تین تین بار دھونا، 10. پورے سر کا مسح کرنا، 11. وضو میں بیان کردہ ترتیب کو قائم رکھنا، 12. دونوں کانوں کا مسح کرنا 13. تمام اعضاء کو پے در پے دھونا یعنی ایک عضو کے خشک ہونے سے پہلے دوسرا عضو دھو لیا جائے، 14. پہلے دایاں پھر بایاں عضو دھونا، 15. ہر عضو کو دھوتے وقت ملنا۔

وضو کرنے کے بعد انسان اللہ کے دربار میں حاضری کے لائق ہو جاتا ہے، لیکن اگر وضو ٹوٹ جائے تو پھر دوبارہ وضو کرنا ضروری ہے۔ وضو ٹوٹنے کے اسباب میں پاخانہ یا پیشاب کرنا یا ریح خارج ہونا، خون بہنا، چت لیٹ کر سونا، قے کرنا یا بحالت نماز زور سے ہنسنا شامل ہیں۔ اگر ان میں سے کوئی عمل ہو گیا تو وضو ٹوٹ گیا، اب اس کو نماز کے لئے دوبارہ وضو کرنا ضروری ہے۔ وضو نماز کے لئے اتنا ضروری ہے کہ اگر عین حالت نماز میں وضو ٹوٹ جائے تو اس کے ساتھ ہی نماز بھی ٹوٹ جاتی ہے۔ اس لئے وضو کر کے اس نماز کا دوبارہ پڑھنا ضروری ہے۔

جن باتوں سے وضو نہیں ٹوٹتا لیکن کسی کو شک ہو سکتا ہے کہ شاید ٹوٹ گیا ان میں سے بیٹھے بیٹھے جھپکی آجانا، بحالت نماز نیند کا جھونکا آجانا، بچے کو دودھ پلانا، آئینہ دیکھنا، کھانا کھلانا وغیرہ ایسے امور ہیں جن سے وضو نہیں ٹوٹتا، ان سے فارغ ہو کر عبادت کی جا سکتی ہے، نیا وضو کرنے کی ضرورت نہیں۔ اور ایک وضو سے کسی وقت کی نماز پڑھی جا سکتی ہے۔

وضو طہارت کا آسان اور مختصر ذریعہ ہے۔ اگر حدث اکبر نہ ہو تو وہ اعضا جو نماز میں سامنے ہوتے ہیں، ان کے دھونے کا نام وضو ہے۔ وضو دراصل دربار خداوندی میں حاضری کی تیاری ہے، اللہ کے دربار میں پاک فرشتے ہوتے ہیں ان کے جلو میں اگر کوئی انسان خدا کے دربار میں حاضری دے رہا ہے تو اس کو ظاہری طور پر پاک فرشتوں سے کچھ مشابہت اختیار کرنا ضروری ہے۔ اس لئے نماز کے لئے وضو کو فرض قرار دیا گیا تاکہ انسان اس احکم الحاکمین کے دربار میں جائے تو تیاری کر کے جائے۔ اس کا بدن پاک ہو، کپڑے پاک ہوں، پاک جگہ کھڑا ہو، اور ہاتھ، منہ اور پیروں کو دھو کر جائے۔

طہارت کے لیے وضو اور غسل کے قائم مقام تیمم ہے۔ اگر پانی دستیاب نہ ہو یا کسی بیماری یا عذر کی وجہ سے پانی کے استعمال پر قدرت نہ ہو، تو ایسی حالت میں طہارت حاصل کرنے کے لیے تیمم ضروری ہے۔ تیمم کے لفظی معنی ارادہ کرنے کے ہیں۔ اور قرآن مجید میں تیمم کا حکم ان الفاظ میں آیا ہے۔

وَإِن كُنتُم مَّرْضَى أَوْ عَلَى سَفَرٍ أَوْ جَاء أَحَدٌ مِّنكُم مِّن الْغَآئِطِ أَوْ لاَمَسْتُمُ النِّسَاء فَلَمْ تَجِدُواْ مَاء فَتَيَمَّمُواْ صَعِيْداً طَيِّباً فَامْسَحُواْ بِوُجُوهِكُمْ وَأَيْدِيْكُمْ إِنَّ اللّهَ كَانَ عَفُوّاً غَفُوراً (النساء: 43)

(اور اگر تم بیمار ہو یا سفر میں ہو یا تم میں سے کوئی اپنی ضرورت پوری کر کے آیا یا عورتوں سے صحبت کی ہو اور اس حالت میں تم کو پانی نہ ملے تو پھر پاک مٹی سے تیمم کر لیا کرو۔ (اس کا طریقہ یہ ہے) اپنے ہاتھوں سے اپنے چہرے اور دونوں ہاتھوں کو مل لو۔ بلاشبہ اللہ تعالیٰ معاف کرنے والا اور مغفرت کرنے والا ہے۔)

تیمم میں تین فرائض ہیں۔ 1. نیت کرنا، 2. دونوں ہاتھوں کو پاک مٹی پر مار کر اچھی طرح منہ پر پھیرنا اور 3. دونوں ہاتھوں کو مٹی پر مار کر دونوں ہاتھوں پر کہنیوں سمیت پھیرنا۔ تیمم مٹی یا مٹی کے قبیل کی کسی بھی چیز سے کیا جا سکتا ہے اور جن چیزوں سے وضو ٹوٹ جاتا ہے ان سے تیمم بھی ٹوٹ جاتا ہے، ساتھ ہی پانی پر قدرت حاصل ہو جانے سے بھی تیمم ٹوٹ جاتا ہے۔ وضو اور غسل دونوں کے تیمم کا طریقہ ایک ہے۔

6.4 اجتماعیت

اسلام ایک معاشرتی مذہب ہے۔ اسلام میں رہبانیت نہیں ہے۔ دنیا سے کٹ جانے، غاروں اور جنگلوں میں ذکر و فکر کے اندر زندگی گزارنے کو اسلام پسندیدگی کی نظر سے نہیں دیکھتا۔ اسلام ایک اچھے انسانی معاشرے کی تعمیر کرتا ہے، اس کے لئے لوگوں کا معاشرتی زندگی سے وابستہ رہنا اور معاشرہ کی فلاح و بہبود اور معاشرے میں اچھائیوں کے فروغ کے لئے ہمہ وقت فکر مند رہنا اسلام میں پسندیدہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام کا پورا نظام معاشرتی بنیادوں پر استوار ہے۔ نماز جو ایک عبادت ہے اور خدا اور بندے کے درمیان کا تعلق ہے اسلام نے اس کو بھی معاشرتی زندگی سے وابستہ کیا ہے۔

اسلام میں ذکر و فکر، تسبیح و تہلیل، آیات کائنات میں غور و فکر اور تنہائی میں اپنے رب کے حضور مناجات کو پسند کیا گیا ہے، لیکن فرض نمازوں کو جماعت کے ساتھ پڑھنے کا حکم دیا گیا ہے۔ ان نمازوں کے لئے باضابطہ ایک نظام اور ضابطہ بنایا گیا ہے، اور نمازوں کی اقامت کا حکم دیا گیا ہے۔ نماز پڑھنا اور نماز قائم کرنا دونوں میں جوہری نوعیت کا فرق ہے نماز کا قیام معاشرتی عمل ہے، اس لئے نمازوں کے لئے مساجد تعمیر کی جاتی ہیں، مساجد میں اذان و اقامت کا اہتمام کیا جاتا ہے اور باجماعت نماز ادا کی جاتی ہے۔ اسلام میں جماعت کے ساتھ نماز پڑھنے پر اتنا زور دیا گیا ہے کہ ایک مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میرا جی چاہتا ہے کہ نماز قائم کروں، ایک شخص کو امام بنا دوں اور پھر کچھ لوگوں کو لے کر جنگل جاؤں، وہاں سے لکڑیاں لاؤں اور ان لوگوں کے گھروں کو جلا دوں جو جماعت میں شریک نہیں ہوئے (بخاری)۔ ایک اور روایت میں جماعت کی فضیلت اس طرح آئی ہے کہ جماعت کے ساتھ نماز پڑھنے کا ثواب تنہا نماز پڑھنے کے مقابلے میں ستائیس گنا زیادہ ہے (بخاری)۔

حدیث شریف میں ایک جگہ آیا ہے کہ اپنی صفوں کو سیدھا اور برابر کرو، چونکہ صفوں کو سیدھا اور برابر کرنا اقامت صلوٰۃ کا جزء ہے (بخاری) ایک اور روایت میں آیا ہے کہ اگر کسی مقام پر تین آدمی ہوں اور جماعت کا اہتمام نہ ہوتا ہو تو شیطان ان پر قابو پا لیتا

ہے، اس لئے تم جماعت کا اہتمام کرو، کیونکہ بھیڑیا اسی بھیڑ کو کھاتا ہے جو گلے سے دور ہو (ابو داؤد)۔

اوپر مذکور روایات سے بھی نماز باجماعت کی فضیلت معلوم ہوتی ہے، اور اس کے علاوہ یہ بھی اشارہ ملتا ہے کہ نماز کا باجماعت ادا کرنا ہی دراصل اقامت صلوٰۃ ہے۔ تنہا نماز پڑھی جائے تو نماز ادا ہو جائے گی، لیکن نماز ایک اجتماعی عبادت ہے اس کے حقیقی فوائد اسی وقت حاصل ہوں گے جب وہ خدا اور رسول کے بتائے ہوئے طریقے کے مطابق باجماعت ادا کی جائے گی، تنہا پڑھنے سے فرض کی تکمیل تو شاید ہو جائے گی لیکن اجتماعیت کے فوائد حاصل نہیں ہوں گے۔

نماز کی باجماعت تنظیم سے دراصل ایک پورا معاشرہ وجود میں آتا ہے، مؤذن کی اذان پر نماز کی تیاری شروع کی جاتی ہے، مکبر کی تکبیر پر لوگ اپنی صفوں کو درست کرنے لگتے ہیں، امام کے تکبیر تحریمہ کہنے پر نماز کی نیت باندھ لیتے ہیں اور امام کے اتباع میں ارکان نماز ادا کرکے اپنے دائیں بائیں والوں کو سلامتی کی دعاء دیتے ہوئے نماز سے باہر آجاتے ہیں۔ معاشرتی زندگی میں نظم وضبط کا جو نمونہ نماز باجماعت کی شکل میں سامنے آتا ہے وہ بے مثال ہے۔ اگر اس کی روح اس معاشرے میں بیدار ہو جائے تو کسی بھی معاشرے کو وہ سربلندیاں یقیناً حاصل ہوں گی جو اس طریقہ پر عمل کرکے عربوں کو حاصل ہوئی تھیں۔

معاشرتی ضروریات اور تقاضوں کا اسلام نے نماز کے سلسلے میں بھی پورا اہتمام کیا ہے۔ اسی لئے جماعت کو واجب تو قرار دیا۔ لیکن اگر مرد اور عورت دونوں کے لئے نماز باجماعت ہوتی تو اس سے معاشرتی زندگی میں بعض دوسرے مسائل کے پیدا ہونے کا اندیشہ تھا، اس لئے مردوں کے لئے جماعت کا اہتمام کرنا واجب قرار دیا ہے اور عورتوں کے لئے اس کی اجازت ہے کہ اگر وہ نمازیں مسجد میں جاکر ادا کرنا چاہیں تو کرسکتی ہیں، ورنہ وہ گھر میں ادا کریں ان کے اجر وثواب میں کوئی کمی نہیں ہوگی۔

جماعت کے ساتھ مسجد میں نماز ادا کرنا پورے معاشرے کو باہم متحد کر دیتا ہے لوگ روزانہ پانچ مرتبہ ملتے ہیں، مسجد جاتے ہوئے اور واپس آتے ہوئے محلے کے احوال سے واقف ہو جاتے ہیں۔ اگر کوئی ضرورت مند ہو یا بیمار ہو تو اس کی اطلاع ہو جاتی ہے، ایک دوسرے کی غمگساری کا جذبہ بیدار ہوتا ہے۔ آپس میں اخوت اور محبت پیدا ہوتی ہے۔ لوگ اپنے پڑوسی سے واقف ہو جاتے ہیں۔ ورنہ آج کا متمدن معاشرہ چاہے انٹرنیٹ کے ذریعہ پوری دنیا سے جڑ گیا ہو لیکن پس دیوار کون بسا ہے اس کی خبر بھی نہیں رکھتا۔ ایسے معاشرے کے لئے نماز باجماعت کا اہتمام کسی تریاق سے کم نہیں۔

پانچ وقت کی نمازوں کے علاوہ ہفتہ میں ایک ایسی نماز یعنی جمعہ ہے جو بڑے اہتمام کے ساتھ شہر کی بڑی مسجد یا اگر شہر بڑا ہو تو چند مساجد میں ادا کی جاتی ہے اور اس میں ایک تقریر یا خطبہ نماز کا حصہ ہے۔ خطبہ اس لئے رکھا گیا تھا کہ شہر کی سب سے ذمہ دار شخصیت اس موقعہ پر مسلمانوں کو ایسی نصیحت کرے جو ان کی معاشرتی زندگی کو مضبوط اور بہتر بنانے میں معاون ہو، جمعہ کا دن مسلم معاشرہ میں اجتماعیت کے مظاہرہ کا ایک اعلی نمونہ ہے۔ جمعہ کے علاوہ عیدین کی نماز بھی اسلام کے اجتماعیت پسند مزاج کی بڑی نمائندگی کرتی ہیں۔

6.5 کلیدی الفاظ

سراپا : ابتدا سے انتہا تک، مکمل

عبدیت : بندگی

رہبانیت : دنیا چھوڑنے والا، فقیر، جوگی

تکبیر تحریمہ : نماز کی نیت باندھتے وقت پہلی دفعہ ہاتھ اٹھا کر اللہ اکبر کہنا

6.6 اکتسابی نتائج

اس اکائی میں آپ نے درج ذیل نکات سیکھے:

- نماز اسلام کی پہلی عملی عبادت ہے جو انسان اپنے عمل سے ادا کرتا ہے دوسرے الفاظ میں نماز خالص بدنی عبادت ہے۔ نماز ایک دن اور رات میں پانچ مرتبہ فرض ہے اور یہ ایسی عبادت ہے جو کسی حالت میں معاف نہیں ہے۔ ہر بالغ اور عاقل مسلمان کے لئے نماز پڑھنا ضروری ہے۔ اور پابندی وقت کے ساتھ نماز پڑھنا ضروری ہے۔
- نماز دراصل عبادت کا اعلیٰ ترین مقام ہے، یہ خدا اور بندے کے درمیان ایک رابطہ اور وسیلہ ہے۔ تزکیہ وطہارت کا ذریعہ ہے اور خدا کا ذکر ہے۔
- نماز دراصل زندگی کا مختصر نمونہ ہے۔ انسان کو اپنی پوری زندگی کو اس نمونہ پر ڈھالنا چاہیے جو وہ روزانہ پانچ مرتبہ ادا کرتا ہے۔ جس طرح نماز کے تمام حرکات وسکنات اور اعمال ایک خاص نظام کے تحت انجام دئے جاتے ہیں کہ کب کھڑا ہونا ہے، کب بیٹھنا ہے، کب جھکنا ہے، کب کیا کرنا ہے اور کب کیا مانگنا ہے ٹھیک اسی طرح انسان کی زندگی ہونی چاہئے۔
- نماز کے لیے عربی زبان میں لفظ صلوۃ استعمال ہوتا ہے، اس کے معنی دعا کے آتے ہیں۔ اصطلاح میں ایک مخصوص عبادت کو جس میں قیام، رکوع، سجدہ اور تلاوت قرآن شامل ہے صلوۃ یا نماز کہتے ہیں۔ اسلام میں نماز کی بڑی اہمیت ہے۔ نماز کے اوپر پورا دین قائم ہے۔ حدیث میں نماز کو دین کا ستون کہا گیا ہے۔ نماز کی حقیقت یہ ہے کہ نماز خدا اور بندے کے درمیان مناجات اور تعلق ہے۔ اس لیے نماز کو معراج المومنین بھی کہا گیا ہے۔
- نماز انسان کو صحت مند بناتی ہے۔ اس کو سحر خیز بناتی ہے، انسان کے اندر اچھے خصائل پیدا کرتی ہے، عبدیت کا احساس زندہ رکھتی ہے۔ اور نماز قرب خداوندی کا ذریعہ ہے جو انسان کا رشتہ اپنے رب کے ساتھ استوار کرتی ہے اور آخرت کی مشکل ترین منزل میں انسان کے لیے سب سے اہم مددگار ہوتی ہے۔
- نماز انسانی معاشرہ میں اجتماعیت کی روح بیدار کرتی ہے۔ اور انسان کے اندر روحانی ارتقاء کی تکمیل کرتی ہے۔ نماز انسان کے لئے حیات کا مژدہ ہے اور ترک نماز موت ہے۔ نماز انسان کو زندگی کا مقصد عطا کرتی ہے اور اس کا رشتہ اس کے مالک کے ساتھ استوار کرتی ہے۔ اس لیے نماز ایسی عبادت ہے جو کسی حال میں معاف نہیں ہے اور جس کا پڑھنا ہر شخص پر فرض ہے۔
- چوبیس گھنٹے میں پانچ وقت کی فرض نمازوں کے علاوہ سنت ونوافل ہیں اور ان کے علاوہ بھی کچھ نمازیں ہیں۔ ایک جمعہ کی نماز ہے جو جمعہ کے دن ظہر کے وقت پڑھی جاتی ہے۔ اور دو نمازیں عید کی ہیں، ایک عید الفطر اور دوسری عید الاضحی۔ یہ نماز سال میں ایک ایک مرتبہ پڑھی جاتی ہیں۔ عیدین کی نماز کا وقت دن چڑھے سے لے کر زوال تک رہتا ہے اور یہ دونوں

نمازیں واجب ہیں۔

6.7 نمونہ امتحانی سوالات

6.7.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات

1. نماز کے لیے عربی زبان میں کون سا لفظ استعمال ہوتا ہے؟

(a).صوم (b).صلوٰۃ (c).فحشاء (d).حج

2. رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ نماز میری آنکھوں کی ہے؟

(a).ٹھنڈک (b).گرمی (c).برسات (d).سب صحیح

3. وضو میں کتنے فرائض ہیں؟

(a).چار (b).پندرہ (c).دس (d).آٹھ

4. وضو میں کتنی سنتیں ہیں؟

(a).پندرہ (b).بارہ (c).چار (d).تین

5. تیمم کے لفظی معنی کیا ہے؟

(a).ارداہ کرنا (b).ارادہ نہ کرنا (c).چھوڑ دینا (d).تمام غلط

6. تیمم میں کتنے فرائض ہیں؟

(a).تین (b).پانچ (c).سات (d).نو

7. نماز سراپا کیا ہے؟

(a).دعا (b).حج (c).زکوۃ (d).روزہ

8. نماز کتنی مرتبہ فرض ہے؟

(a).پانچ (b).سات (c).نو (d).گیارہ

9. نماز کس پر فرض ہے؟

(a).بالغ پر (b).عاقل پر (c).مسلمان پر (d).سب صحیح

10. نماز کے لیے کن شرائط کا مکمل ہونا ضروری ہے؟

(a).لباس کی طہارت (b).بدن کی طہارت (c).جگہ کی طہارت (d).سب صحیح

6.7.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات

1. اسلام میں نماز کی کیا اہمیت ہے؟ بیان کیجیے۔
2. نماز کی فرضیت کے متعلق نوٹ لکھیے۔
3. نماز کے مصالح و فوائد پر مضمون لکھیے۔
4. نماز کے روحانی فوائد کیا ہیں؟ نوٹ لکھیے۔
5. نماز کے سلسلے میں وقت کی پابندی کی اہمیت واضح کیجیے۔

6.7.3 طویل جوابات کے حامل سوالات

1. اجتماعیت پر تفصیلی مضمون تحریر کیجیے۔
2. حقیقت نماز پر اپنی معلومات قلم بند کیجیے۔
3. نماز کے لیے طہارت کی اہمیت پر تفصیلی مضمون تحریر کیجیے۔

6.8 تجویز کردہ اکتسابی مواد

---

1. ارکان اربعہ : مولانا ابوالحسن علی ندوی
2. اسلامی عبادت : الطاف احمد اعظمی
3. سیرۃ النبی : سید سلیمان ندوی
4. خطبات : مولانا ابوالاعلی مودودی
5. اسلام ایک نظر میں : مولانا صدرالدین اصلاحی
6. اسلامی فقہ : مولانا مجیب اللہ ندوی

اکائی 7: روزہ

اکائی کے اجزا:

7.0 تمہید
7.1 مقاصد
7.2 تعارف اور مصالح
  7.2.1 شب قدر
  7.2.2 اعتکاف
  7.2.3 تراویح
  7.2.4 صدقۃ الفطر
7.3 روزہ کے مقاصد
  7.3.1 تقویٰ کی آبیاری
  7.3.2 صبر و برداشت کی مشق
  7.3.3 جھوٹ سے بچنے کی مشق
  7.3.4 ایمان و احتساب
  7.3.5 گناہوں کے مقابلے میں ڈھال
  7.3.6 ہمدردی اور غم خواری
7.4 طریقہ و احکام
7.5 اقسام
7.6 اکتسابی نتائج
7.7 نمونہ امتحانی سوالات

7.7.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات
7.7.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات
7.7.3 طویل جوابات کے حامل سوالات
7.8 تجویز کردہ اکتسابی مواد

7.0 تمہید

روزہ کے لئے عربی زبان میں لفظ صوم استعمال ہوتا ہے۔ صوم کے لفظی معنی رکنے کے آتے ہیں۔ روزے کی حالت میں انسان کھانے پینے سے رکا رہتا ہے اس لئے روزے کو صوم کہتے ہیں۔ روزہ اسلام کے پانچ بنیادی ارکان میں سے ایک ہے، اس کے لئے مخصوص احکام ہیں اور روزہ کے ساتھ کئی مصالح وابستہ ہیں۔ ذیل میں ان سب پر تفصیلی روشنی ڈالی جائے گی۔

7.1 مقاصد

اس اکائی کا مقصد اس اکائی کا مطالعہ کرنے کے بعد آپ اس بات سے واقف ہو جائیں گے کہ اسلام میں روزہ کی اہمیت اور مقام کیا ہے۔ روزہ کے احکام اور مصالح کیا ہیں، اور اس سے کیا فوائد حاصل ہوتے ہیں۔

7.2 تعارف اور مصالح

صوم عربی زبان کا لفظ ہے اس کا ترجمہ روزہ کیا جاتا ہے۔ لفظ صوم کے لغوی معنی رک جانے کے ہیں، اصطلاح شریعت میں صوم صبح صادق سے غروب آفتاب تک کھانے پینے اور جنسی تعلقات سے رکے رہنے کا نام ہے۔

اسلام کی نظر میں روزے کی بڑی اہمیت ہے۔ روزہ اسلام کے پانچ بنیادی ارکان میں سے ایک ہے۔ اور ہر شخص پر رمضان المبارک کے روزے رکھنا فرض ہے۔ اسلام سے قبل بھی روزے کی روایت تھی۔ عرب لوگ زمانہ جاہلیت میں بھی روزے رکھا کرتے تھے۔ اسلام نے ایک پورے مہینے یعنی رمضان المبارک کے روزے فرض کئے، اور اس طرح سال کے بارہ مہینوں میں سے ایک مہینہ کو عبادت الہی کے لئے مخصوص کر دیا، رمضان المبارک کو روزوں کے لئے مخصوص کرنے کی بنیادی وجہ تو یہ ہے کہ قرآن مجید رمضان المبارک کے مہینہ میں نازل ہوا، قرآن جو اسلام میں دستور حیات اور کتاب زندگی ہے جو انسانیت کے لئے رب العالمین کا آخری پیغام ہے وہ اس ماہ مبارک میں نازل ہوا۔ اس لئے اس مہینہ کو اور بھی بہت سی برکات سے وابستہ کیا گیا اور اس مہینہ کے روزے فرض کئے گئے، اس مہینہ میں عبادتوں کا اجر وثواب بڑھا دیا جاتا ہے۔ اور اس مہینہ میں ایک ایسی رات مقرر کی گئی ہے جو ایک ہزار مہینوں سے افضل ہے۔

قرآن مجید میں روزے کی فرضیت کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے۔

يَا أَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِيْنَ مِن قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ(البقرہ:183)

”اے ایمان والو، تم پر روزے فرض کیے گئے جس طرح تم سے اگلوں پر فرض کیے گئے تھے تا کہ تم پرہیز گار بنو“۔

ایک دوسری آیت میں ہے:

شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِىَ أُنزِلَ فِيْهِ الْقُرْآنُ هُدًى لِّلنَّاسِ وَبَيِّنَاتٍ مِّنَ الْهُدَى وَالْفُرْقَانِ فَمَن شَهِدَ مِنكُمُ الشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ(البقرہ:185)

”رمضان کا مہینہ جس میں قرآن اتارا گیا، ہدایت ہے لوگوں کے لیے اور کھلی نشانیاں راستہ کی اور حق اور باطل کے درمیان فیصلہ کرنے والا۔ پس تم میں سے جو کوئی اس مہینہ کو پائے، وہ اس کے روزے رکھے“۔

رمضان المبارک خاص عبادات کا مہینہ ہے۔ اس مہینہ کو عبادت سے خاص مناسبت ہے اور چونکہ انسانیت کا نسخہ کیمیا اسی ماہ مبارک میں نازل ہوا تھا اس لئے اس کے روزے فرض کئے گئے ہیں۔ اللہ تعالی اس مناسبت سے اپنے بندوں کی آسانی کے لئے سرکش شیاطین کو قید کر دیتا ہے تا کہ بندے آسانی کے ساتھ عبادت و بندگی میں مصروف رہ سکیں، رمضان المبارک کی فضیلت کو احادیث میں بھی مختلف انداز سے بیان کیا گیا ہے۔ ایک حدیث میں آیا ہے۔ حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول ﷺ نے فرمایا جو شخص ایمان اور احتساب کے ساتھ رمضان المبارک کے روزے رکھے اس کے پچھلے تمام گناہ معاف کر دیئے جاتے ہیں۔ اور جو شخص ایمان اور احتساب کے ساتھ قیام اللیل کرے اس کے بھی پچھلے گناہ معاف کر دئے جاتے ہیں اور جو شخص شب قدر میں ایمان اور احتساب کے ساتھ قیام کرے اس کے بھی پچھلے گناہ سب معاف کر دیئے جاتے ہیں۔ (بخاری و مسلم)

ایک اور روایت میں ہے کہ رسول ﷺ نے فرمایا۔ ابن آدم کے ہر عمل کا ثواب دس گنے سے سات سو گنے تک بڑھا دیا جاتا ہے۔ اللہ تعالی فرماتا ہے کہ روزے اس سے مستثنیٰ ہیں کیونکہ روزے میرے لئے ہیں اور میں ہی اس کا اجر دوں گا، انسان میری خاطر اپنا کھانا پینا اور اپنی خواہشات نفس کو چھوڑ دیتا ہے، روزہ دار کے لئے دو مسرتیں ہیں ایک مسرت افطار کے وقت اور دوسری اپنے رب سے ملاقات کے وقت اور روزہ دار کے منہ کی بو اللہ کے نزدیک مشک کی خوشبو سے بہتر ہے اور روزہ ڈھال ہے، جب تم میں سے کسی کا روزہ ہو تو وہ نہ فحش باتیں کرے، اور نہ شور و شغب اور دنگا فساد کرے اور اگر اسے کوئی گالی دے یا اس سے لڑے تو کہہ دے کہ میں روزے سے ہوں (بخاری و مسلم)

احادیث میں روزے کی فضیلت اور اس کے احکام بہت تفصیل سے بیان کئے گئے ہیں۔ احادیث کی کتابوں میں روزے کے بیان پر ایک مستقل حصہ ہوتا ہے جس میں ان روایات کو جمع کیا گیا ہے جو روزے کی فضیلت اور احکام سے متعلق ہیں۔

روزہ دراصل ایک تربیتی نصاب ہے جو انسان کے نفس و روح کی تطہیر اور اس کے اندر اچھے اخلاق پیدا کرنے کے لئے مشروع ہوا ہے۔ روزہ کا تعلق دینی فضائل سے بہت گہرا ہے۔ اسلام میں تقوی کی جو اہمیت ہے اس سے سب واقف ہیں۔ تقوی دراصل مذہب کی روح

ہے۔ روزہ کی فرضیت کا ایک مقصد قرآن مجید میں یہ بتایا گیا ہے کہ اس کے ذریعہ انسان کے اندر تقویٰ کی آبیاری ہوتی ہے۔ اسی طرح انسان کی زندگی میں صبر کی جو اہمیت ہے اس سے کوئی انکار نہیں کر سکتا، دنیاوی زندگی کے تمام کاموں میں صبر ایک روح کی مانند ہے، صبر کے ذریعہ انسان بڑے بڑے معرکے سر کر سکتا ہے۔ اور صبر کے ذریعہ اللہ تعالی کی مدد حاصل کی جاتی ہے، روزہ صبر کی صلاحیت کو پروان چڑھانے کا ایک بہترین ذریعہ ہے، حدیث شریف میں آیا ہے کہ روزہ نصف صبر ہے (ترمذی) گویا صبر کی تربیت کے لئے روزہ کی بڑی اہمیت ہے ایک حدیث میں آتا ہے جیسا کہ اوپر گذرا کہ جو شخص روزہ رکھے وہ کسی سے جھگڑا نہ کرے اور اگر کوئی دوسرا اس سے جھگڑا کرے تو کہہ دے کہ میں روزے سے ہوں۔ یعنی میں جھگڑا نہیں کروں گا، اس طرح روزہ انسان کے اندر صبر کی صلاحیت کو پروان چڑھاتا ہے اور تقویٰ کی آبیاری کرتا ہے۔

روزے کے مختلف مصالح یا تو قرآن و سنت میں واضح طور پر مذکور ہیں یا ان کی روشنی میں سمجھے جاسکتے ہیں۔ روزے کی ایک مصلحت یہ ہے کہ روزہ انبیاء کی اتباع میں رکھا جاتا ہے۔ پہلے کے انبیاء کی اتباع میں ان کی قومیں روزہ رکھتی تھیں۔ یہودی حضرت موسیٰؑ کی اتباع میں روزہ رکھتے تھے، عیسائی بھی حضرت عیسیٰؑ کی اتباع میں روزے رکھتے تھے، بلکہ حضرت موسیٰؑ کی اتباع میں تو عرب میں بھی روزہ رکھا جاتا تھا، یوم عاشوراء کا روزہ حضرت موسیٰؑ کی باقیات میں ہے۔ رمضان المبارک کے روزوں کی فرضیت سے پہلے سارے مسلمان عاشورہ کا روزہ رکھتے تھے اور ایک مرتبہ اللہ کے رسولؐ نے فرمایا کہ ہم موسی علیہ السلام کی اتباع کے یہودیوں کے مقابلے میں زیادہ حقدار ہیں۔ اس لئے آپ یوم عاشوراء کا روزہ تو رکھتے رہے اس کے ساتھ ایک روزہ اور رکھنے کا ارادہ فرمایا یعنی عاشورہ کے دن سے پہلے یا بعد ایک اور روزہ رکھ کر ان کو دو کرلینا۔ اسلام میں رمضان المبارک کے روزے بھی رسول ﷺ کی اتباع ہے۔ آپؐ نے بھی یہ روزے رکھے اور امت بھی ان روزوں کا اہتمام کرتی ہے۔

روزے کی ایک مصلحت یہ بھی ہے کہ اسلام کے ماننے والے اسلام کی سابقہ روایات یعنی گذشتہ انبیاء کی روایات سے بھی وابستہ ہو جائیں۔ چونکہ روزہ ایک ایسی عبادت ہے جو سابقہ امتوں پر بھی فرض تھی۔ اس لئے قرآن مجید میں روزے کی فرضیت کے ساتھ یہ بھی بتایا گیا کہ روزے تمہارے اوپر اسی طرح فرض ہیں جیسے تم سے پہلے کی امتوں پر فرض تھے، (البقرہ: 183)، اس طرح اسلام اور مسلمان دراصل اسی دین کا تسلسل قرار پاتے ہیں جو اول دن سے اللہ تعالی نے انسان کو عطا فرمایا تھا، قرآن میں متعدد جگہ اس کا تذکرہ بھی ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کوئی نئے رسول نہیں ہیں اور یہ کہ اسلام ہی اللہ کا دین ہے۔

روزہ کی ایک اہم مصلحت یہ ہے کہ رمضان کے روزے رب العالمین کی شکر گزاری کا ایک ذریعہ ہیں۔ اللہ تعالی نے قرآن نازل کر کے انسانوں پر جو عظیم احسان کیا ہے اس کی شکر گذاری کا تقاضا ہے کہ وہ ماہ مبارک جس میں یہ عظیم انعام انسانیت کو ملا اہتمام کے ساتھ گزارا جائے، وہ کتاب الٰہی، جس پر انسان کی دونوں جہانوں کی کامیابی و کامرانی کا انحصار ہے، اور جس نے انسان کو کفر و گمراہی کی ظلمتوں سے نکال کر ایمان اور ہدایت کی نورانی فضاء میں پہنچایا، وہ کتاب اسی ماہ مبارک میں نازل ہوئی، اس لئے شکر گذاری اور احسان شناسی کا تقاضا ہے کہ اس ماہ کو خاص اہتمام کے ساتھ گذارا جائے، قرآن مجید میں خود بھی اس طرف اشارہ کرتے ہوئے ارشاد ربانی ہے۔

وَلِتُكَبِّرُواْ اللّهَ عَلَى مَا هَدَاكُمْ وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ(البقرہ:185)

”اور (یہ رمضان کے روزے اس لئے فرض ہوئے) کہ تم اللہ کی بڑائی بیان کرو، کہ اس نے تم کو ہدایت دی اور تاکہ تم اس کا شکر ادا کرو“۔

رمضان المبارک کے ساتھ شکر و امتنان کے یہ جذبات تقاضا کرتے ہیں کہ اس دن کو اور اس ماہ کو ایک یادگار کے طور پر بنایا جائے۔ اس لئے اس پورے مہینہ کے روزے جذبہ شکر کا اظہار ہیں۔

رمضان المبارک کے روزوں کی ایک اہم مصلحت یہ ہے کہ سال کے گیارہ مہینوں میں مختلف دنیاوی مشغولیات و مسائل کی وجہ سے انسان کے قلب و روح پر ایک زنگ کی سی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔ اس کیفیت کو دور کرنے کے لئے ایک مہینہ کا تربیتی نصاب ہے جو رمضان المبارک کے روزوں کی شکل میں انجام دیا جاتا ہے۔ رمضان کے روزے رکھ کر انسان اپنی ایسی تربیت کرتا ہے جو باقی گیارہ مہینوں میں بھی اس کے لئے مہمیز اور انابت الی اللہ کے لئے محرک ثابت ہوتی ہے، ایک مہینہ کا تربیتی نصاب انسان کی زندگی کو پھر انہی خطوط پر گامزن کر دیتا ہے جن پر ان کا ثبات و قیام مطلوب ہے اور جو دنیا و آخرت میں کامیابی کی ضمانت ہیں۔

رمضان المبارک میں روزے رکھنے کے بہت سے سماجی مصالح اور فوائد بھی ہیں۔ روزے رکھ کر انسان کو بھوک پیاس کا ذاتی تجربہ ہو جاتا ہے اور وہ معاشرہ کے محروم و نادار لوگوں کی مجبوری کو اپنے تجربہ سے جان لیتا ہے، اس لئے اس کے اندر سماجی خدمت کا جذبہ پیدا ہو جاتا ہے۔ اس لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے رمضان المبارک کو 'شہر المواساۃ' یعنی غم خواری کا مہینہ بھی کہا ہے کہ اس مہینہ کے اندر انسانی ہمدردی اور غم خواری کے جذبات کی پرورش ہوتی ہے۔ رمضان میں روزہ کھلوانے کا بڑا ثواب ہے، اور صدقۃ الفطر نکال کر غریبوں کو دینا واجب ہے۔ ان سب کے ذریعہ انسان کو معاشرہ سے وابستہ کیا جاتا ہے۔

7.2.1 شب قدر

رمضان المبارک کے حوالے سے یہ بات ملحوظ رکھنی چاہیے کہ اس میں اللہ نے انسانوں پر جو احسانات کئے ہیں ان میں سے ایک شب قدر بھی ہے۔ یہ وہ رات ہے جس میں قرآن مجید نازل کیا گیا۔ اس رات کی فضیلت میں ایک پوری سورہ قرآن میں نازل ہوئی اور دوسرے مقامات پر بھی اس کی فضیلت بیان کی گئی ہے۔ اس کی فضیلت میں جو سورہ نازل ہوئی ہے اس کا ترجمہ یہ ہے:

”ہم نے اس کو اتارا ہے شب قدر میں، اور تم کیا جانو کہ شب قدر کیا ہے، شب قدر ہزار مہینوں سے بہتر ہے۔ فرشتے اور روح اس میں اپنے رب کی اجازت سے اترتے ہیں ہر حکم لے کر، وہ رات سراسر سلامتی ہے صبح نکلنے تک“۔ (سورہ القدر)

شب قدر کا تذکرہ سورہ دخان میں ان الفاظ میں آیا ہے۔

”قسم ہے اس واضح کتاب کی، ہم نے اس کو ایک برکت والی رات میں اتارا ہے، بے شک ہم آگاہ کرنے والے تھے، اس رات میں ہر حکمت والا معاملہ طے کیا جاتا ہے ہمارے حکم سے۔ بے شک ہم تھے بھیجنے والے تیرے رب کی رحمت سے، وہی سننے والا اور جاننے والا

ہے"۔ (الدخان:2-6)

یہ مبارک رات جیسا کہ قرآن مجید میں واضح طور پر آیا ہے ایک ہزار مہینوں سے افضل ہے۔ حدیث شریف میں بھی اس رات کی بڑی فضیلت وارد ہوئی ہے۔ یہ مبارک رات متعین طور پر تو نہیں بتائی گئی، لیکن اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ فرمایا ہے کہ آخری عشرہ کی طاق راتوں میں سے کوئی ایک رات شب قدر ہے۔ اس رات کو جاگنا، اللہ کی عبادت کرنا، اس کی پاکی اور بڑائی بیان کرنا بڑی فضیلت کا عمل ہے۔

حضرت عائشہؓ نے روایت کیا ہے کہ انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا کہ اگر مجھے لیلۃ القدر مل جائے تو میں کیا کروں، یعنی کیا مانگوں۔ حضور نے فرمایا کہ کہو اللہم انک عفو تحب العفو فاعف عنی (اے اللہ تو بے شک معاف کرنے والا ہے یہ اور پسند کرتا ہے معاف کرنے کو پس معاف فرمادے مجھ سے بھی)۔ حضرت ابو ہریرہؓ سے مروی ہے کہ انہوں نے رسول اللہؐ سے روایت بیان کی کہ جو شخص لیلۃ القدر میں ایمان کے ساتھ اور ثواب کی نیت سے عبادت کے لیے کھڑا ہو اس کے پچھلے تمام گناہ معاف کر دیے جاتے ہیں۔ (بخاری)

7.2.2 اعتکاف

اعتکاف بھی رمضان المبارک کے مہینہ سے وابستہ ہے۔ اعتکاف کا مطلب ہے اللہ کے لیے گوشہ گیر ہونا۔ رمضان المبارک کے آخری عشرہ کا اعتکاف مسجد کے اندر کرنا ضروری ہے۔ یہ اعتکاف سنت مؤکدہ علی الکفایہ ہے۔ یعنی بستی میں سے اگر علامتی طور پر کوئی ایک شخص بھی اعتکاف میں بیٹھ جائے تو سب کی طرف سے کفایت ہو جائے گی۔ ورنہ ہر شخص گناہگار ہو گا۔ اعتکاف کا مسجد میں کرنا ضروری ہے۔
اور اعتکاف کے دوران بیوی کے ساتھ ازدواجی تعلق منع ہے، قرآن مجید میں ہے:

وَلاَ تُبَاشِرُوهُنَّ وَأَنتُمْ عَاكِفُونَ فِي الْمَسَاجِدِ (البقرۃ:187)

"اور تم ان سے مباشرت مت کرو جب تم مساجد میں معتکف ہو"۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں روایات میں آتا ہے کہ آپؐ رمضان المبارک کے آخری عشرہ میں اعتکاف فرمایا کرتے تھے۔ بخاری و مسلم کی ایک روایت میں ہے کہ آپؐ نے ایک رمضان میں پورے رمضان کا اعتکاف کیا۔

اعتکاف دراصل خدا کے لیے اپنے آپ کو مکمل طور پر یکسو کر لینے کا نام ہے۔ جب انسان کاروبار حیات اور زندگی کی مشغولیتوں سے اپنے آپ کو کامل طور پر یکسو کر کے خدا کے لئے ایک گوشے میں بیٹھ جاتا ہے تو اللہ کی طرف سے اس کو خصوصی انعامات سے نوازا جاتا ہے۔ اس کا عبادت کرنا تو کار ثواب ہے ہی۔ اس کا سونا، اس کا جاگنا، اور اٹھنا بیٹھنا سب عبادت بن جاتا ہے۔ ابن ماجہ کی ایک روایت ہے کہ اعتکاف کرنے والے کے لئے اتنی نیکیاں لکھی جاتی ہیں جتنی کہ کرنے والے کے لئے لکھی جاتی ہیں۔ اعتکاف کے ذریعہ خدا اور بندے کا رشتہ مضبوط ہوتا ہے۔ اعتکاف انسان کو کاروبار حیات کی مشغولی میں ایسے لمحات میسر کرتا ہے جن میں انسان خالص اپنے رب کے حضور مناجات

اور دعا و استغفار کرتا ہے۔ تیز گام زندگانی کا سفر کبھی آرام نہ کرنے والا سفر ہے۔ انسان اپنے آپ کو جتنا اس میں مشغول کرے گا اتنا ہی مشغول ہوتا جائے گا۔ لیکن جو شخص اپنی مشغولیات کو موٴخر کر کے اپنے وقت کی تنظیم کر کے اور مصروفیات کے دام سے اپنے کو بچا کر خدا کے حضور سجدہ ریز ہوگا، اس کے لیے گوشہ گیر ہوگا اور اپنی دن ورات کی فکر آخرت کو بنائے گا، زندگی کی کشمکش اس سے ہار جائے گی اور وقت کی مفروضہ مصروفیات کی حقیقت اس کے سامنے کھل جائے گی۔ اس کو یہ بھی پتہ چلے گا کہ اس کے پاس وقت کی تنگی کی شکایت کا موقع نہیں ہے۔ دراصل اس نے وقت کی تنظیم نہیں کی تھی اس لیے زیادہ مصروفیت تھی۔ اگر وہ چاہے تو اس کو بقدر ضرورت اضافی وقت ملے گا۔ اعتکاف یہ موقع فراہم کرتا ہے کہ انسان اپنی واقعی مصروفیت اور غیر حقیقی مصروفیت میں فرق کر سکے۔ اعتکاف انسان کو یہ بھی بتائے گا کہ وقت کو مٹھی میں بند کر کے کیسے خرچ کیا جاتا ہے۔

اعتکاف کی تین قسمیں کی جاتی ہیں:۔ واجب، سنت اور مستحب۔ واجب اعتکاف نذر کا ہوتا ہے۔ کسی نے منت مانی کہ میر افلاں کام ہو جائے گا تو میں اعتکاف کروں گا۔ سنت اعتکاف رمضان کے آخری عشرے کا ہے۔ اور مستحب اعتکاف کبھی بھی کیا جا سکتا ہے۔ اعتکاف کے سلسلے میں امام ابو حنیفہ کی رائے یہ ہے کہ ایک دن سے کم کا اعتکاف جائز نہیں ہے۔ البتہ امام محمد اور دیگر ائمہ کے نزدیک ایک دن سے کم کا اعتکاف بھی کیا جا سکتا ہے۔

اعتکاف کے اندر مسجد سے نکلنا منع ہے۔ صرف فطری تقاضوں کے لئے باہر نکلا جا سکتا ہے۔ مثلاً پیشاب، پاخانہ وغیرہ یا جمعہ کی نماز اگر مسجد میں نہ ہوتی ہو تو اس کے لئے بھی باہر نکلا جا سکتا ہے۔ بلا ضرورت مسجد سے باہر آنے سے اعتکاف ٹوٹ جائے گا اور پھر اس کی قضا کرنی ہوگی۔ اگر رمضان کا اعتکاف ٹوٹ گیا تو قضاء کے وقت روزہ رکھنا ضروری ہے۔ البتہ جتنے دن کا اعتکاف ٹوٹا ہے اتنے دن کی ہی قضا ضروری ہے۔ اعتکاف جس طرح مردوں کے لئے ہے اسی طرح عورتوں کے لئے بھی ہے۔ عورتوں کا اعتکاف گھر میں ہوگا۔ مردوں کا مسجد میں۔ باقی احکام یکساں ہیں۔

7.2.3 تراویح

تراویح کی نماز رمضان المبارک کی راتوں میں پڑھی جاتی ہے۔ تراویح کا مطلب ہے وقفہ یا آرام۔ چوں کہ تراویح کی نماز میں درمیان میں وقفہ کیا جاتا ہے، اس لئے ان کو تراویح کہا جاتا ہے۔ تراویح پڑھنا سنت سے ثابت ہے۔ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے تراویح پڑھی تھی۔ حضرت عائشہؓ سے مروی ایک روایت بخاری شریف میں اور حدیث کی دوسری کتابوں میں ہے کہ ”رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک مرتبہ رات گئے گھر سے نکلے اور مسجد میں آکر نماز پڑھی اور آپ کے ساتھ صحابہ کی ایک جماعت نے بھی نماز پڑھی۔ جب صبح ہوئی تو صحابہ کے درمیان اس نماز کا تذکرہ ہوا۔ دوسرے دن بھی جب آپ نے رات کو نماز پڑھی تو اس کا ذکر بہت زیادہ ہوا۔ تیسرے دن نمازیوں کی تعداد بہت بڑھ گئی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم باہر تشریف نہیں لائے۔ فجر کی نماز کے بعد آپ نے لوگوں کو مخاطب کر کے فرمایا کہ تم لوگوں کی موجودگی مجھ سے مخفی نہیں تھی لیکن مجھے ڈر ہوا کہ کہیں یہ نماز تم پر فرض نہ ہو جائے اور پھر تم اس کو ادا نہ کر سکو۔ اس کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات ہوگئی۔ اور معاملہ ایسا ہی رہا۔ (بخاری ومسلم)

حضرت ابوذرؓ کی روایت میں یہ وضاحت ہے کہ یہ تین دن باجماعت نماز آخری عشرے میں پڑھی گئی تھی۔ (ابو داوٗد) اور بخاری کی ایک دوسری روایت میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ نے رمضان کے روزے فرض کئے ہیں اور اس کی راتوں میں قیام کو تطوع (نفل) قرار دیا ہے۔ (بخاری) ان روایات کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ رمضان المبارک میں نوافل کی کثرت سنت ہے۔ ان کا باجماعت اہتمام حضورؐ کے زمانے میں صرف تین دن ہوا تھا۔ لیکن حضرت عمرؓ کے زمانے سے ان کی باقاعدہ جماعت ہونے لگی۔ یہ نوافل تہجد کے علاوہ تھے۔ بعض حضرات نے حضرت عائشہ کی روایت کی بنیاد پر تراویح کو تہجد کی نماز قرار دیا ہے۔ حضرت عائشہ کی روایت میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم رمضان اور غیر رمضان میں گیارہ رکعتوں سے زیادہ نہیں پڑھا کرتے تھے۔ (بخاری) لیکن یہ روایت تہجد سے متعلق ہے۔ اس لئے محدثین نے اس کو رمضان کے بجائے تہجد کے ابواب میں نقل کیا ہے۔ تراویح کی نماز اس کے علاوہ ہے جو آپؐ نے باجماعت صرف تین دن پڑھی تھی۔ اس لئے صحابہ کرام نے آپ کی وفات کے بعد تراویح بیس رکعت پڑھنی شروع کی، اور حرمین کی مساجد میں آج تک مسلسل بیس رکعات ہی پڑھی جاتی ہیں۔ تراویح کی تعداد میں علماء کا اختلاف ہے، بعض علماء نے آٹھ رکعات لکھی ہیں۔ علامہ ابن تیمیہ نے مختلف روایات کا محاکمہ کر کے لکھا ہے:

یہ بات صحیح سند سے ثابت ہے کہ حضرت ابی بن کعب لوگوں کو رمضان المبارک میں بیس رکعات تراویح اور تین رکعت وتر پڑھاتے تھے۔ لہذا بہت سارے علماء اسی کو سنت قرار دیتے ہیں کیوں کہ ابی بن کعب نے انصار اور مہاجرین کی موجودگی میں بیس رکعت پڑھائی اور کسی نے انکار نہیں کیا۔ (فتاوی ابن تیمیہ، ص112 / 23)

تراویح کی نماز کے ساتھ دو اور سنتیں بھی شامل ہوگئی ہیں جو سنت متواترہ ہیں۔ ایک قرآن سننا اور دوسری قرآن سنانا۔ تراویح کا اتنا زیادہ اہتمام اسی لیے کیا جاتا ہے، چوں کہ یہ تین سنتوں کی اجتماعی شکل بن گئی ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم رمضان المبارک میں قرآن سنتے بھی تھے اور سناتے بھی تھے۔ تراویح اس سنت کی ایک عملی صورت ہے۔

تروایح میں قرآن سننے یا سنانے پر اجرت لینا جائز نہیں ہے۔ یہ کوئی کاروبار نہیں ہے بلکہ عبادت ہے اس لئے اس کا اجر اللہ سے مانگنا چاہیے۔ تراویح کی نماز جماعت کے ساتھ پڑھنا بہتر ہے، البتہ تنہا بھی پڑھی جاسکتی ہے۔ اگر کسی کی تراویح چھوٹ جائے تو ان کی قضا نہیں ہے۔

7.2.4 صدقۃ الفطر

رمضان المبارک میں صدقۃ الفطر بھی واجب ہے۔ صدقۃ الفطر کے دو مقاصد ہیں۔ ایک یہ ہے کہ یہ صدقہ روزہ دار کے لیے کفارہ ہے۔ دوسرے اس کے ذریعہ غریب و نادار لوگ بھی عید کی خوشیوں میں شریک ہو جاتے ہیں۔ صدقۃ الفطر کا عید سے پہلے ادا کرنا ضروری ہے لیکن اگر کوئی عید سے پہلے ادا نہ کر سکے تب بھی یہ ختم نہیں ہوتا، بلکہ بعد میں دینا ضروری ہے۔

صدقۃ الفطر میں غلہ بھی دیا جاسکتا ہے اور روپیہ بھی دئے جاسکتے ہیں۔ صدقۃ الفطر میں زیادہ سے زیادہ دینے کا جذبہ ہونا چاہیے تاکہ غریبوں کا زیادہ فائدہ ہو۔ حدیث شریف میں آیا ہے کہ ”رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صدقہ فطر کو لازم ٹھہرایا ہے۔ ایک صاع کھجور یا

ایک صاع جو، یہ صدقہ ہر مسلمان پر غلام ہو یا آزاد، مرد ہو یا عورت، چھوٹا ہو یا بڑا سب پر واجب ہے۔ اور اس کے لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا کہ صدقۃ الفطر نماز کے لئے جانے سے پہلے ادا کر دیا جائے۔ (بخاری)

بعض اور روایات میں پنیر اور کشمش کا بھی ذکر ہے۔ دراصل حضور کے زمانے میں یہ غذائی اجناس تھیں اس لئے ان میں سے صدقہ نکالنے کا حکم دیا تا کہ ضرورت مندوں کی فوری کفالت کا انتظام ہو سکے۔ علماء نے وضاحت کی ہے کہ غلہ کی جگہ نقدی بھی دی جا سکتی ہے یعنی ایک صاع کی جو مروجہ قیمت ہو وہ قیمت ضرورت مند کو دی جا سکتی ہے۔

صدقۃ الفطر مالدار مسلمانوں پر واجب ہے۔ یعنی جو شخص عید کے دن صاحب نصاب ہو یعنی اس کے پاس ساڑھے سات تولہ سونا یا ساڑھے باون تولہ چاندی ہو یا اس کی مالیت کا روپیہ ہو اس پر صدقۃ الفطر واجب ہے۔ اور جو امیر نہ ہو وہ اس کا مستحق ہے۔ صدقۃ الفطر کو مساجد کی تعمیر میں دینا جائز نہیں۔ یہ صرف غریبوں کا حق ہے ان کو ہی دیا جائے گا تب ہی ادا ہو گا۔ البتہ صدقۃ الفطر کسی غیر مسلم غریب کو بھی دیا جا سکتا ہے۔

7.3 روزہ کے مقاصد

رمضان المبارک کے روزے کے ذریعہ انسان کی تربیت مقصود ہے۔ اور یہ مطلوب ہے کہ انسان کے اندر کچھ متعینہ خوبیاں پیدا ہو جائیں اور انسان کی جسمانی اور روحانی تربیت اس طرح ہو کہ وہ دین پر پورے طور پر چلنے والا بن جائے، قرآن و حدیث میں روزے کے جو مقاصد بیان ہوئے ہیں۔ ان میں چند اہم نکات یہ ہیں۔

7.3.1 تقویٰ کی آبیاری

روزہ تقویٰ کی پرورش اور آبیاری کا ذریعہ ہے۔ تقویٰ پوری انسانی زندگی میں مطلوب ہے، اس لئے تقویٰ کا اعلیٰ ترین معیار مطلوب حاصل کرنا انسان کا مقصد حیات ہونا چاہئے۔ روزے کی فرضیت کے ساتھ ہی روزے کا یہ مقصد بھی قرآن کریم میں بیان کیا گیا ہے کہ انسان روزے رکھنے سے متقی بنتا ہے اس لئے شعوری طور پر روزے کے ذریعہ اپنے تقویٰ کو معیار بلند تک پہنچانے کی کوشش کرنی چاہئے۔ روزے کے ذریعہ انسان کو فراغت اور یکسوئی ملتی ہے۔ وہ کھانے، پینے اور دوسرے بہت سے یومیہ عوارض و ضروریات سے یکسو ہو جاتا ہے۔ عبادت و تلاوت کے ذریعہ قرب خداوندی کو تلاش کرتا ہے۔ اس کے پاس اپنے رب سے مناجات اور اپنی زندگی پر غور و فکر کرنے اور اپنے ماہ و ایام کی گزرگاہ پر نظر ڈالنے کا موقعہ ملتا ہے۔ اگر انسان اپنا احتساب کرے اور اپنے اوقات اور ماہ و ایام کے گزرنے کو دیکھے تو اس کو اپنی کمیوں اور خامیوں کا احساس ہو گا اور وہ ان کو دور کرنے کی شعوری کوشش کرے گا۔ اس طرح اس کے تقویٰ کا معیار بلند ہو گا، جو روزہ کے بنیادی مقاصد میں سے ہے۔

7.3.2 صبر و برداشت کی مشق

روزہ کے ذریعہ انسان کی ایک اہم ترین انسانی صفت صبر کی پرورش ہوتی ہے۔ روزہ کی اصل روح صبر و برداشت ہے۔ اس لئے

حدیث میں آتا ہے کہ نصف صوم صبر ہے۔ یعنی روزے کا آدھا حصہ تو صبر ہی ہے۔ انسان کے پاس کھانے کو سامان موجود ہے، پینے کو پانی فراہم ہے۔ زندگی کی بقیہ ضروریات کی تسکین کا سامان بھی موجود ہے۔ لیکن وہ محض اللہ کے حکم سے بھوک کی شدت اور پیاس کی سختی برداشت کرتا ہے، دوسری دنیاوی لذات وخواہشات سے رکا رہتا ہے۔ اسی طرح بسا اوقات انسان کے ساتھ زیادتی ہوتی ہے اور وہ اپنے اوپر ہونے والی زیادتی کا بدلہ بھی لے سکتا ہے لیکن وہ محض اس لئے جھگڑا کرنے سے باز رہتا ہے کہ اس کو خیال رہتا ہے کہ روزہ کی حالت میں جھگڑا نہیں کرنا چاہئے۔ بسا اوقات انسان اپنے بے تکلف احباب کی محفل میں ہوتا ہے اور محفل کا رنگ اس کو زبان وبیان کی لغزش کی طرف کھینچتا ہے لیکن وہ یاوہ گوئی سے محض اس لئے رکا رہتا ہے کہ ایسا کرنے سے اس کے روزے کا اجر وثواب اکارت جائے گا۔ انسانی زندگی میں یہی وہ مواقع ہیں جہاں وہ عزم وحوصلہ سیکھتا ہے اور ضبط نفس اور مشکلات پر صبر کرنے کی صلاحیت اس کے اندر پیدا ہوتی ہے۔ اس کو اپنے نفس پر قابو پانے کی مشق ہوتی ہے اور اگر یہ صلاحیت انسان کے اندر پیدا ہو جائے تو وہ قوی سے قوی تر اور زیادہ عقلمند اور ہوشیار ہو جاتا ہے۔ عقلمندی کیا ہے۔ عقلمندی دوراندیشی کا نام ہے اور صبر وضبط کے ذریعہ انسان فوری اشتعال پر قابو پانا سیکھتا ہے اس کے اندر دور اندیشی کی صفت پیدا ہوتی ہے۔ سب سے زیادہ دور اندیش وہ ہے جو اپنی آخرت کی فکر کرے، حدیث میں آتا ہے۔ الکیس من دان نفسه وعمل لما بعد الموت۔ (عقلمند وہ ہے وہ اپنے نفس کو قابو میں رکھے اور مرنے کے بعد کے لئے عمل کرے)

7.3.3 جھوٹ سے بچنے کی مشق

انسانی زندگی میں جھوٹ ایسی برائی ہے جو انسان کا سماجی اعتبار کھو دیتی ہے اور اپنے انجام وعواقب کے اعتبار سے انسان کو بڑی مشکلات میں مبتلا کر دیتی ہے۔ روزہ کے ذریعہ انسان کی ایسی تربیت ہوتی ہے کہ وہ جھوٹ اور اس کی متعلقہ بیماریوں سے اپنے آپ کو بچا سکتا ہے۔ جھوٹ بالعموم کم حوصلہ اور دوں ہمت لوگ بولتے ہیں اور اپنے آپ کو کسی فوری پریشانی سے بچانے کے لئے جھوٹ کا سہارا لیتے ہیں۔ پھر یہ ان کی عادت بن جاتی ہے۔ اور وہ موقعہ بموقعہ جھوٹ بولنے لگتے ہیں۔ روزہ انسان کے حوصلے بلند کرتا ہے اور اس کو اولوالعزم بناتا ہے جب انسان اولوالعزم ہو جاتا ہے تو جھوٹ بولنے کی بنیاد ختم ہو جاتی ہے اور امید ہے کہ حوصلہ مند شخص اپنے آپ کو دروغ گوئی سے بچا لے گا۔ عزم وحوصلہ کی آبیاری کے ساتھ روزے کے آداب میں ہے کہ انسان جھوٹ اور دروغ سے بچا رہے ورنہ اس کا روزہ ضائع ہو جائے گا۔ ایک حدیث میں آتا ہے کہ جس کسی نے جھوٹ بولنا اور جھوٹ پر عمل کرنا نہیں چھوڑا تو اللہ کو اس کی کوئی ضرورت نہیں کہ وہ اپنا کھانا پینا چھوڑ دے، یعنی روزہ صرف کھانا پینا چھوڑ دینے کا نام نہیں ہے بلکہ اور بھی برائیاں ہیں جن سے بچنا ضروری ہے ورنہ روزے کا ثواب نہیں ملے گا۔ اسی بات کو ایک دوسری حدیث میں اس طرح بیان کیا گیا ہے کہ ”کتنے ہی روزہ دار ایسے ہیں کہ بھوک پیاس کے علاوہ ان کو کچھ نہیں ملتا اور کتنے ہی شب بیدار ایسے ہیں کہ ان کو رات جگنے کے علاوہ کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ (ابن ماجہ) یہ روایات اس بات کو اور مضبوط کرتی ہیں کہ روزہ کے ذریعہ انسان کی ایسی تربیت بھی مطلوب ہے کہ وہ جھوٹ بولنے اور جھوٹ پر عمل کرنے سے باز رہے۔

7.3.4 ایمان واحتساب

روزہ کے ذریعہ انسان کے دل میں مخفی ایمان اور للّٰہیت کی بھی تقویت ہوتی ہے۔ روزہ ایسی عبادت ہے جو مخفی ہوتی ہے۔ روزہ کا

حال سوائے رب العالمین اور روزہ دار کے کسی پر نہیں کھلتا۔ جو شخص محض اللہ کے لئے روزے رکھے اور جس طرح وہ اپنے ایمان اور للّٰہیت میں سچا ہو اسی صداقت کے ساتھ روزے رکھے تو اس کے ایمان واحتساب میں اضافہ ہو گا اور خلوص وللّٰہیت کے حقیقی ثمرات اس کی زندگی میں ظاہر ہوں گے۔ ایک حدیث شریف میں آتا ہے کہ جو شخص ایمان اور احتساب کے ساتھ روزے رکھے اس کے تمام پچھلے گناہ معاف کر دیئے جاتے ہیں۔ (بخاری و مسلم) اور ایک حدیث میں آتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے کہ روزہ میرے لئے ہے اور میں ہی روزہ کا بدلہ دوں گا (بخاری و مسلم)۔

7.3.5 گناہوں کے مقابلے میں ڈھال

روزہ کا ایک مقصد یہ بھی ہے کہ دنیا میں جہاں چاروں طرف لذات دنیا بکھری پڑی ہیں اور شیطان ان کو مزید خوشنما بنا کر پیش کرتا ہے انسان کبھی کبھی اس ظاہری چمک دمک میں بہہ جاتا ہے اور دنیا اس کو اپنی طرف لبھا لیتی ہے اس کے قدم جادہ مستقیم پر لغزش کھانے لگتے ہیں۔ فوری نفع اس کو گناہ کے نقصان سے غافل کرنے لگتا ہے۔ ایسے حالات میں انسان کو ایک مضبوط سہارے اور وسیلے کی ضرورت ہوتی ہے جس کے ذریعہ انسان ان حملوں کا دفاع کر سکے۔ روزہ اس کے لئے ایک ڈھال کی مانند ہے جو کارزار حیات میں شیطان اور گناہوں کے خلاف ایک رکاوٹ اور آڑ کا کام کرتا ہے۔ حدیث شریف میں آیا ہے کہ روزہ ڈھال ہے (مسلم)۔ روزہ ایک طرف تو مومن کے لئے ڈھال کا کام کرتا ہے دوسری طرف اس کے گناہوں کی مغفرت کا بھی ذریعہ ہے۔

7.3.6 ہمدردی اور غم خواری

روزہ کے اہم مقاصد میں ہمدردی اور غمگساری کی تربیت بھی ہے۔ روزہ رکھنا ایک عبادت ہے لیکن اس کے سماجی فوائد بھی بے شمار ہیں۔ روزہ کے ذریعہ انسان کے اندر ہمدردی کے جذبات پیدا ہوتے ہیں۔ غمگساری اور دوسروں کی فلاح و بہبود کے جذبات پرورش پاتے ہیں۔ اس لئے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے رمضان کے مہینہ کو شہر المواساۃ کہا ہے، یعنی ایسا مہینہ جس میں ہمدردی کے جذبات کی پرورش ہوتی ہے۔ جس میں معاشرے کے نادار اور ضرورت مند لوگوں کی خبر گیری کا جذبہ پروان چڑھتا ہے۔

روزہ شعوری طور پر بالارادہ بھوکے پیاسے رہنے کا نام ہے۔ محض اللہ کے حکم سے بھوک و پیاس کی شدت کو برداشت کرنے کا نام ہے۔ اس طرح وہ انسان جس نے اپنے وسائل حیات کی فراوانی کی بنا پر کبھی بھوک کی سختی کو نہیں جھیلا، جس نے کبھی پیاس کی شدت کو محسوس نہیں کیا، جس کے پاس بھوک لگنے سے پہلے انواع واقسام کی لذیذ غذائیں موجود ہیں، جس کے پاس پیاس کی شدت سے پہلے ٹھنڈے شدوبات فراہم ہیں وہ معاشرہ کے ان نادار افراد کی محرومی اور مجبوری کو محسوس نہیں کر سکتا جو نان شبینہ سے محروم ہیں۔ روزہ کی حالت میں انسان کو اس کا ذاتی تجربہ حاصل ہو جاتا ہے، اور نادار و محروم افراد کی پریشانیوں کا شعوری طور پر خود تجربہ کر لیتا ہے۔ اس کے ذریعہ اس کے دل میں اپنے بھائیوں کی محرومی کا احساس پوری طرح سامنے آجاتا ہے اور وہ ان کی ضروریات اور ان کے حوائج کی تکمیل کے لئے کوشاں ہو جاتا ہے۔

رمضان المبارک میں عبادات اور خیرات کا ثواب بڑھا دیا جاتا ہے۔ اس لئے بھی صاحب ثروت لوگ اس ماہ مبارک میں خاص طور

پر صدقہ وخیرات کرتے ہیں تاکہ ضرورت مند اور نادار لوگوں کی ضروریات کی تکمیل ہو سکے اور معاشرے کے محروم افراد بھی اسباب خورد ونوش کا فراوانی سے استعمال کر سکیں۔ رمضان المبارک میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی داد و دہش اور صدقہ وخیرات کی روش میں بے پناہ اضافہ ہو جاتا تھا۔ بخاری شریف کی روایت ہے کہ جب رمضان المبارک کا مہینہ آتا تو آپؐ کی داد و دہش اور سخاوت کا یہ عالم ہوتا تھا کہ گویا تیز آندھی آگئی ہے۔ یعنی آپؐ کثرت سے سخاوت کرتے تھے۔ اس میں بھی امت کے لئے یہ تعلیم ہے کہ رمضان المبارک میں سخاوت کا ہاتھ اور زیادہ کشادگی سے کھولیں۔

رمضان المبارک میں روزہ کھلوانے کا ثواب روزہ رکھنے کے برابر ہے۔ حدیث شریف میں آیا ہے کہ: جس نے رمضان میں کسی روزہ دار کو افطار کرایا تو یہ اس کے لئے گناہوں سے بخشش کا اور اس کی گردن کو آگ سے چھڑوانے کا ذریعہ ہوگا وار اس کو اتنا ہی ثواب ملے گا جتنا کہ روزہ دار کو روزہ رکھنے کا ثواب ملتا ہے، اور دونوں کے اجر وثواب کی وجہ سے کسی کے اجر وثواب میں کمی نہیں ہوگی۔

رمضان المبارک میں صدقۃ الفطر ہر صاحب حیثیت مسلمان پر واجب ہے۔ صدقۃ الفطر بھی دراصل اس لئے واجب کیا گیا ہے تاکہ اس کے ذریعہ معاشرہ کے نادار لوگ بھی عید کی خوشیوں میں پوری طرح شریک ہو سکیں، اور عید الفطر کے دن کھانے اور لباس کی تنگی کی وجہ سے ان کے چہروں کی شگفتگی ناداری کے غم سے اضمحلال کا شکار نہ ہو جائے۔ اس طرح رمضان المبارک کے مہینہ میں انسان کی ہمدردی و غمخواری کے جذبات کی پرورش کی جاتی ہے تاکہ صاحب حیثیت لوگ اپنے آپ کو پورے معاشرے سے وابستہ رکھیں اور معاشرے کے ضرورت مند اور نادار لوگوں کی خبر گیری کو بھی اپنا دینی فریضہ اور مذہبی شعار تصور کریں۔ ان کو اپنی خوشیوں میں شریک کرنا، ان کی محرومیوں کو دور کرنا اور ان کی بنیادی ضروریات کی تکمیل کرنا اپنا دینی فریضہ تصور کریں۔ شہر المواساۃ یعنی ہمدردی کا مہینہ ہونے کا یہی مطلب ہے کہ ہر انسان اپنے آپ کو معاشرہ کا ایک فرد اور ایک جزء سمجھ کر پورے معاشرے کی آبیاری کی کوشش کرے۔

7.4 طریقہ واحکام

اللہ نے ماہ رمضان المبارک کے روزے فرض کئے ہیں۔ رمضان المبارک ہجری کلینڈر کے اعتبار سے نواں مہینہ ہے۔ اس مہینہ میں ہی قرآن نازل ہوا تھا، اس لئے اس مہینہ کے روزے فرض کئے گئے، روزہ کی فرضیت 2ھ ہجری میں ہوئی۔ اس سے قبل مسلمان عاشوراء کا روزہ رکھتے تھے۔ رمضان کے روزوں کی فرضیت کے بعد رمضان کے روزے رکھنے لگے۔

ہجری کلینڈر قمری تقویم سے چلتا ہے، یعنی چاند دیکھ کر مہینہ کا آغاز ہوتا ہے۔ اس لئے رمضان کے مہینہ میں بھی چاند دیکھ کر ہی مہینہ کا آغاز ہوگا اور اگلے مہینہ کا چاند دیکھ کر روزوں کی تکمیل ہوگی۔ چاند کو خود دیکھنا ضروری ہے، اگر خود نہ دیکھ سکے تو کسی صحیح خبر کی بنیاد پر رمضان کا آغاز کرنا چاہئے۔ چونکہ کبھی کبھی مطلع ابر آلود ہوتا ہے اور چاند نظر نہیں آتا ایسی حالت میں آس پاس کے شہروں سے صحیح خبر آجائے تو اس کی بنیاد پر روزے شروع ہو جائیں گے، آج کل اس کام کو منظم کرنے کے لئے ہر شہر میں رویت ہلال کمیٹی بنی ہوئی ہے، وہ اپنے طور پر تحقیق کر کے اگر چاند کا اعلان کر دے تو روزے شروع ہو جائیں گے۔

روزہ کا طریقہ یہ ہے کہ نصف شب کے بعد اور طلوع صبح صادق سے پہلے پہلے کھانا کھا لیا جائے۔ اس کے بعد روزے کی نیت کر لی جائے۔ نیت میں زبان سے وہ الفاظ بھی ادا کئے جاسکتے ہیں جو روایات میں مروی ہیں کہ بصوم غدٍ نویت من شہر رمضان وغیرہ تاہم نیت کا زبان سے کہنا ضروری نہیں ہے۔ اس کے بعد فجر کی اذان و نماز ہو گی، پھر دن بھر نہ کچھ کھایا جائے، نہ پیا جائے، اور نہ میاں بیوی آپس میں مقاربت کریں، شام کے وقت غروب آفتاب کے وقت روزہ افطار کر لیا جائے۔ روزہ افطار کے وقت کی دعائیں احادیث میں موجود ہیں اور افطار کے بعد کی دعائیں بھی مروی ہیں۔ ان کا اہتمام کرنا چاہئے۔ اس طرح ایک روزہ مکمل ہو جاتا ہے۔ اسی طرح تمام روزے رکھنے چاہئیں ۔ روزے کی حالت میں کھانا، پینا اور جنسی مقاربت سے روزہ ٹوٹ جاتا ہے۔ لیکن روزے کے پورے اجر و ثواب اور اس کے پورے فائدے کے لئے ضروری ہے کہ روزے میں جو دوسری چیزیں لازمی ہیں ان کا بھی اہتمام کیا جائے۔ جیسے نمازوں کی اپنے وقت پر ادائے گی، ذکر و تلاوت اور اپنے رب سے اپنا رشتہ مضبوط کرنا۔ اور جن چیزوں سے منع کیا گیا ہے ان سے رکا جائے جیسے جھگڑا اور فحش باتیں وغیرہ۔

روزہ کے لئے نیت کرنا ضروری ہے۔ اگر نیت نہیں کی تو روزہ نہیں ہو گا۔ البتہ زبان سے نیت کا اظہار ضروری نہیں ہے۔ سحری کھانا بھی نیت کے قائم مقام ہے اگر رمضان میں روزہ رکھنا ہو۔ اگر نفل روزہ ہے تو اس کے لئے نیت کرنا ضروری ہے۔ رمضان کے روزے ہر عاقل بالغ مسلمان پر فرض ہیں، بلا عذر روزہ چھوڑنا بڑا گناہ ہے۔ حدیث میں آتا ہے کہ اگر کوئی شخص رمضان کا روزہ بلا عذر چھوڑ دے تو پھر چاہے ساری زندگی روزہ رکھتا رہے اس کے ثواب کی تکمیل نہیں ہو گی۔ البتہ عذر کی بنیاد پر روزے چھوڑے جاسکتے ہیں اور ان کی قضا غیر رمضان میں کرنی ہو گی۔ عذر میں سفر، بیماری، ضعیفی، حیض، نفاس اور دودھ پلانے والی عورت شامل ہے۔ ان کو روزہ چھوڑنے کی اجازت ہے۔ یہ لوگ بعد میں جب سہولت ہو اپنے روزوں کی قضا کر لیں۔ ضعیف حضرات جو روزہ نہ رکھ سکتے ہوں ان کے لئے اسلام میں فدیہ کی گنجائش ہے، یعنی وہ اپنے ایک روزے کے لئے ایک مسکین کو دو وقت بھر پیٹ کھانا کھلا دیں تو یہ ان کی طرف سے روزے کا قائم مقام ہو گا۔ لیکن اس کی اجازت جب ہے جب روزہ رکھنے پر قدرت نہ ہو، فدیہ کو روزہ چھوڑ دینے کا بہانا نہیں بنانا چاہیے۔ رمضان کے چھوٹے ہوئے روزوں کی قضاء غیر رمضان میں ہی کی جاسکتی ہے، قضاء کے روزے لگاتار بھی رکھے جاسکتے ہیں اور وقفہ وقفہ سے بھی رکھے جاسکتے ہیں، حسب سہولت اس کی اجازت ہے۔

سال میں رمضان المبارک کے روزے فرض ہیں۔ اس طرح چار دن ایسے ہیں جن میں روزہ رکھنا گناہ ہے۔ ایک عید الفطر کے دن اور تین ایام قربانی کے۔ ان ایام کے علاوہ میں روزہ رکھنا جائز ہے۔ اسی طرح باقی دنوں میں نفل روزے سال میں کسی بھی دن رکھے جاسکتے ہیں۔

روزہ اگر کسی عذر کی بنا پر چھوڑا ہے تو اس کی قضا کرنی ضروری ہے، لیکن اگر روزہ بلا عذر توڑ دیا تو اس کے لئے صرف قضا کافی نہیں ہے، بلکہ کفارہ بھی دینا ہو گا۔ روزے کا کفارہ یہ ہے کہ جو روزہ توڑا ہے اس کی قضا کرے اور مزید دو مہینے لگاتار روزے رکھے، اگر بیچ میں ایک بھی ناغہ ہو گیا تو پھر دوبارہ ساٹھ روزوں کی گنتی پوری کرے۔ البتہ اگر روزہ رکھنے کی قوت نہ ہو تو ساٹھ مسکینوں کو کھانا کھلائے یا ایک مسکین کو ساٹھ دن تک کھانا کھلائے تب کفارہ ادا ہو گا۔

روزے کی حالت میں کھانے، پینے، مباشرت کرنے سے روزہ ٹوٹ جاتا ہے۔ اسی طرح ایسی دوا سے بھی روزہ ٹوٹ جاتا ہے جب کہ عین دوا معدہ تک پہنچ جائے یا ناک وغیرہ کے ذریعہ اگر کوئی غذا یا پانی یا اور کوئی چیز حلق سے اتر جائے تو اس سے بھی روزہ ٹوٹ جاتا ہے۔ اسی طرح یہ سمجھ کر کہ ابھی سحر کا وقت باقی ہے کھانا کھا لینے یا یہ سمجھ کر کہ افطار کا وقت ہو گیا ہے اور افطار کا وقت واقع میں نہ ہوا افطار کر لینے سے بھی روزہ ٹوٹ جاتا ہے۔ مسواک کرنے، سرمہ لگانے تیل لگانے وغیرہ سے روزہ نہیں ٹوٹتا۔

روزہ کے سلسلے میں دو بنیادی باتیں ہیں۔ ایک یہ کہ جان بوجھ کر روزہ توڑا جائے، دوسرا یہ کہ کسی غلطی سے روزہ ٹوٹ جائے، مثلاً قے ہوئی اور یہ سمجھ کر کہ اب روزہ ٹوٹ گیا کھا پی لیا یا افطار کا وقت سمجھ کر روزہ کھول لیا۔ ان سب صورتوں میں روزہ کی قضا ہے۔ اور پہلی صورت یعنی جان بوجھ کر روزہ توڑنے میں قضا اور کفارہ دونوں لازم ہیں۔ لیکن ایک رمضان میں اگر ایک سے زائد مرتبہ کفارہ لازم ہو گیا تو ایک ہی کفارہ ادا کرنا ہو گا۔ البتہ روزے جتنے ٹوٹ گئے ان سب کی قضا کرنی ہو گی۔ سب کے لیے الگ الگ کفارہ دینے کی ضرورت نہیں ہے۔

7.5 اقسام

روزے کی پانچ بنیادی قسمیں ہیں۔ 1. فرض، 2. سنت، 3. نفل، 4. مکروہ، 5. ناجائز

فرض روزے صرف رمضان المبارک کے ہیں۔ رمضان کا مہینہ جس کو مل جائے اس کو رمضان کے روزے رکھنا فرض ہے۔ اور اگر کسی مجبوری کی وجہ سے رمضان میں روزے نہ رکھ سکے تو رمضان کے بعد ان روزوں کی قضا کرنا ضروری ہے۔

سنت روزوں میں ایک تو یوم عاشوراء کا روزہ ہے۔ یہ روزہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ساری زندگی رکھا۔ ہجرت سے پہلے بھی اور ہجرت کے بعد بھی- اس لئے یوم عاشوراء کا روزہ رکھنا سنت روزوں میں سب سے زیادہ اہم ہے۔ اس کا اہتمام کرنا چاہیے۔ اس کے علاوہ ذی الحجہ کے ابتدائی 9 دنوں کے روزے بھی رکھنے چاہیے۔ خاص طور پر غیر حاجیوں کے لیے 9 ذی الحجہ یعنی یوم عرفہ کے روزے کی بڑی تاکید آئی ہے۔ شوال کے مہینہ میں چھ روزے رکھنے کی بھی فضیلت احادیث میں آئی ہے۔ اس لیے شوال کے چھ روزے رکھنا بھی سنت ہے۔

سال کے تمام بقیہ ایام کے روزے نفل ہیں۔ حسب حیثیت اور حسب سہولت پورے سال روزوں کا اہتمام کرنا چاہیے۔ سال کے ان روزوں کے لیے کچھ نبوی ہدایات ہیں ان کا اہتمام کرنا چاہیے۔ مثلاً ہر قمری مہینہ کے ایام میں 14، 15، اور 16 تاریخ کے روزے رکھے جائیں۔ پیر یا جمعرات کو روزے رکھے جائیں۔ یا پھر شعبان میں بالعموم کثرت سے روزے رکھے جائیں۔ اسی طرح اشہر حرم یعنی رجب، ذی قعدہ، ذی الحجہ اور محرم میں روزے رکھنا بھی پسندیدہ ہیں۔

صرف جمعہ کے دن کا روزہ رکھنا یا صرف ہفتہ کے دن روزہ رکھنا، یا ہمیشہ روزے رکھنا اسلام کی نظر میں پسندیدہ نہیں ہے، روایت میں ان کی ممانعت آئی ہے، اس لئے اس طرح روزے رکھنا مکروہ ہے۔

جیسا کہ اوپر ذکر ہوا، عید الفطر کے دن اور عید الاضحی کے تین ایام میں روزے رکھنا جائز نہیں ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے

انسانوں کی ضیافت کے ایام ہیں۔ ان میں کھانا پینا اور اللہ تعالیٰ کی نعمتوں پر شکر ادا کرنا چاہئے، روزہ رکھنا گناہ ہے۔

دوسری تمام عبادات کی طرح روزوں کی بھی اصل روح اطاعت الٰہی ہے۔ جن ایام میں روزے رکھنے کا حکم ہے ان میں ہر حال میں روزہ رکھنا اور جن ایام روزہ رکھنے سے منع فرمایا ہے ان میں ہر حال میں روزہ رکھنے سے پرہیز کرنا اور کھانا پینا عین دینداری اور ثواب کا عمل ہے۔ روزہ رکھنا اسی وقت ثواب کا کام ہے جب اطاعت الٰہی میں کیا جائے، اگر ہوائے نفس یا تقشف یا تعذیب نفس کے لئے ہو تو روزہ رکھنا ثواب کا عمل نہیں رہ جاتا۔ ایک بات اور ہے کہ اللہ کی مقررہ کردہ ترجیحات کو تبدیل کرنا بھی گناہ ہے۔ خدا نے رمضان کے روزے فرض کئے ایک شخص بیماری کا عذر بنا کر رمضان کے روزے کا فدیہ دیتا ہے، لیکن وہی یوم عاشورہ یا ۱۴؍ شعبان کو روزہ رکھتا ہے تو گویا اس نے خدا کی مقرر کردہ حدود کی خلاف ورزی کی اور اللہ تعالیٰ کی بتائی ہوئی ترجیحات کو بدل دیا۔ اس طرح کے عمل سے بچنا ضروری ہے۔

7.6 اکتسابی نتائج

اس اکائی میں آپ نے درج ذیل نکات سیکھے:

- روزہ کے لئے عربی زبان میں لفظ صوم استعمال ہوتا ہے۔ صوم کے معنی رکنے اور باز رہنے کے آتے ہیں۔ اصطلاح میں صبح صادق سے غروب آفتاب تک کھانے، پینے اور مباشرت سے رکے رہنے کا نام روزہ ہے۔ روزہ کی حالت میں دیگر اخلاقی برائیوں جھوٹ، غیبت، بدگوئی، جھگڑا فساد وغیرہ سے بچنا بھی ضروری ہے۔ اگر ایسا نہیں کیا گیا تو روزہ مکمل تو ہو جائے گا لیکن ثواب اکارت جائے گا۔ حدیث میں آتا ہے کہ جو شخص ان برائیوں سے باز نہ رہے اس کے بھوکا پیاسا رہنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔
- روزہ بڑی فضیلت کا عمل ہے۔ ایمان واحتساب کے ساتھ روزہ رکھنے کا ثواب بہت زیادہ ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ روزہ میرے لیے ہے اور میں ہی اس کا بدلہ دوں گا۔ ایک روایت میں آتا ہے کہ روزہ رکھنے سے انسان کے پچھلے تمام گناہ معاف ہو جاتے ہیں۔
- رمضان المبارک کے مہینہ کے روزے فرض ہیں۔ یہ ایک مہینہ کا تربیتی نصاب ہے جو انسان کی اعلیٰ اخلاقی صلاحیتوں کو پروان چڑھاتا ہے۔ اس کے معائب اور برے خصائل کو دور کرتا ہے۔ انسان کے اندر صبر وضبط اور برداشت کی صفت پیدا کرتا ہے۔ تقویٰ کی آبیاری کرتا ہے، انسان اللہ کے حکم سے باوجود قدرت کے کھانے، پینے، شہوات کی تکمیل کرنے، لڑنے جھگڑنے، گالی گلوچ، جھوٹ وغیبت سے باز رہتا ہے۔ اس تربیتی نصاب کے ذریعہ اس کو اپنے نفس پر قابو آجاتا ہے اور وہ معاشرہ کا ایک بہترین فرد بن جاتا ہے۔ رمضان المبارک کا مہینہ ایک ریفریشر کورس کی طرح ہے جس میں دینی فضائل کی آبیاری ہوتی ہے۔ صدقہ و خیرات اور صدقۃ الفطر کے ذریعہ انسان کے دل کی تنگی دور کی جاتی ہے اور بھوک و پیاس اور صبر و برداشت کا براہ راست تجربہ کرایا جاتا ہے۔ رمضان المبارک میں روزے رکھنا اللہ رب العزت کا شکر ادا کرنا بھی ہے۔ چوں کہ اس ماہ میں قرآن مجید نازل ہوا تھا۔ وہ نسخہ کیمیا جس پر انسان کی دنیا و آخرت کی کامیابی کا انحصار ہے وہ اسی مبارک مہینہ میں نازل ہوا۔ اس لیے انسانوں کی طرف سے یہ جذبہ تشکر کا بھی اظہار ہے۔

- رمضان المبارک کی راتوں میں جاگنا اور عبادت کرنا بڑے ثواب کا کام ہے۔ اس میں ایک رات ایسی ہے جو ایک ہزار مہینوں سے افضل ہے۔ وہ رات آخری عشرہ کی طاق راتوں میں سے کوئی ایک ہے۔ اس کا تذکرہ اور فضیلت قرآن مجید میں بھی آئی ہے اور احادیث میں بھی اس کی فضیلت بیان کی گئی ہے۔
- رمضان میں اعتکاف کرنا سنت ہے۔ اعتکاف مردوں اور عورتوں دونوں کے لیے سنت ہے۔ اعتکاف کا مطلب ہے خدا کے لیے کسی گوشے یا کونے میں بیٹھ جانا اور اپنے اوقات کو عبادت اور اطاعت کے لیے مخصوص کر لینا۔
- رمضان المبارک میں مالدار مسلمانوں پر صدقۃ الفطر نکالنا واجب ہوتا ہے۔ اس کا مقصد یہ ہے کہ اگر روزہ دار سے روزہ رکھنے میں کوئی کمی یا کوتاہی ہو گئی ہو تو اس کا کفارہ ہو جائے، اور معاشرہ کے غریب اور نادار لوگ بھی عید کی خوشیوں میں شریک ہو جائیں۔
- رمضان المبارک کے روزے فرض ہیں۔ عاشوراء، یوم عرفہ اور شوال کے چھ روزے سنت ہیں اور عید الفطر کے ایک دن اور عید الاضحی کے تین دنوں کے روزے رکھنا جائز نہیں ہے۔ باقی ایام میں دین کی مطلوبہ ترجیحات کے مطابق نفل روزے رکھے جاسکتے ہیں۔

7.7 نمونہ امتحانی سوالات

7.7.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات

1. روزہ کے لئے عربی زبان میں کون سا لفظ استعمال ہوتا ہے؟

(a). صوم　(b). صلوٰۃ　(c). حج　(d). سب غلط

2. رمضان میں اللہ کے لیے گوشہ گیر ہونا اس کو کیا کہا جاتا ہے؟

(a). اعتکاف　(b). عید الاضحیٰ　(c). چاشت　(d). تہجد

3. اعتکاف کی کتنی قسمیں ہیں؟

(a). تین　(b). پانچ　(c). سات　(d). نو

4. صدقۃ الفطر کی نوعیت کیا ہے؟

(a). واجب　(b). سنت　(c). فرض　(d). مستحب

5. رمضان المبارک کا مہینہ ہجری کیلنڈر کے حساب سے کون سا ہے؟

(a). نواں مہینہ　(b). تیسرا مہینہ　(c). پانچواں مہینہ　(d). سب غلط

6. روزہ کب فرض کیا گیا؟

(a). 2ھ　(b). 5ھ　(c). 9ھ　(d). 10ھ

7. قرآن مجید کس مہینے میں نازل ہوا؟

(a). رمضان (b). محرم (c). شوال (d). ذی قعدہ

8. روزے کی کتنی قسمیں ہیں؟

(a). پانچ (b). سات (c). نو (d). گیارہ

9. آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کس مہینے کو شہر المواساۃ بھی کہا ہے؟

(a). رمضان (b). ذی الحجہ (c). شوال (d). ذی قعدہ

10. رمضان کی آخری عشرہ کی طاق راتوں کو کیا کہا جاتا ہے؟

(a). شب قدر (b). شب برات (c). دونوں صحیح (d). سب غلط

7.7.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات

1. روزہ کے احکام پر روشنی ڈالیے۔
2. روزہ کے مصالح بیان کیجیے۔
3. کن باتوں سے روزہ ٹوٹ جاتا ہے؟ واضح کیجیے۔
4. روزہ کی اقسام بیان کیجیے۔
5. اعتکاف کی قسمیں اور اس کے طریق کار پر نوٹ لکھیے۔

7.7.3 طویل جوابات کے حامل سوالات

1. روزے کے مقاصد پر تفصیل سے روشنی ڈالیے۔
2. روزے کے طریقہ و احکام کو تفصیل سے بیان کیجیے۔
3. شب قدر پر اپنی معلومات قلم بند کیجیے۔

7.8 تجویز کردہ اکتسابی مواد

1. سیرۃ النبی : علامہ سید سلیمان ندوی
2. اسلامی فقہ : مولانا مجیب اللہ ندوی
3. اسلامی عبادات : حکیم الطاف احمد اعظمی
4. خطبات : ابوالاعلیٰ مودودی
5. کلام نبوت : مولانا فاروق خاں صاحب

اکائی 8: زکوٰۃ

اکائی کے اجزا:

8.0 تمہید

8.1 مقاصد

8.2 زکوٰۃ تعارف اور مصالح

8.3 نصاب زکوٰۃ

8.4 مصارف زکوٰۃ

8.5 طریقہ زکوٰۃ

8.6 اکتسابی نتائج

8.7 نمونہ امتحانی سوالات

  8.7.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات

  8.7.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات

  8.7.3 طویل جوابات کے حامل سوالات

8.8 تجویز کردہ اکتسابی مواد

8.0 تمہید

اسلامی زندگی میں زکوٰۃ کی بڑی اہمیت ہے۔ اور اسلام کے اقتصادی نظام میں زکوٰۃ ایک روح کی مانند ہے۔ موجودہ دور کے معاشی و اقتصادی بحران کے حل میں زکوٰۃ کا اہم کردار ہو سکتا ہے۔ زکوٰۃ کے معنی پاک کرنے اور اضافہ کرنے کے آتے ہیں۔ آدمی اپنے مال میں سے زکوٰۃ نکال کے اس کو پاک کرتا ہے اور اللہ تعالی اپنے فضل و کرم سے اس مال کی پرورش فرماتا ہے جس میں سے زکوۃ نکالی گئی ہے۔ اور جو مال زکوٰۃ میں دیا گیا، اس میں بھی حسب نیت اضافہ کرتا رہتا ہے۔ زکوۃ ایک فریضہ ہے، جو نماز و روزہ کی طرح انسان کے اوپر فرض ہے۔ اس

اکائی میں طلبہ کو زکوٰۃ کے معنی و مفہوم اور اسکی اہمیت و معنویت کے ساتھ زکوٰۃ کے مستحقین اور تقسیم زکوٰۃ کے طریق کار کو بیان کیا جائے گا۔ نیز زکوٰۃ کے احکام و مسائل پر روشنی ڈالی جائے گی۔

8.1 مقاصد

اس اکائی کا مقصد اس اکائی کے مطالعہ کے بعد آپ اس قابل ہو جائیں گے کہ اسلام میں زکوٰۃ کا مفہوم اور اس کی اہمیت کو سمجھ لیں، آپ اس بات سے بھی آگاہ ہو جائیں گے کے زکوٰۃ کا نصاب کیا ہے، زکوٰۃ کن لوگوں پر واجب ہے اور زکوٰۃ کہاں خرچ کی جائے گی، نیز زکوٰۃ کے مصالح کیا ہیں؟

8.2 زکوٰۃ تعارف اور مصالح

اسلام کی پانچ بنیادوں میں سے ایک زکوٰۃ ہے، زکوٰۃ کے لئے ایک دوسرا لفظ صدقہ بھی استعمال ہوتا ہے۔ اصطلاحی لفظ زکوٰۃ ہے اور ایک خاص مفہوم میں زکوٰۃ ہی استعمال ہوتا ہے۔ لفظ صدقہ کے دوسرے مفاہیم ہیں۔

زکوٰۃ کے لفظی معنی دو آتے ہیں: پاک کرنا اور بڑھنا۔ قرآن مجید میں دونوں معنی میں اس لفظ کا استعمال ہوا ہے۔ مثلاً سورہ مریم میں ہے۔ وَآتَیْنَاهُ الْحُکْمَ صَبِیّاً۔ وَحَنَاناً مِّن لَّدُنَّا وَزَکَاةً وَکَانَ تَقِیّاً (مریم:12-13)

”اور ہم نے اس کو بچپن میں ہی فیصلہ کی قوت عطا کی تھی اور اپنے پاس سے نرم دلی اور پاکیزگی، اور وہ نہایت پرہیز گار تھا“۔

ایک دوسری آیت میں ہے: خُذْ مِنْ أَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً تُطَهِّرُهُمْ وَتُزَکِّیْهِم بِهَا وَصَلِّ عَلَیْهِمْ (توبہ۔103)

”تم ان کے مالوں میں سے صدقہ قبول کرو، اس سے تم ان کو پاک کرو اور ان کا تزکیہ اور ان کے لئے دعا کرو“۔

صدقہ کے لفظی معنی صداقت اور سچائی کے آتے ہیں، لیکن اس کا بکثرت استعمال خیرات و عطیات کے لئے ہوتا ہے، جیسے قرآن میں ہے۔ وَمِنْهُم مَّنْ عَاهَدَ اللّٰهَ لَئِنْ آتَانَا مِن فَضْلِهِ لَنَصَّدَّقَنَّ (توبہ:75)

”ان میں سے بعض لوگ ایسے بھی ہیں جنہوں نے اللہ سے عہد کیا کہ اگر اس نے ہم کو اپنے فضل سے بہت سامال عطا فرمایا تو ہم خوب خیرات کریں گے“۔

قرآن مجید میں اپنے اموال میں سے صدقات اور زکوٰۃ دونوں کے نکالنے کا حکم ہے۔ صدقات کی تین قسمیں بیان کی گئی ہیں۔ ایک فرض یعنی زکوٰۃ جو صرف امیروں پر فرض ہے۔ دوسرے واجب جو صدقہ الفطر ہے یہ بھی صرف امیروں پر واجب ہے اور رمضان میں دیا جاتا ہے۔ تیسرے نفل صدقات جو کوئی بھی آدمی اپنی حیثیت کے مطابق غریبوں کی امداد کرتا ہے۔ فرض صدقہ یعنی زکوٰۃ کے علاوہ بھی اسلام میں صدقہ کرنے کی بڑی تاکید آئی ہے اور بسا اوقات زکوٰۃ کے علاوہ دیگر نفل صدقات واجب بھی ہو جاتے ہیں۔ قرآن نے ایک طرف تو صدقہ کرنے کا حکم دیا ہے۔ دوسری طرف صدقہ کرنے والوں کی تعریف و توصیف کی ہے اور صدقہ کرنے کو ایمان و عمل صالح سے

جوڑا ہے۔ تیسری طرف مال و دولت کی بے انتہا محبت کی مذمت کی ہے۔ اس طرح مختلف پہلوؤں کے ذریعہ لوگوں کو صدقہ و خیرات کی طرف متوجہ کیا ہے۔

زکوٰۃ کا ایک خاص پہلو یہ ہے کہ جس طرح نماز انسان کی بدنی عبادت ہے، اسی طرح زکوٰۃ مالی عبادت ہے۔ نماز کے ذریعہ بندہ رب العزت کی بارگاہ میں اس کا اعتراف کرتا ہے کہ اس کی جان رب العالمین کا عطیہ ہے اور وہ پوری طرح اپنے رب کا تابع فرمان ہے۔ اسی طرح زکوٰۃ کے ذریعہ بندہ اس بات کا اقرار کرتا ہے کہ اس کا مال بھی اللہ کا عطیہ ہے اور وہ اپنے مال کو حکم خداوندی سے ہر جگہ خرچ کرنے کو تیار ہے۔

اسلام کی نظر میں صدقہ کرنا اور اللہ کی راہ میں مال خرچ کرنا اتنا اہم ہے کہ قرآن مجید میں تقریباً بیاسی (82) مقامات پر نماز اور مال کا تذکرہ ایک ساتھ آیا ہے، مثلاً: وَمَا أُمِرُوا إِلَّا لِيَعْبُدُوا اللَّهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ حُنَفَاء وَيُقِيْمُوا الصَّلَاةَ وَيُؤْتُوا الزَّكَاةَ وَذَلِكَ دِيْنُ الْقَيِّمَةِ (البینہ: 5)

"ان کو صرف اس بات کا حکم دیا گیا تھا کہ وہ اللہ ہی کی مخلصانہ بندگی کریں بالکل یکسو ہو کر اور نماز قائم کریں اور زکوٰۃ دیں۔ اور یہی دین ہے بالکل درست"۔

ایک جگہ فرمایا گیا: فَإِن تَابُواْ وَأَقَامُواْ الصَّلاَةَ وَآتَوُاْ الزَّكَاةَ فَخَلُّواْ سَبِيْلَهُمْ إِنَّ اللّهَ غَفُورٌ رَّحِيْمٌ (توبہ: 5)

"اگر وہ توبہ کر لیں اور نماز قائم کریں اور زکوٰۃ دیں تو ان کا راستہ چھوڑ دو، بے شک اللہ بخشنے والا اور مہربان ہے"۔

احادیث میں بھی کثرت سے زکوٰۃ دینے کا حکم وارد ہوا ہے۔ رسول اللہ جس کسی کو بیعت کرتے تو اس سے زکوٰۃ ادا کرنے کی بابت بھی عہد لیا کرتے تھے۔ حضرت جریر بن عبد اللہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ سے میں نے صرف تین چیزوں کے بارے میں بیعت کی، نماز پڑھنے، زکوٰۃ دینے اور ہر معاملے میں مسلمانوں کی خیر خواہی کرنے کی (بخاری) اسلام میں نماز اور زکوٰۃ دونوں عبادتیں، بالعموم ایک ساتھ ذکر کی جاتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ خلیفہ اول کے زمانے میں جب کچھ قبائل نے زکوٰۃ ادا کرنے سے انکار کیا تو خلیفہ اول حضرت ابو بکرؓ نے ان کے ساتھ جنگ کی۔ حضرت ابو بکرؓ کا استدلال یہی تھا کہ قرآن میں نماز و زکوٰۃ کا حکم ایک ساتھ ہے، لہٰذا جو شخص ان دونوں کے درمیان تفریق کرے گا میں اس کے ساتھ جنگ کروں گا۔

جس طرح نماز انسان کے اوپر خدا کا حق ہے، اسی طرح زکوٰۃ انسان کے اوپر معاشرہ کا حق ہے۔ انسانی معاشرے میں سب طرح کے لوگ رہتے ہیں۔ صاحب ثروت بھی ہوتے ہیں اور نادار و مفلس بھی ہوتے ہیں۔ امیروں کی دولت تنہا ان کی نہیں ہوتی بلکہ امیر و غریب مل کر جو معاشرہ بناتے ہیں دولت بنیادی طور پر اس معاشرہ کی پیداوار ہوتی ہے۔ معاشرہ کے اندر کاروبار اور ضروریات زندگی کی کفالت ایک ایسا سلسلہ ہے جو پورے معاشرے کو باہم مربوط رکھتا ہے اور یہی ربط باہمی ہے جس کے لئے روپے پیسے درمیانی واسطہ کا کام کرتے ہیں، مال و دولت گویا ایک دھاگا ہے جو پوری سوسائٹی کو باہم جوڑے رکھتا ہے۔ اور اس کے ذریعہ معاشی سرگرمی قائم رہتی ہے ورنہ صرف امیروں کی

دولت ان کے کسی کام کی نہیں ہے۔ اگر انتہائی دولت مند آدمی ریگستان میں اپنی تمام دولت کے ساتھ ہو تو اس کو سب سے عزیز دولت روپیہ پیسے نہیں ہوں گے بلکہ کھانا اور پانی ہو گا۔ چوں کہ معاشی سرگرمیوں کے جاری رہنے میں غریبوں اور ناداروں کا بھی اہم حصہ ہوتا ہے اس لئے ان کے حقوق بھی امیروں کی دولت میں ثابت ہیں، اور معاشرے کے امیر لوگوں کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ ان کمزور لوگوں کا نہ صرف خیال رکھیں، ان کی ضروریات کی تکمیل کریں بلکہ اس کی بھی کوشش کریں کہ وہ بھی معاشی طور پر خود کفیل ہو جائیں۔ امیروں کی اس ذمہ داری کا کم سے کم درجہ زکوٰۃ ہے کہ وہ اپنے فاضل اور ضرورت سے زیادہ مال میں سے ڈھائی فیصد ان غریبوں کو بھی دیں، تاکہ ان کی معاشی کفالت بھی ہو سکے۔ اسلام کی نظر میں دولت کے حوالے سے اصولی بات یہ ہے کہ دولت کو صرف امیروں کے درمیان گردش نہیں کرنا چاہئے، سورہ حشر میں ہے۔ كَيْ لَا يَكُونَ دُولَةً بَيْنَ الْأَغْنِيَاءِ مِنكُمْ (الحشر:7)

”تاکہ وہ تمہارے امیروں کے درمیان ہی گردش نہ کرکے رہ جائے“۔

اسلام میں خدا کی راہ میں مال خرچ کرنا بڑی نیکیوں میں سے ہے۔ قرآن وحدیث میں اس کی فضیلت وارد ہوئی ہے، مثلاً ایک جگہ ہے: وَأَقِيمُوا الصَّلَاةَ وَآتُوا الزَّكَاةَ وَأَقْرِضُوا اللَّهَ قَرْضاً حَسَناً وَمَا تُقَدِّمُوا لِأَنفُسِكُم مِّنْ خَيْرٍ تَجِدُوهُ عِندَ اللَّهِ (مزمل:20)

”اور نماز قائم کرو اور زکوٰۃ دو اور اللہ کو قرض دو، اور جو تم آگے بھیجو گے اپنے واسطے اس کو خدا کے پاس پاؤ گے“۔

اس آیت میں زکوٰۃ دینے کا بھی حکم ہے اور زکوٰۃ کے علاوہ بھی مال خرچ کرنے کا حکم ہے۔ اور اس خرچ کو اللہ تعالی نے محض اپنے فضل وکرم سے اپنے لئے قرض فرمایا ہے۔

ایک آیت میں یہ ہے: يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُواْ أَنفِقُواْ مِن طَيِّبَاتِ مَا كَسَبْتُمْ وَمِمَّا أَخْرَجْنَا لَكُم مِّنَ الأَرْضِ (البقرہ267)

”اے مسلمانوں اپنی کمائی میں سے کچھ اچھی چیزیں اور جو ہم نے تمہارے لئے زمین سے پیدا کی ہیں اس میں سے کچھ خیرات دو۔“

ایک آیت میں فرمایا گیا۔ الَّذِينَ هُمْ عَلَى صَلَاتِهِمْ دَائِمُونَ ۔ وَالَّذِينَ فِي أَمْوَالِهِمْ حَقٌّ مَّعْلُومٌ ۔ لِّلسَّائِلِ وَالْمَحْرُومِ ۔ (معارج:20-23)

”جو اپنی نمازوں کو ہمیشہ ادا کرتے ہیں اور جن کے مالوں میں مانگنے والے اور محروم کا حصہ مقرر ہے“۔

معاشرہ کے ضرورت مند لوگوں کی خبر گیری اسلام کی نظر میں عبادت ہے۔ زکوٰۃ کی فرضیت سے پہلے بھی خیرات کرنے اور ناداروں کی مدد کا حکم موجود تھا، جیسے: وَمَا أَدْرَاكَ مَا الْعَقَبَةُ ۔ فَكُّ رَقَبَةٍ ۔ أَوْ إِطْعَامٌ فِي يَوْمٍ ذِي مَسْغَبَةٍ ۔ يَتِيماً ذَا مَقْرَبَةٍ ۔ أَوْ مِسْكِيناً ذَا مَتْرَبَةٍ (البلد:12-16)

”اور تو کیا سمجھا وہ گھاٹی کیا ہے (کسی قرض دار، یا قیدی یا غلام) کی گردن چھڑانا یا بھوک کے دن میں ناتے کے کسی بن باپ کے بچے

کو یا خاک میں پڑے ہوئے کسی محتاج کو کھانا کھلانا"۔

ایک اور جگہ ہے: فَذٰلِکَ الَّذِیْ یَدُعُّ الْیَتِیْمَ ۔ وَلَا یَحُضُّ عَلٰی طَعَامِ الْمِسْکِیْنِ۔ (ماعون:2۔3)

"وہی ہے جو یتیم بچے کو دھتکارتا ہے اور غریب کے کھانا کھلانے پر آمادہ نہیں کرتا"۔

اچھے مسلمانوں کی خوبیوں میں ایک بات یہ بتائی کہ وہ ضرورت مندوں کو کھانا کھلاتے ہیں۔

وَیُطْعِمُوْنَ الطَّعَامَ عَلٰی حُبِّهٖ مِسْکِیْناً وَیَتِیْماً وَأَسِیْراً ۔ إِنَّمَا نُطْعِمُکُمْ لِوَجْهِ اللّٰهِ لَا نُرِیْدُ مِنکُمْ جَزَاء وَلَا شُکُوراً۔ (الدھر:8۔9)

"اور وہ محتاج، یتیم اور قیدی کو کھانا کھلاتے ہیں۔ اور کہتے ہیں ہم تم کو صرف خدا کے لئے کھلاتے ہیں۔ تم سے نہ بدلا چاہتے ہیں اور نہ شکریہ"۔

احادیث میں بھی مال خرچ کرنے کا تذکرہ کثرت سے آیا ہے۔ اور بالکل شروع اسلام سے مال خرچ کرنے کی تاکید کی جاتی رہی ہے، بعثت نبوی کے چھٹے سال مسلمانوں نے حبشہ کی طرف ہجرت کی وہاں حضرت جعفر نے نجاشی کے دربار میں جو تقریر کی تھی اس میں یہ الفاظ بھی تھے "اور وہ پیغمبر ہم کو یہ سکھاتا ہے کہ ہم نماز پڑھیں اور روزے رکھیں اور زکوٰۃ دیں"۔ اور اوپر مذکور آیات مبارکہ بھی مکہ کے شروع کے زمانے کی ہیں۔ اسلام نے مسلمانوں کی تربیت اس طرح کی ہے کہ وہ کثرت سے مال خرچ کریں اور مال کی محبت ان کے اور ان کے فرائض کے درمیان حائل نہ ہو جائے۔

خدا کی راہ میں مال خرچ کرنے کی تلقین ہر مذہب میں ہے، خواہ یہودیت، عیسائیت، ہندو مذھب، بدھ مت، جین مت، سکھ مت ہو غرض یہ کہ ہر مذھب میں خدا کی راہ میں مال خرچ کرنے اور اپنے مال میں سے غریبوں کا حق نکالنے کا حکم موجود ہے البتہ مال کو غریبوں تک پہنچانے کا معاملہ بالعموم افراط و تفریط کا شکار ہو جاتا ہے کہیں سب کچھ خرچ کرنے کی بات ہے، کہیں دان کرنے کے لئے ایک قوم مخصوص ہے، کہیں دوسرے امور ہیں، جن کی وجہ سے خدا کی راہ میں نکالے گئے مال کا راست فائدہ غریبوں اور ضرورت مندوں کو نہیں ہوتا، بلکہ اکثر انہی کو ہوتا ہے جو خود صاحب حیثیت ہیں۔ یا پھر غریبوں کے حق میں صرف نان شبینہ آتی ہے۔ وہ پیٹ تو بھر لیتے ہیں لیکن معاشی سرگرمیوں میں حصہ لینے کے قابل نہیں ہو پاتے۔

اسلام نے مال خرچ کرنے کے پورے نظام میں کچھ اصلاحات کیں تاکہ ان کا فائدہ غریبوں کو ملے اور پورا پورا فائدہ ملے نیز اس کے فوائد پائیدار اثرات مرتب کریں۔

اسلام نے صدقہ و خیرات کے سلسلہ میں پہلی اصلاح تو یہ فرمائی کہ صدقہ و خیرات کو عبادت کا درجہ دیا۔ اور جس طرح انسان کے اوپر نماز فرض ہے اسی طرح اللہ کی راہ میں مال خرچ کرنے کو بھی فرض قرار دیا، جیسا کہ اوپر متعدد آیات اور احادیث کے حوالے سے گذر چکا ہے، غریبوں کی مدد محتاجوں کی خبر گیری اور بیماروں کی تیمارداری کو خالص عبادت کا درجہ عطا فرمایا۔ اس سلسلہ کی اور بھی روایات ہیں جن

میں سماجی خدمات کی اس تعبدی صفت کو اچھی طرح بیان کیا گیا ہے، مثلاً ایک روایت میں ہے:

اللہ تعالی فرماتا ہے کہ اے ابن آدم، میں بیمار ہو گیا تھا تو نے میری عیادت نہ کی، بندہ عرض کرے گا اے رب میں بھلا تیری عیادت کیسے کرتا۔ تو تو سب کا پالنے والا ہے۔ اللہ تعالی فرمائے گا کہ کیا تجھے نہیں معلوم کہ میرا فلاں بندہ بیمار تھا لیکن تو نے اس کی عیادت نہیں کی، اگر تو اس کی عیادت کو آتا تو مجھے اس کے پاس پاتا۔ اے ابن آدم میں نے تجھ سے کھانا مانگا لیکن تو نے مجھے نہیں کھلایا، بندہ عرض کرے گا اے رب میں تجھ کو کیونکر کھانا کھلاتا، تو تو سارے جہاں کا پروردگار ہے۔ اللہ تعالی فرمائے گا کہ کیا تجھے نہیں معلوم میرے فلاں بندے نے تجھ سے کھانا مانگا تھا مگر تو نے نہیں کھلایا اگر تو اس کو کھانا کھلاتا تو اسے میرے پاس پاتا، اے ابن آدم میں نے تجھ سے پانی مانگا تھا مگر تو نے نہیں پلایا۔ بندہ عرض کرے گا اے رب میں تجھے پانی کیونکر پلاتا تو تو رب العالمین ہے، خدا فرمائے گا: میرے فلاں پیاسے بندے نے تجھ سے پانی مانگا تھا مگر تو نے نہیں پلایا، اگر تو اس کو پانی پلاتا تو اسے میرے پاس پاتا۔ (مسلم)

یہ مسلم شریف کی ایک روایت ہے جس میں خالص سماجی معاملات کی اتنی اہمیت بیان کی گئی ہے گویا وہ خالص تعبدی امور ہوں، اس طرح اسلام خدا کی راہ میں مال خرچ کرنے اور خدا کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے بندوں کی خبر گیری کرنے، بھوکوں کو کھانا کھلانے، یتیموں کی کفالت کرنے مقروضوں اور قیدیوں کو رہا کرانے میں انسان کی کوششوں کو عبادت کا درجہ دیتا ہے۔

صدقہ وزکوۃ کے لئے اسلام کی دوسری اصلاح یہ ہے کہ زکوۃ لینا، یا صدقہ پر منحصر رہنا اسلام کی نظر میں نیکی نہیں ہے، بلکہ عیب ہے اور انسان کو چاہئے کہ اس عیب کو دور کرے۔ قرآن مجید میں بہت سے مقامات پر مال خرچ کرنے کی ترغیب ہے۔ لیکن ایک جگہ بھی امداد قبول کرنے کی بات نہیں کہی گئی ہے، مال و دولت کی ذخیرہ اندوزی کی تو مذمت ہے لیکن محنت کرنے یا مال کھانے کی مذمت نہیں ہے۔ بلکہ بعض عبادات کے فوائد میں لکھا ہے کہ اس کے ذریعہ اللہ تعالی مال و دولت بھی فراوانی سے عطا فرمائے گا، مثلاً حضرت نوح علیہ السلام کے قصہ میں ہے۔

فَقُلْتُ اسْتَغْفِرُوا رَبَّكُمْ إِنَّهُ كَانَ غَفَّاراً ۔ يُرْسِلِ السَّمَاء عَلَيْكُم مِّدْرَاراً ۔ وَيُمْدِدْكُمْ بِأَمْوَالٍ وَبَنِيْنَ وَيَجْعَل لَّكُمْ جَنَّاتٍ وَيَجْعَل لَّكُمْ أَنْهَاراً (نوح:10-12)

”پس میں نے کہا لوگو اپنے رب سے استغفار کرو، بے شک وہ معاف کرنے والا ہے، وہ تم پر آسمان سے خوب بارش برسائے گا اور تمہارے مال و اولاد میں اضافہ کرے گا اور تمہارے لئے باغات پیدا کرے گا اور تمہارے لئے نہریں جاری کرے گا“۔

اس سورہ میں آگے یہ بھی بتایا گیا ہے کہ منکرین نے حضرت نوح کی پیروی تو کی نہیں بلکہ غیروں کی اتباع کی جس نے ان کے مال و اولاد میں سوائے نقصان کے کوئی فائدہ نہیں پہنچایا۔

اللہ کے رسولؐ نے بھی لوگوں کو اللہ کی راہ میں مال خرچ کرنے اور خود سوال نہ کرنے کی تلقین فرمائی، ایک روایت میں آیا ہے کہ رسول اللہ نے فرمایا کہ تم میں سے جو شخص (بلا ضرورت) سوال کرتا رہے گا وہ اللہ تعالی سے قیامت کے دن اس طرح ملے گا کہ اس کے

چہرے پر گوشت نہ ہو گا، (بخاری)، ایک روایت میں ہے کہ سوال کرنا مالدار آدمی کے لئے جائز نہیں ہے اور نہ توانا و تندرست آدمی کے لئے جائز ہے۔ البتہ ایسے شخص کے لئے جائز ہے جس کے افلاس نے اس کو زمین پر گرا دیا ہو یا جو تاوان یا قرض کے بوجھ سے دب گیا ہو، اور جو شخص اپنے مال کو بڑھانے کے لئے لوگوں سے سوال کرے تو یہ سوال قیامت کے روز اس کے چہرے پر ایک زخم ہو گا، اور جہنم کا گرم پتھر ہو گا جس کو وہ کھائے گا۔ (ابو داؤد)۔

اسلام نے نہ صرف سوال سے بچنے کی تلقین کی ہے بلکہ آگے بڑھ کر ضرورت مندوں کی امداد و اعانت کا حکم دیا ہے، بخاری و مسلم کی ایک روایت میں ہے کہ ابو موسی اشعریؓ سے روایت ہے کہ ایک مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ہر مسلمان کے ذمہ صدقہ دینا ہے، لوگوں نے عرض کیا کہ اگر کسی کے پاس دینے کو نہ ہو تو کیا کرے، رسول اللہؐ نے فرمایا محنت کر کے کمائے اس طرح خود بھی فائدہ اٹھائے اور صدقہ بھی کرے، لوگوں نے عرض کیا اگر وہ اس کی استطاعت نہ رکھتا ہو یا یہ بھی نہ کر سکے، آپ نے فرمایا تو کسی غمزدہ ضرورت مند کی مدد کرے، لوگوں نے کہا، اگر وہ یہ بھی نہ کر سکے، آپؐ نے فرمایا لوگوں کو نیکی کا حکم کرے، لوگوں نے عرض کیا اگر یہ بھی نہ کر سکے تو آپ نے فرمایا اپنے آپ کو برائی اور شر سے بچائے کہ یہ بھی صدقہ ہے۔ (بخاری، مسلم)

اسلام نے اس طرح ایک معاشرہ تعمیر کیا جس میں مانگنا باعث ذلت ٹھہرا اور دینا باعث عزت۔ حدیث شریف میں آتا ہے کہ اوپر والا ہاتھ نیچے والے ہاتھ سے بہتر ہے۔ (الید العلیا خیر من الید السفلیٰ)

اسلام نے زکوٰۃ کے معاملے میں تیسری بڑی اصلاح یہ کی کہ زکوٰۃ اور صدقات کے مصارف میں سے اس طبقہ کو بیک بنی و دو گوش باہر نکال دیا جو تاریخ کے پورے دورانیہ میں عطیات و خیرات کا یکا و تنہا مالک بنا رہا ہے۔ یعنی مذہبی طبقہ، اور واضح طور پر فرما دیا کہ یہ اموال غریبوں کا حق ہیں لہذا ان کے مستحق صرف غریب لوگ ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی زندگی میں اس کا عملی نمونہ پیش کیا تا کہ مذھبی طبقہ وجود میں ہی نہ آئے۔ آپؐ نے فرمایا صدقہ ہمارے لئے جائز نہیں ہے، اس طرح اسلام نے اس کو یقینی بنایا کہ زکوٰۃ اس کے مستحقین یعنی غریبوں تک پہنچ جائے۔

اسلام نے زکوٰۃ و صدقات کی اہمیت کے ساتھ اس کے آداب بھی بتائے، قدیم اقوام میں جو خیرات کے طریقہ تھے ان کی اصلاح کی اور زکوٰۃ کے واجب ہونے کے مصالح بھی بیان کئے۔ زکوٰۃ کے مصالح اور فوائد میں عبادت کا جو پہلو ہے اور خدا کے حکم کو پورا کرنے کا جو ثواب ہے، اللہ کے راستہ میں مال خرچ کرنے کی جو فضیلت ہے ان سب کے علاوہ زکوٰۃ کے انسانی زندگی پر غیر معمولی اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ انسانی معاشرہ زکوٰۃ کے نظام سے مضبوط معاشی بنیادوں پر استوار ہو جاتا ہے۔ زکوٰۃ کے اس دینی اور اخروی مصالح کا تذکرہ عصر حاضر کے دو بڑے اہل علم کے حوالے سے کیا جاتا ہے، مولانا علی میاں نے زکوٰۃ کے اخروی فائدوں کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا ہے:

”بہت سے معاصر اہل قلم اور اہل فکر جو جدید معاشی فلسفوں اور علم الاقتصاد کی غیر معمولی اہمیت اور ہمہ گیری سے کم و بیش متاثر اور ذہنی طور پر مرعوب ہیں سارا زور زکوٰۃ کے اقتصادی مصالح اور منافع پر دیتے ہیں اور اس کو صرف ایک عادلانہ ٹیکس قرار دیتے ہیں یا زیادہ محتاط الفاظ میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ ان تحریروں کو پڑھنے والا کم از کم یہ محسوس کرتا ہے کہ ان کی رائے زکوٰۃ کے بارے میں یہ ہے کہ دنیا کے

معاشی نظاموں نے اب تک جتنے ٹیکس انسانی سوسائٹی پر عائد کئے ہیں، یہ اسلامی ٹیکس ان سب سے زیادہ حکیمانہ، منصفانہ اور متوازن ہے، اس لحاظ سے وہ یہ سمجھنے پر مجبور ہیں کہ زکوٰۃ اشتراکیت کی نہایت مستحکم بنیاد بن سکتی ہے جسے اسلام نے اپنی ترقی اور عروج کے بہترین زمانے میں دنیا کے سامنے پیش کیا تھا، وہ (چند مستثنیات کو چھوڑ کر) زکوٰۃ کی اس حقیقی روح کو فراموش کر جاتے ہیں جو اس کے پورے نظام میں جاری و ساری ہے۔ یہ روح ہے عبادت اور تقرب الہی کی۔ اسی طرح وہ اس کے بنیادی مقصد اور اصل حکمت و مصلحت کو نظر انداز کر دیتے ہیں یعنی نفس کو بخل، خود غرضی، انانیت اور فقراء کی حق تلفی اور قلب کو قساوت سے پاک و صاف کرنا۔ اللہ تعالی کی قبولیت و رضا حاصل کرنے اور فقراء وضعفاء کی دلداری اور ہمدردی کے نتیجے میں مال میں پاکی اور نورانیت اور خیر و برکت کا ظہور۔" (ارکان اربعہ ص 141)

زکوٰۃ کے معاشرتی اور سماجی نیز معاشی فوائد کا تذکرہ کرتے ہوئے مولانا مودودی نے لکھا ہے:

"یہ مسلمانوں کی کوآپریٹو سوسائٹی ہے، یہ ان کی انشورنس کمپنی ہے، یہ ان کا پراویڈنٹ فنڈ ہے۔ یہ ان کے لئے بے کاروں کا سرمایہ اعانت ہے۔ یہ ان کے لئے معذوروں، اپاہجوں، بیماروں، یتیموں، بیواؤں کا ذریعہ معاش ہے۔ اور ان سب سے بڑھ کر یہ وہ چیز ہے جو مسلمانوں کو فکر فردا سے بالکل بے نیاز کر دیتی ہے۔ اس کا سیدھا سادہ اصول یہ ہے کہ آج تم مالدار ہو تو دوسروں کی مدد کرو، کل تم نادار ہوگئے تو دوسرے تمہاری مدد کریں گے تمہیں یہ فکر کرنے کی ضرورت نہیں کہ مفلس ہوگئے تو کیا ہوگا، مر گئے تو بیوی کا کیا حشر ہوگا۔ کوئی آفت ناگہانی آپڑی بیمار ہوگئے، گھر میں آگ لگ گئی، سیلاب آگیا، دیوالیہ نکل گیا تو ان مصیبتوں سے خلاصی کی کیا سبیل ہوگی۔ سفر میں پیسہ پاس نہ ہو تو کیونکر گذر بسر ہوگی، ان سب فکروں سے صرف زکوٰۃ تم کو ہمیشہ کے لئے بے نیاز کر دیتی ہے۔ تمہارا کام بس اتنا ہے کہ اپنی پس انداز کی ہوئی دولت میں سے ڈھائی فیصد دے کر اللہ کی انشورنس کمپنی میں اپنا بیمہ کرالو، اس وقت تم کو اس دولت کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ ان کے کام آئے گی جو اس کے ضرورت مند ہیں۔ کل جب تم ضرورت مند ہوگے یا تمہاری اولاد ضرورت مند ہوگی تو نہ صرف تمہارا اپنا دیا ہوا مال بلکہ اس سے زیادہ تم کو واپس مل جائیگا۔" (اسلام اور جدید معاشی نظریات ص156۔157)

زکوٰۃ ایک عبادت ہے اس کی تعبدی اہمیت اپنی جگہ ہے اور اصل وہی ہے لیکن اگر کسی عبادت کے دیگر فوائد نص میں مذکور ہوں یا ان کو عقل و بداہت سے سمجھا جا سکے تو ان فوائد کو ملحوظ خاطر رکھنا غلط نہیں ہے۔ اوپر دونوں طرح کی رائیں دی گئی ہیں ایک میں زکوٰۃ کے اخروی اور اخلاقی فوائد کا تذکرہ ہے اور دوسری میں زکوٰۃ کے معاشی فوائد کا بیان ہے۔ دونوں قسم کے فوائد کی اہمیت ہے اور ان میں کوئی تضاد نہیں ہے، زکوٰۃ کے اخلاقی فوائد بھی ہیں اور زکوٰۃ معاشرہ کے ضرورت مند افراد کی خبر گیری کا ذریعہ بھی ہے، زکوٰۃ کے مصارف کا بیان خود اس بات کی دلیل ہے کہ اس کی معاشی اہمیت بھی بہت ہے۔ مصارف زکوٰۃ میں انفرادی اور اجتماعی ضرورت کے جتنے مواقع ہیں سب کا احاطہ کر لیا گیا ہے، اس میں غریب، محتاج، مسافر، مقروض، قیدی اور فی سبیل اللہ کی مدات ہیں اور ان مدات کی اہمیت سراسر معاشی ہے۔ عصر حاضر کے ایک اور بڑے عالم حکیم الطاف احمد اعظمی نے ان آراء میں مزید توازن پیدا کرتے ہوئے مصالح زکوٰۃ کے باب میں لکھا ہے:

"اسلام نے جتنی عبادات فرض کی ہیں ان کا اصلی مقصد تو تقوی پیدا کرنا ہے یعنی نفس کی مخالفت اور خدا کی برضا و رغبت فرماں برداری۔ لیکن حکیم مطلق نے اپنے بندوں کی فلاح کے خیال سے ان عبادات کے لئے جو ضابطہ عمل مقرر کیا اس میں روحانی منافع کے ساتھ

ساتھ دنیاوی مصالح و منافع کی بڑی حکیمانہ رعایت رکھی ہے، مثلاً نماز کو لیں، اس کا مقصد خدا کا ذکر ہے، اور اس ذکر کے ذریعہ اس سے حسّی اور جذباتی طور پر جڑنا ہے۔ اس ذکر کا روحانی فائدہ یہ ہے کہ نمازی اس کے ذریعہ فواحش و منکرات سے محفوظ رہتا ہے۔ (سورہ عنکبوت 45) ٹھیک یہی معاملہ زکوٰۃ کا ہے اس کا بنیادی مقصد نفس کا تزکیہ ہے۔ یعنی حرص و بخل کی آلائشوں سے نفس کو پاک کرنا، تاکہ بندہ حب مال کی بندش سے آزاد ہو جائے کہ یہ چیز خدا کی اطاعت اور اس کی رضاجوئی کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ ہے لیکن اس غرض کے حصول کے لئے جو طریقہ بتایا گیا اور اس کے لئے جو قوانین وضع کئے گئے ان میں بندوں کے معاشی مصالح کی پوری رعایت ملحوظ رکھی گئی ہے۔ مصارف زکوٰۃ سے یہ حقیقت بالکل واضح ہو جاتی ہے۔" (اسلامی عبادات ص252۔353)

8.3 نصاب زکوٰۃ

زکوٰۃ اور صدقات کے لئے اسلام میں تحریض و تشویق زیادہ کی گئی ہے قواعد و ضوابط کم بیان کئے گئے ہیں۔ اصل چیز مال خرچ کرنے کا جذبہ پیدا کرنا ہے اس لئے اس کو صرف ایک حد تک ہی اصول و ضابطوں کا پابند بنایا ہے۔ اسلام کا نقطہ نظر یہ ہے کہ آدمی اللہ کے راستہ میں مال خرچ کرے چاہے امیر ہو یا غریب ہر حال میں مال خرچ کرے، اس کے پاس جو ضرورت سے فاضل ہو اس کو خرچ کر دے، اگر کچھ بھی نہیں ہے تو کما کر خرچ کرے لیکن راہ خداوندی میں مال ضرور خرچ کرے۔

فرض زکوٰۃ کے لئے اسلام نے ایک ضابطہ مقرر کیا ہے کہ وہ امیروں پر فرض ہے، غریبوں پر نہیں، لیکن زکوٰۃ کی فرضیت کے لئے امیر ہونے کے ساتھ اور بھی شرائط ہیں۔ سب سے پہلی شرط تو امیر ہونا ہے۔ شریعت کی نظر میں ہر وہ شخص امیر ہے جس کے پاس اس کی بنیادی ضروریات سے فاضل مال اتنا ہو کہ اس کی مالیت ساڑھے سات تولہ سونا یا ساڑھے باون تولہ چاندی کے بقدر ہو جائے، یا اس کے پاس بالفعل کم از کم اتنا سونا یا چاندی موجود ہو۔ اس کو اسلام کی اصطلاح میں امیر کہتے ہیں۔ اور اس مقدار کو نصاب کہتے ہیں، جس آدمی کے پاس اتنی مالیت ہو وہ امیر ہے۔ اور امیر پر ہی زکوٰۃ فرض ہو گی۔

وجوب زکوٰۃ کی دوسری شرط یہ ہے کہ یہ مال نامی ہو۔ یعنی اس کے منافع آمدنی کی شکل میں انسان کو حاصل ہوتے ہوں۔ جس مال سے آمدنی نہ ہو یا اس کی آمدنی سے براہ راست استفادہ کا موقع نہ ہو اس پر زکوٰۃ نہیں ہے۔ مثلاً رہائشی مکان، کاشت کی زمین وغیرہ، ان چیزوں کی مالیت خواہ کتنی ہی کیوں نہ ہو وہ زکوٰۃ میں شامل نہیں ہوں گی۔ وجوب زکوٰۃ کی تیسری شرط مال پر بالفعل تصرف کا اختیار ہونا ہے۔ جس مال پر کسی ایک شخص کی ملکیت تامہ یعنی پوری ملکیت ثابت ہو، اور وہ اس کو خرچ کر سکتا ہو، اس مال پر زکوٰۃ واجب ہو گی۔ پراویڈنٹ فنڈ یا قرض میں پھنسی ہوئی رقم وغیرہ پر زکوٰۃ نہیں ہے۔ اس لئے رفاہی ادارے، تعلیمی مراکز، ٹرسٹ، موقوفہ املاک یا مساجد وغیرہ پر زکوٰۃ عائد نہیں ہوتی۔

وجوب زکوٰۃ کے لئے چوتھی اور آخری شرط حولان حول ہے۔ یعنی جب کوئی مالدار شخص شرعی اصطلاح کے مطابق نصاب زکوٰۃ کا مالک ہو جائے تو اس پر اس وقت زکوٰۃ واجب نہیں ہوتی، وہ زکوٰۃ ادا کرنے کے لائق اس وقت ہو گا جب یہ امیری پائیدار ہو، لمحاتی نہ ہو۔ اس

کامعیار اسلام نے یہ رکھا ہے کہ اس کے پاس بقدر نصاب مالیت ایک سال تک باقی بھی رہے، تب زکوٰۃ واجب ہو گی، اگر ایک سال سے قبل وہ پھر غریب ہو گیا تو اس پر زکوٰۃ واجب نہیں ہو گی۔

کسانوں پر ان کی فصلوں میں اور مویشی پالنے والوں پر ان کے مویشیوں میں بھی زکوٰۃ ہے۔ اور اسلام نے اس کی بھی کم سے کم مقدار متعین کی ہے۔ زمینی پیداوار میں اسلام نے ایک فرق اور کیا ہے کہ جس زمین کی سینچائی کسان نے خود کی ہو اس میں سے زکوٰۃ کم لی جائے گی اور جس کی سینچائی آسمانی پانی سے ہوئی ہو اس کی زکوٰۃ زیادہ لی جائے گی۔

نقد یا مال تجارت میں زکوٰۃ کی مقدار ڈھائی فیصد ہے۔ اور زرعی پیداوار اور مویشیوں میں زکوٰۃ کی مقدار آگے دیئے چارٹ میں واضح کی گئی ہے۔

نام	مقدار نصاب	زکوٰۃ کی شرح
سونا	ساڑھے سات تولہ	ڈھائی فیصد
چاندی	ساڑھے باون تولہ	ڈھائی فیصد
نقدی	سونے یا چاندی کے نصاب کے بقدر	ڈھائی فیصدق
زرعی پیداوار (اگر آب پاشی خود کی ہے)	حنفیہ کے نزدیک پیداوار کی کوئی مقدار متعین نہیں ہے، باقی ائمہ 5 وسق (تقریباً۔ چھ کوئنٹل ایک من اور تیرہ کلو) سے زائد پر ہی زکاۃ کے قائل ہیں۔	بیسواں حصہ
زرعی پیداوار (اگر بارش کے پانی سے سینچائی ہوئی ہے)		دسواں حصہ
اونٹ	5 سے زیادہ 24 تک	ہر پانچ پر ایک بکری
	25 سے 35 تک	ایک عدد ایک سالہ اوٹنی
	36 سے 45 تک	دو سالہ اونٹنی (ایک)
	46 سے 60 تک	تین سالہ اونٹنی (ایک)
	61 سے 75 تک	چار سالہ اونٹنی (ایک)
	76 سے 90 تک	دو سالہ اونٹنی (دو عدد)
	91 سے 120 تک	تین سالہ اونٹنی (دو عدد)

	120 سے زائد	ہر چالیس پر دو سالہ اور ہر پچاس پر تین سالہ اونٹنی
گائے بھینس	30عدد	ہر تیس گایوں پر دو سالہ ایک بچھڑا اور ہر چالیس گایوں پر تین سالہ ایک بچھڑا۔
بکری	40سے زیادہ 120تک	ایک بکری
	121 سے زیادہ 200تک	دو بکریاں
	201 سے زیادہ 399	تین بکریاں
	400 سے زائد	ہر 100 پر ایک بکری
سامان تجارت	نصاب کے لئے سونے چاندی کا اعتبار ہو گا	کل سامان تجارت کی مالیت کا ڈھائی فیصد
کارخانہ	آمدنی پر زکوٰۃ ہو گی، کارخانہ یا مشینوں پر نہیں ہو گی	ڈھائی فیصد
ہیرے، جواہرات، قیمتی کپڑے، سواری، سامان، فرنیچر وغیرہ	ان سب میں کوئی زکوٰۃ نہیں	

8.4 مصارف زکوٰۃ

اسلام میں صدقات وخیرات کا مصرف کوئی مخصوص طبقہ نہیں ہے بلکہ ضرورت مند ہیں۔ اور صدقات نافلہ کے لئے اسلام نے کوئی پابندی بھی نہیں لگائی ہے، جس کو چاہے صدقہ دے لیکن فرض صدقہ یعنی زکوٰۃ میں مصرف کی پابندی ہے، اگر ان مصارف میں زکوٰۃ دی گئی تب ہی زکاۃ ادا ہو گی، ان کے علاوہ اگر کسی اور کو زکوٰۃ دے دی تو زکوٰۃ ادا نہیں ہو گی۔ اس لئے زکوٰۃ کا مصرف میں دینا ضروری ہے، اور دینا بھی ایسا کہ مصرف یعنی جس کو زکوٰۃ دی گئی ہے وہ اس مال زکوٰۃ کا مالک ہو جائے اور اس پر تصرف کا مکمل اختیار مل جائے۔ اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا کہ اللہ نے مصارف زکوٰۃ کا معاملہ نہ نبی کے اوپر چھوڑا اور نہ کسی اور پر بلکہ ان کا فیصلہ خود فرما دیا، چنانچہ اس کی آٹھ مدات مقرر کیں۔ (ابوداؤد)

زکوٰۃ غریبوں اور مسکینوں کا حق ہے، اس کے باوجود اسلام میں زکوٰۃ کی آٹھ مدات مقرر کی گئیں۔ یہ دراصل زکوٰۃ کے وسیع نظام

اور وسیع تر فوائد کے لئے ہے کیوں کہ بسا اوقات صرف غریب ہی ضرورت مند نہیں ہوتے بلکہ امیر بھی ضرورت مند ہو جاتے ہیں، تو اگر زکوٰۃ صرف غریبوں کے لئے ہوتی تو ضرورت مند امیر بھی اسی معاشرے کا حصہ ہیں وہ ایک بڑی آسانی سے محروم ہو جاتے۔ اس لئے اسلام نے زکوٰۃ کے مصرف کے طور پر اصل بنیاد حاجت کو قرار دیا ہے۔ حاجت یا ضرورت چاہے یک گونہ دائمی ہو یا وقتی، یک گونہ دائمی حاجت فقیر و مسکین کی ہوتی ہے۔ اور وقتی حاجت مسافر و مقروض وغیرہ کی ہوتی ہے۔ قرآن مجید میں مصارف زکوٰۃ کا بیان اس طرح آیا ہے۔

إِنَّمَا الصَّدَقَاتُ لِلْفُقَرَاء وَالْمَسَاكِيْنِ وَالْعَامِلِيْنَ عَلَيْهَا وَالْمُؤَلَّفَةِ قُلُوبُهُمْ وَفِيْ الرِّقَابِ وَالْغَارِمِيْنَ وَفِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَابْنِ السَّبِيْلِ فَرِيْضَةً مِّنَ اللّٰهِ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ (توبہ:16)

”صدقات تو دراصل فقراء مساکین، عاملین زکوٰۃ، تالیف قلب کے مستحقین، نیز اس لئے ہیں کہ گردنوں کو چھڑانے، قرض داروں کے (قرض ادا کرنے) فی سبیل اللہ اور مسافروں کی امداد میں خرچ کئے جائیں“۔

اس آیت میں مذکور مصارف زکوٰۃ کی تفصیل یہ ہے۔

فقراء و مساکین

زکوٰۃ کا اولین مصرف فقراء و مساکین ہیں، سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ فقراء و مساکین کون ہیں، علما نے ان دونوں مصارف کا ذکر کرتے ہوئے دو باتیں بیان کی ہیں ایک گروہ یہ کہتا ہے کہ فقراء و مساکین مترادف الفاظ ہیں، اور دونوں سے مراد حاجت مند اور ضرورت مند لوگ ہیں۔ اور الفاظ کی تکرار احتیاج کو بیان کرنے کے لئے ہوئی ہے ورنہ مفہوم کے اعتبار سے دونوں ایک ہیں۔

زیادہ تر علماء دونوں کو الگ الگ بتاتے ہیں، اور فقیر و مسکین کی تعریف الگ الگ کرتے ہیں۔ حنفیہ کے نزدیک فقیر وہ ہے جو صاحب نصاب نہ ہو یعنی اس کے پاس ملکیت تو ہو لیکن اتنی ملکیت نہ ہو کہ وہ صاحب نصاب ہو جائے اور مسکین اس کو کہتے ہیں جس کے پاس کوئی ملکیت ہی نہ ہو۔

قرآن و حدیث کے نصوص سے ایک بات کا عندیہ ملتا ہے کہ وہ نادار جو لوگوں سے سوال نہیں کرتا وہ فقیر ہے۔ جیسا کہ سورہ بقرہ کی آیت 273 میں مذکور ہے۔ اور مسکین وہ ہے جو سوال کرتا ہے۔ مسکنت میں ذلت کا پہلو ہے اور اسلام میں سوال ایک ذلت ہی ہے اس لئے مسکین اس کو کہا جاتا ہے جو لوگوں سے سوال کرتا ہے اور فقیر وہ ہے جو سوال نہیں کرتا۔ حالانکہ اس کے برعکس بھی استعمال ہوا ہے اس طرح حاجت مندوں کی دو قسمیں ہو گئیں۔ اور اس لئے قرآن میں فقیر اور مسکین کو دو الگ الگ زمرے کے طور پر استعمال کیا گیا ہے۔ ان دونوں زمروں کے تعین میں اور بھی گفتگو کی گئی ہے۔ خلاصہ سب کا یہی ہے کہ غریب آدمی جس کے پاس بقدر نصاب مال نہ ہو یا اس کی آمدنی کے ذرائع اتنے ہوں کہ اس کے اور اس کے زیر کفالت لوگوں کے اخراجات پورے طور پر ان کی ضروریات کے لئے ناکافی ہوں، ایسے لوگوں کو زکوٰۃ دی جانی چاہئے یہ زکوٰۃ کے اولین مصارف ہیں۔

عاملین زکوٰۃ

زکوٰۃ کا دوسرا مصرف وہ لوگ ہیں جو زکوٰۃ کی وصولیابی اور تقسیم کا انتظام کرتے ہیں۔ ایسے لوگ اگر امیر ہوں اور خود صاحب نصاب ہوں تب بھی وہ زکوٰۃ لے سکتے ہیں، اس میں کوئی حرج نہیں۔ زکوٰۃ کی اس مد سے ایک اور نکتہ بھی سمجھ میں آتا ہے کہ زکوٰۃ کا نظام اجتماعی ہونا چاہئے انفرادی نہیں۔ چوں کہ عاملین زکوٰۃ کا ایک پورا محکمہ ہوگا جس کے تحت لوگ مختلف قسم کی زکوٰۃ وصول کریں گے اور پھر اس کو مستحقین تک پہنچائیں گے یہ کام انفرادی طور پر نہیں ہو سکتا۔ اس کے لیے اجتماعی نظام ضروری ہے۔ لیکن جیسا کہ دوسری نصوص میں صراحت ہے، اگر کوئی شخص انفرادی طور پر اپنے مال کی زکوٰۃ نکال دے تو یہ بھی جائز ہے۔

مؤلفۃ القلوب

ترتیب کے لحاظ سے مؤلفۃ القلوب زکوٰۃ کا چوتھا مصرف ہے۔ مؤلفۃ القلوب میں غیر مسلم یا جدید الاسلام لوگ شامل ہیں جن کی تالیف قلب کے ذریعہ ان کو اسلام کی طرف ترغیب دی جاتی ہے، رسول اللہؐ نے ایک غیر مسلم صفوان بن امیہ کو زکوٰۃ کے مال میں سے مدد دی تھی۔ اس لئے تالیف قلب کے مقصد سے غیر مسلم کو بھی زکوٰۃ دی جاسکتی ہے۔ ورنہ زکوٰۃ صرف مسلمانوں کا حق ہے۔

بعض علماء کے نزدیک یہ مد یعنی مؤلفۃ القلوب اب منسوخ ہو چکی ہے۔ حضرت عمرؓ نے اس مد کے بارے میں فرمایا تھا کہ مؤلفۃ القلوب کو زکوٰۃ جب دی جاتی تھی جب اسلام کمزور تھا اب اس کی ضرورت نہیں ہے۔

غلاموں کی آزادی

زکوٰۃ کا پانچواں مصرف غلاموں کو آزاد کرانا ہے، یہ مد اب بدلے ہوئے حالات میں باقی نہیں رہی۔

مقروض

زکوٰۃ کا چھٹا مصرف غارم یعنی مقروض ہیں۔ ایک شخص چاہے عام حالات میں زکوٰۃ کا مستحق نہ ہو لیکن اگر وہ کسی وجہ سے مقروض ہو جائے تو اس کی قرض کی ادائیگی زکوٰۃ کی مد سے بھی کی جاسکتی ہے۔ لیکن مقروض کے سلسلہ میں فقہاء نے بعض شرائط لکھی ہیں۔ جیسے قرض ادا نہ کرنے کی وجہ سے اس کو ذلت کا سامنا ہو، قرض کسی معصیت کے لئے نہ لیا ہو، نمود و نمائش یا تقریب وغیرہ میں اسراف کے لئے بھی مقروض نہ ہوا ہو وغیرہ۔ اگر کسی واقعی مجبوری کی وجہ سے مقروض ہوا ہے تو اس کے قرض کی ادائے گی زکوٰۃ کے مال سے کی جاسکتی ہے۔

فی سبیل اللہ

زکوٰۃ کا ساتواں مصرف فی سبیل اللہ ہے۔ فی سبیل اللہ میں بڑی وسعت ہے۔ اس میں جہاد، ہجرت، اشاعت اسلام اور موجودہ زمانے میں مدارس اسلامیہ اور دعوتی لٹریچر کی تیاری وغیرہ آتے ہیں۔ زکوٰۃ کی مد سے ان تمام امور میں امداد کی جاسکتی ہے۔ بعض علماء فی سبیل اللہ کی مد کو جہاد تک محدود رکھتے ہیں۔

ابن السبیل (مسافر)

زکوٰۃ کا آٹھواں مصرف ابن السبیل ہے یعنی مسافر، مسافر حالت سفر میں ایک غریب ہی کے مانند ہو جاتا ہے چونکہ مسافر اپنے گھر پہ چاہے امیر ہو لیکن اس کی دولت اس سے دور ہے اس لئے مسافروں کی امداد بھی زکوٰۃ کی مد سے کی جاسکتی ہے۔ موجودہ زمانہ میں بعض سہولیات ایسی فراہم ہوگئی ہیں کہ تصرفات مالیہ کے لیے بھی فاصلے بے معنی ہوگئے، وہیں اے ٹی ایم کی سہولت نے انسان کو ہر جگہ یہ موقعہ فراہم کر دیا ہے کہ وہ اپنے اکاؤنٹ سے پیسے نکال سکتا ہے اس لیے ابن السبیل کی مد کا استعمال بھی شاذونادر ہی ہوگا۔

8.5 طریقہ زکوٰۃ

زکوٰۃ ادا کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ جب حولان حول ہو جائے یعنی نصاب پر ایک سال گذر جائے تو فوراً زکوٰۃ ادا کر دی جائے، اور اگر غلہ یا اجناس کی قسم ہو تو جیسے ہی فصل تیار ہو کر گھر آجائے فوراً عشر یا نصف عشر نکال دیا جائے، اگر مویشی ہوں تو جیسے ہی مویشیوں کی تعداد نصاب کو پہنچ جائے تو فوراً ادا کر دی جائے۔ زکوٰۃ کی ادائے گی میں تاخیر گناہ کا سبب ہے۔ البتہ تعجیل کی جاسکتی ہے، مثلاً کسی کے اوپر شوال کے مہینہ میں زکوٰۃ واجب ہوتی ہے لیکن وہ رمضان میں نکالنا چاہے تو رمضان میں زکوٰۃ نکال سکتا ہے اس کی شوال تک کی زکوٰۃ ادا ہو جائے گی۔

زکوٰۃ فرض ہوتے ہی ادا کرنا ضروری نہیں ہے۔ زکوٰۃ کے روپیہ یا عشر کا غلہ الگ کر کے رکھ لیا جائے اور اس کو حسب سہولت خرچ کیا جائے تو جائز ہے۔

زکوٰۃ چونکہ فرض ہے اس لئے زکوٰۃ نکالنے والے کی ذمہ داری ہے کہ وہ اسے مستحق زکوٰۃ تک پہنچائے، اگر زکوٰۃ مستحق تک نہیں پہنچی تو زکوٰۃ ادا نہیں ہوگی۔ البتہ جہاں زکوٰۃ کا اجتماعی نظام ہے تو نظام پر اعتماد کیا جاسکتا ہے۔ زکوٰۃ کی رقم کو زکوٰۃ کہہ کر دینا ضروری نہیں ہے بلکہ یہ تحفہ یا بغیر کسی نام کے دی جاسکتی ہے۔ البتہ دینے والے کی نیت زکوٰۃ کی ہونی چاہیے۔ زکوٰۃ دینے والے کو یہ بتانا ضروری نہیں ہے کہ یہ مال زکوٰۃ میں سے دیا جارہا ہے۔

زکوٰۃ ان لوگوں کو نہیں دی جاسکتی جن کی کفالت زکوٰۃ دینے والے کے ذمہ واجب ہے۔ ان کے علاوہ باقی رشتہ داروں کو زکوٰۃ دی جاسکتی ہے، بلکہ پسندیدہ ہے کہ اگر زکوٰۃ انفرادی طور پر نکالی جارہی ہو تو اپنے قریبی رشتہ داروں کو دی جائے۔

زکوٰۃ میں اس کا اہتمام کرنا چاہیے کہ اگر ممکن ہو تو مستحق زکوٰۃ کی اس طرح امداد کی جائے کہ آگے چل کہ وہ خود زکوٰۃ دینے والا ہو جائے۔ یعنی زکوٰۃ بھیک نہیں ہے معاشی سرگرمی ہے۔

قرض اور ادھار کی بھی زکوٰۃ واجب ہوتی ہے۔ اس کی صورت یہ ہے کہ قرض جب ادا ہو تو اس وقت اس کی زکوٰۃ ادا کی جائے، مثلاً اگر دو سال کے بعد قرض ادا ہو تو ایک ساتھ دو سال کی زکوٰۃ ادا کی جائے گی اور تین سال بعد قرض ادا ہو تو تین سال کی زکوٰۃ واجب ہوگی۔ قرض کے معاملے کی آدمی اپنے طور پر بھی تنظیم کر سکتا ہے مثلاً اپنے پاس سے قرض کی زکوٰۃ ادا کرتا رہے جب قرض وصول ہو جائے گا تو اس میں سے زکوٰۃ دینے کی ضرورت نہیں ہوگی۔ اسی طرح تھوڑا تھوڑا وصول ہوتا رہے تو اس کی زکوٰۃ ادا کرتا رہے۔

قرض کی کئی قسمیں ہیں۔ قرض کی ایک قسم دین ضعیف ہے۔ وہ ایسا قرض ہوتا ہے جس پر انسان کو ابھی تک مالکانہ حق حاصل ہی نہیں ہوئے تھے لیکن اس کا حق ثابت ہو گیا ایسے مال میں سے قرض کی وصولی کے فوراً بعد زکوٰۃ نکالنا ضروری نہیں ہے بلکہ مال کے قبضہ میں آنے کے بعد اس پر سال گذرنا ضروری ہے تب زکوٰۃ واجب ہوگی، اس لئے کہ مال کی وصولیابی کے بعد ہی اس پر ملکیت اور تصرف کا حق اس کو ملا تھا۔ مثلاً مہر کی رقم اسی طرح پراویڈنٹ فنڈ وغیرہ کا بھی یہی حکم ہے کہ جب وہ مال ملے گا تب اس پر ملکیت ثابت ہوگی اور اس کے بعد اس پر زکوٰۃ واجب ہوگی۔ بینک میں جمع شدہ رقم یا فکس ڈپازٹ وغیرہ کا مسئلہ یہ ہے کہ وہ نصاب زکوٰۃ میں شامل ہوگی، البتہ بینک سے جو سود ملتا ہے وہ حرام مال ہے وہ مال زکوٰۃ کے قابل نہیں ہے۔ اس کو بلا نیت ثواب کسی کو دینا ضروری ہے۔

زکوٰۃ کے سلسلہ میں ایک بات یہ بھی ہے کہ زکوٰۃ جس علاقے سے وصول کی جائے گی اصلاً اس کے مستحق اسی علاقے کے غرباء و مساکین ہیں۔ دوسری جگہ صرف کی جائے تو جائز ہے، بہتر یہی ہے کہ جہاں سے زکوٰۃ وصول ہوئی ہے اسی علاقے میں صرف کی جائے۔

8.6 اکتسابی نتائج

اس اکائی میں آپ نے درج ذیل نکات سیکھے:

- زکوٰۃ کے لفظی معنی پاک کرنے اور بڑھنے کے آتے ہیں۔ زکوٰۃ کے ذریعہ انسان اپنے مال کو پاک کرتا ہے۔ اس لیے اس کو زکوٰۃ کہا جاتا ہے اور اللہ اموال میں اضافہ فرماتا ہے، ان کو بڑھاتا ہے اس لئے بھی زکوٰۃ کہا جاتا ہے۔ زکوٰۃ اسلام میں ایک بنیادی رکن ہے۔ قرآن مجید میں نماز اور زکوٰۃ دونوں کے ادا کرنے کا حکم کثرت سے ایک ساتھ آیا ہے۔ اس لئے نماز اور زکوٰۃ دونوں کو ایک درجہ کا فریضہ مانا جاتا ہے، زکوٰۃ دراصل مالی عبادت ہے اور نماز بدنی عبادت ہے۔ ایک عبادت انسان کو دربار خداوندی میں پہنچاتی ہے اور دوسری عبادات تزکیہ کر کے اس کو پاک کرتی ہے۔
- اسلام کی نظر میں غریبوں کی امداد و اعانت بہت بنیادی ذمہ داری ہے اور غربت و افلاس ایک طرح کی ذلت و خواری ہے۔ اس لئے اسلام میں سوال کرنے سے منع کیا گیا ہے اور غربت و افلاس کی پستی سے نکل کر جود و سخا کی بلندی تک پہنچنے کو پسند فرمایا گیا ہے۔
- اسلام نے مال خرچ کرنے میں کچھ بنیادی اصلاحات بھی کی ہیں۔ مثلاً جو مال خدا کی راہ میں خرچ کیا جائے اس کے مستحق صرف غریب لوگ ہیں۔ کوئی مخصوص نسل، یا طبقہ، یا قوم نہیں ہے اور زکوٰۃ کا ایک مقصد معاشرے سے غربت کا خاتمہ کرنا ہے۔ یعنی معاشی سرگرمیوں میں اضافہ کرنا۔
- زکوٰۃ صرف امیروں پر فرض ہے اور اسلام کی نظر میں امیر وہ ہے جو صاحب نصاب ہو یعنی اس کے پاس اس کی بنیادی ضروریات (مکان، سواری، لباس، فرنیچر اور زمین جائداد) کے علاوہ ساڑھے سات تولہ سونا یا ساڑھے باون تولہ چاندی یا اتنی مالیت کا روپیہ ہوں اور ان پر ایک سال گزر جائے اس کو اصطلاح میں حولان حول کہتے ہیں۔
- زکوٰۃ جس طرح سونا و چاندی میں ہے اسی طرح زمینی پیداوار اور مویشیوں میں بھی ہے۔ سونا چاندی میں زکوٰۃ ڈھائی فیصد ہے اور

زمینی پیداوار کی سینچائی اگر بارش کے پانی سے ہوئی ہے تو دسواں حصہ اور اگر خود سنچائی کی ہے تو بیسواں حصہ نکالنا ضروری ہے۔

- قرآن مجید کی رو سے مصارف زکوٰۃ آٹھ ہیں۔ فقراء و مساکین، عاملین زکوٰۃ، موکلفۃ القلوب، مقروض، غلام، مسافر اور ان کے علاوہ اللہ کے راستہ میں خرچ کرنا۔ یعنی فی سبیل اللہ بھی ایک باضابطہ مد ہے۔
- زکوٰۃ نکالنے کا طریقہ یہ ہے کہ جب حولان حول ہو جائے تو فوراً زکوٰۃ نکال دی جائے۔ اگر فوری طور پر کوئی مستحق زکوٰۃ نہ ملے تب بھی زکوٰۃ کا نکالنا ضروری ہے یعنی اس کو الگ کر کے رکھ لے اور حسب سہولت مصرف زکوٰۃ کو دے دے، زکوٰۃ وقت سے پہلے بھی ادا کی جاسکتی ہے۔ البتہ وقت ہو جانے کے بعد زکوٰۃ کے مال کو متعین کر کے رکھ دینا ضروری ہے۔
- زکوٰۃ صرف ان لوگوں کو نہیں دی جاسکتی جن کی کفالت انسان کے ذمہ واجب ہے۔ ان کے علاوہ ہر ایک غریب کو دی جاسکتی ہے اس لئے اگر انفرادی طور پر زکوٰۃ نکالے تو پسندیدہ ہے کہ اگر اس کے اقرباء و اعزاء غریب ہوں تو پہلے ان کو زکوٰۃ دے، زکوٰۃ کو ہدیہ یا تحفہ کے نام سے بھی دیا جاسکتا ہے، لفظ زکوٰۃ کہہ کر دینا ضروری نہیں ہے۔

8.7 نمونہ امتحانی سوالات

8.7.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات

1. خدا کی راہ میں مال خرچ کرنے کی تلقین ہر مذہب میں ہے۔

(a). صحیح
(b). غلط

2. زکوٰۃ کس کو دی جاسکتی ہے؟

(a). تمام مسلمانوں کو
(b). مالدار لوگوں کو
(c). فقیر و مسکین
(d). سب غلط

3. زکوٰۃ کا مقصد کیا ہے؟

(a). مالدار بنانا
(b). فقیر بنانا
(c). مال کی پاکیزگی
(d). ذخیرہ اندوزی

4. نقد یا مال تجارت میں زکوٰۃ کی مقدار کتنی فیصد ہے؟

(a). ڈھائی فیصد
(b). پانچ فیصد
(c). ایک فیصد
(d). سات فیصد

5. قرآن مجید کی رو سے مصارف زکوٰۃ کتنے ہیں؟

(a). پانچ
(b). سات
(c). آٹھ
(d). تین

6. زکوٰۃ کے لفظی معنی بتائیں؟

(a). پاک کرنا اور بڑھنا
(b). کم کرنا
(c). رکنا
(d). سب غلط

7. کتنے سونے پر زکوٰۃ واجب ہے؟

(a). ساڑھے سات تولہ (b). ساڑھے باون تولہ (c). گیارہ تولہ (d). سب غلط

8. کتنی چاندی پر زکوٰۃ واجب ہے؟

(a). سات تولہ (b). ساڑھے باون تولہ (c). گیارہ تولہ (d). سب غلط

9. زکوٰۃ کن پر فرض ہے؟

(a). امیروں پر (b). غریبوں پر (c). مسکینوں پر (d). سبھی پر

10. زکوٰۃ اسلام کا بنیادی رکن ہے؟

(a). صحیح (b). غلط

8.7.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات

1. انسانی معاشرہ پر زکوٰۃ کے کیا اثرات مرتب ہوتے ہیں؟ نوٹ لکھیے۔
2. صاحب نصاب ہونے کا کیا مطلب ہے؟ بیان کیجیے۔
3. زکوٰۃ ادا کرنے کے طریق کار پر بحث کیجیے۔
4. زکوٰۃ کے اولین مصارف پر روشنی ڈالیے۔
5. زکوٰۃ کی اہمیت بیان کیجیے۔

8.7.3 طویل جوابات کے حامل سوالات

1. زکوٰۃ کا تفصیلی تعارف پیش کیجیے۔
2. نصاب زکوٰۃ پر روشنی ڈالیے۔
3. مصارف زکوٰۃ اور ان کی قسموں پر بحث کیجیے۔

8.8 تجویز کردہ اکتسابی مواد

1. سیرۃ النبی : سید سلیمان ندوی
2. اسلامی فقہ : مولانا مجیب اللہ ندوی
3. اسلامی عبادات : الطاف احمد اعظمی
4. اسلام ایک نظر میں : مولانا صدر الدین اصلاحی
5. اسلامی عبادات : عفیف عبد الفتاح طیارہ

اکائی 9: حج

اکائی کے اجزا:

9.0 تمہید

9.1 مقاصد

9.2 تعارف اور مصالح

9.3 عظمت خداوندی کا اظہار

9.4 توحید کا عملی اظہار

9.5 خراج عقیدت

9.6 ارکان و مناسک

9.7 اجتماعیت

9.8 مساوات

9.9 باہمی تعارف

9.10 اکتسابی نتائج

9.11 نمونہ امتحانی سوالات

- 9.11.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات
- 9.11.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات
- 9.11.3 طویل جوابات کے حامل سوالات

9.12 تجویز کردہ اکتسابی مواد

9.0 تمہید

حج ایک اہم عبادت ہے جو صاحب استطاعت مسلمان پر زندگی میں صرف ایک مرتبہ فرض ہوتی ہے، فرض ہو جانے کے بعد حج کا وہی مقام ہوتا ہے جو روزہ اور نماز کا ہے۔ حج فرض ہو جانے کے بعد حج نہ کرنے والا شخص گنہگار ہو گا، حج کی فرضیت، شرائط، ارکان، واجبات اور طریقہ نیز حج کے فوائد کا جان لینا ضروری ہے تا کہ اسلامی عبادات میں حج کی صحیح حیثیت متعین کی جا سکے۔ اس اکائی میں طلبہ کو یہ بتانے کی کوشش کی جائے گی کہ حج کیا ہے۔ اس کے بنیادی اجزاء کیا ہیں۔ حج کی اہم اصطلاحات کیا ہیں۔ حج کیوں فرض کیا گیا۔ اس کے روحانی اور سماجی فوائد و مصالح کیا ہیں۔

9.1 مقاصد

اس اکائی کا مقصد اس اکائی کے مطالعہ کے بعد آپ اس بات سے واقف ہو جائیں گے کہ اسلام میں حج کا کیا مطلب ہے، حج کی عبادت کس طرح اور کب ادا کی جاتی ہے، آپ یہ بھی جان لیں گے حج کے مصالح اور فوائد کیا ہیں اور اس کے ارکان اور مناسک کس طرح ادا کئے جاتے ہیں۔

9.2 تعارف اور مصالح

حج کا لفظی ترجمہ زیارت کے ارادے سے نکلنا ہے۔ شریعت میں حج کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ ایام حج میں بیت اللہ کی زیارت کے ارادہ سے نکلنا اور وہاں حج کے ارکان ادا کرنا۔ حج اسلام کا پانچواں رکن ہے۔ اور صاحب استطاعت افراد پر حج ادا کرنا اسی طرح فرض ہے جس طرح نماز و روزے کا ادا کرنا فرض ہے۔ استطاعت کے باوجود حج نہ کرنے والوں پر اللہ کے رسولؐ نے سخت وعید فرمائی ہے۔

حج کی فرضیت کا ذکر قرآن مجید میں ان الفاظ میں وارد ہوا ہے۔ سورہ آل عمران کی آیت میں ہے۔

وَلِلّٰہِ عَلَی النَّاسِ حِجُّ الْبَیْتِ مَنِ اسْتَطَاعَ إِلَیْہِ سَبِیْلاً وَمَن کَفَرَ فَإِنَّ الله غَنِیٌّ عَنِ الْعَالَمِیْنَ (آل عمران:97)

”لوگوں کے ذمے یہ اللہ کا حق ہے کہ جو اس کے گھر تک جانے کی استطاعت رکھتا ہو وہ حج کرے اور جس نے کفر کی روش اختیار کی تو وہ جان لے کہ اللہ سارے جہانوں سے بے نیاز ہے“۔

احادیث میں بھی حج کی فرضیت کا ذکر آیا ہے۔ ایک حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جس کو کسی بیماری نے یا واقعی ضرورت نے یا کسی ظالم حکمراں نے روک نہ رکھا ہو اور اس کے باوجود وہ حج نہ کرے تو وہ چاہے یہودی مرے یا نصرانی ہو کر (سنن بیہقی)

ایک اور روایت میں آیا ہے حضرت ابو ہریرہؓ روایت کرتے ہیں کہ اللہ کے رسولؐ نے ایک دن تقریر کی اور فرمایا کہ اے لوگو تم پر حج فرض کیا گیا ہے اس لئے تم حج کرو (بخاری و مسلم)

ایک حدیث میں آیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مقبول حج کا بدلہ جنت کے سوا اور کچھ نہیں ہے (مسلم) ایک دوسری روایت میں حج کی فضیلت اس طرح وارد ہوئی ہے کہ جو شخص اس گھر یعنی بیت اللہ کا حج کرے اور اس دوران وہ نہ تو کوئی شہوانی حرکت کرے، نہ کسی معصیت کا ارتکاب کرے تو جب وہ حج کر کے لوٹے گا تو ایسا پاک وصاف ہو گا جیسا کہ اس دن تھا جب اس کی ماں نے اس کو پیدا کیا تھا (بخاری)

حج کی اس اہمیت وفضیلت اور فرضیت کے پیچھے دراصل ایک پوری تاریخ ہے۔ خدا کے راستہ میں قربانی ایمان باللہ اور اللہ کے لئے مشکلات و مصائب کو خندان پیشانی سے برداشت کرنے کی ایک روشن تاریخ۔ کس طرح اللہ کا گھر تعمیر کیا گیا۔ کس طرح اس کے لئے قربانیاں دی گئیں اور کس طرح ایمان کا عملی مظاہرہ کیا گیا ان سب کی تاریخ کے بغیر حج کی حقیقت اور اس کی اہمیت واضح نہیں ہو سکتی۔

حج مکہ میں واقع بیت اللہ کی زیارت اور وہاں مخصوص ارکان کی ادائیگی کا نام ہے۔ جس مقام پر اب کعبہ موجود ہے یہاں اب سے تقریباً اکتالیس سو سال پہلے ایک بے آب وگیاہ میدان تھا، اور دور دور تک کسی آبادی کا نام ونشان نہیں تھا۔ چاروں طرف خشک چٹانیں یا ریتیلا میدان تھا، اس میں حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اللہ کے حکم سے اپنے اکلوتے شیر خوار بچے اور اپنی بیوی حضرت ہاجرہؓ کو اس میدان میں چھوڑ دیا، صابر بیوی نے جو اللہ کے لئے حضرت ابراہیم کی قربانیوں سے اور حضرت ابراہیم کے ایمان سے واقف تھی اس سرزمین پر رہنا قبول کر لیا اور خدا کے بھروسے معمولی زادراہ کے ساتھ یہاں سکونت اختیار کر لی۔

یہاں نہ پانی تھا نہ غذا۔ اس لئے ماں نے پانی کی تلاش میں بچے کو چٹان کے سایہ میں لٹا دیا اور دو پہاڑیوں کے درمیان پانی کی تلاش میں سرگرداں پھری اور ایک پہاڑی سے دوسری پہاڑی کے درمیان سات چکر لگائے۔ خدا کو یہ قربانی پسند آئی اور اس بے آب وگیاہ میدان میں زمزم کا لازوال چشمہ جاری کر دیا۔ حیات بخش پانی کی خبر پرندوں کی آمد ورفت سے قریب سے گذرنے والے قافلوں کو ہوئی اور یہاں ایک عارضی بستی وجود میں آگئی۔ دن مہینوں میں اور مہینے سالوں میں بدلتے رہے اور آخر وہ بچہ بڑا ہو گیا۔ باپ کی آمد ورفت رہتی تھی۔ ایک موقعہ پر ایک بڑا امتحان اور آ گیا۔ خدا کی طرف سے حکم ہوا کہ بچے کو خدا کی راہ میں قربان کر دو۔ یہ ایک بڑی آزمائش تھی لیکن حضرت ابراہیم علیہ السلام اس میں بھی پورے اترے اور انہوں نے اپنے بیٹے کو خدا کی راہ میں قربان کرنے کا ارادہ کر لیا۔ قرآن مجید میں اس کا تذکرہ یوں ہے۔

فَلَمَّا أَسۡلَمَا وَتَلَّهُ لِلۡجَبِيۡنِ ۔ وَنَادَيۡنَاهُ أَنۡ يَا إِبۡرَاهِيۡمُ ۔ قَدۡ صَدَّقۡتَ الرُّؤۡيَا إِنَّا كَذٰلِكَ نَجۡزِیۡ الۡمُحۡسِنِيۡنَ

(صافات103۔104)

”جب ان (ابراہیم واسماعیل) دونوں نے فرماں برداری کی اور اس کو پیشانی کے بل لٹا دیا تو ہم نے اس کو آواز دی اے ابراہیم تو نے اپنا خواب سچ کر دکھایا، ہم یوں ہی اچھے کام کرنے والوں کو بدلہ دیتے ہیں“۔

اس بڑی آزمائش میں ثابت قدم رہنے کے بعد اللہ نے ان کو بطور انعام دنیا کی امامت کے منصب پر فائز کیا، اس کا تذکرہ قرآن میں اس طرح آیا ہے۔

وَإِذِ ابْتَلَى إِبْرَاهِيمَ رَبُّهُ بِكَلِمَاتٍ فَأَتَمَّهُنَّ قَالَ إِنِّي جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ إِمَاماً (البقرة-124)

”اور جب ابراہیم کے پرور دگار نے چند باتوں میں اس کو آزمایا پھر اس نے ان کو پورا کر دیا تو خدا نے اس سے کہا کہ میں تجھ کو لوگوں کا امام بنانے والا ہوں“۔

اس کے بعد اللہ نے حضرت ابراہیم اور حضرت اسماعیل علیہما السلام کو حکم دیا کہ وہ خدا کی عبادت کے لئے ایک گھر تعمیر کریں تاکہ اس میں صرف ایک خدا کی عبادت کی جائے۔

وَإِذْ بَوَّأْنَا لِإِبْرَاهِيمَ مَكَانَ الْبَيْتِ أَن لَّا تُشْرِكْ بِي شَيْئاً وَطَهِّرْ بَيْتِيَ لِلطَّائِفِينَ وَالْقَائِمِينَ وَالرُّكَّعِ السُّجُودِ (حج:26)

اور جب ہم نے ابراہیم کے لئے اس گھر کی جگہ کو ٹھکانہ بنایا کہ میرے ساتھ کسی کو ساجھی نہ ٹھہرانا اور میرے گھر کو طواف کرنے والوں قیام کرنے والوں اور رکوع و سجود کرنے والوں کے لئے پاک رکھنا۔

اللہ نے اس گھر کو امن کی جگہ قرار دیا:

وَإِذْ جَعَلْنَا الْبَيْتَ مَثَابَةً لِّلنَّاسِ وَأَمْناً وَاتَّخِذُواْ مِن مَّقَامِ إِبْرَاهِيمَ مُصَلًّى (البقرة:125)

یاد کرو جب ہم نے اس گھر کو مرکز اور امن قرار دیا اور حکم دیا کہ مقام ابراہیم کو سجدہ کی جگہ اور نماز پڑھنے کی جگہ بنالو۔

بیت اللہ کا یہ گھر دراصل خدائے واحد کی عبادت کے لئے بنایا گیا پہلا گھر تھا اور ہدایت کا عالمی مرکز تھا۔

إِنَّ أَوَّلَ بَيْتٍ وُضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِي بِبَكَّةَ مُبَارَكاً وَهُدًى لِّلْعَالَمِينَ۔ فِيهِ آيَاتٌ بَيِّنَاتٌ مَّقَامُ إِبْرَاهِيمَ وَمَن دَخَلَهُ كَانَ آمِناً (آل عمران:96)

یقیناً پہلا گھر جو لوگوں کے لئے مرکز عبادت بنایا گیا وہی ہے جو مکہ میں ہے۔ وہ برکتوں والا ہے اور سارے جہانوں کے لئے ہدایت ہے۔ اس میں واضح نشانیاں ہیں، مقام ابراہیم ہے جو اس میں داخل ہوگا وہ مامون ہے۔

عظیم قربانی اور خدائے واحد کی عبادت کے لئے اس سے پہلے گھر کی تعمیر کے بعد حضرت ابراہیم علیہ السلام نے کچھ دعائیں مانگیں اور اللہ تعالی نے ان دعاؤں کو اپنے فضل و کرم سے قبول فرمایا، ان میں سے ایک دعا یہ تھی۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا إِنَّكَ أَنتَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ ۔ رَبَّنَا وَاجْعَلْنَا مُسْلِمَيْنِ لَكَ وَمِن ذُرِّيَّتِنَا أُمَّةً مُّسْلِمَةً لَّكَ وَأَرِنَا مَنَاسِكَنَا وَتُبْ عَلَيْنَا إِنَّكَ أَنتَ التَّوَّابُ الرَّحِيمُ (البقرة:127)

”خدایا ہمارے اس عمل کو قبول فرما۔ یقیناً تو سب کچھ سنتا اور سب کچھ جانتا ہے، مالک ہمیں اپنا فرمانبر دار بنا اور ہماری اولاد میں سے ایک گروہ پیدا فرمایا جو تیرا فرمانبر دار ہو اور ہمیں اپنی عبادت کے طریقے بتا، ہم پر کرم کی نظر فرما تو بے شک نظر کرم کرنے والا ہے“۔

ایک دعا یہ مانگی۔

رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيهِمْ رَسُولاً مِّنْهُمْ يَتْلُو عَلَيْهِمْ آيَاتِکَ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَيُزَكِّيهِمْ (البقرة: 129)

اے ہمارے پرورد گار ان کے اندر انہی میں سے ایک ایسا رسول پیدا فرما جو انہیں تیری آیتیں پڑھ کر سنائے، تیرے احکام بتائے، حکمت سمجھائے اور ان کا تزکیہ کرے۔

اللہ نے حضرت ابراہیم اور حضرت اسماعیل کی اولاد میں امت وسط برپا فرمائی اور ان کی اولاد میں آخری نبی جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مبعوث فرمایا۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اس مقام مقدس پر اور بھی دعائیں مانگی تھیں جن کا تذکرہ قرآن کریم میں موجود ہے۔ اس کے بعد اللہ تعالی نے بیت اللہ کو مرکز قرار دے کر حج کی منادی کرائی۔ اور اس دن سے برابر لوگ جوق در جوق اس مقام محمود کی زیارت کے لیے آتے ہیں۔ آئینہ ماہ و ایام گواہ ہے کہ اس گھر کی زیارت کرنے والوں کی تعداد میں وقت کے ساتھ اضافہ ہی ہوتا رہا اور آخر ایک وقت وہ آیا کہ حج کا انتظام کرنے والے مجبور ہوئے کہ حج کے لئے آنے والے لوگوں کی تعداد کو محدود کریں کہ اس تعداد سے زیادہ لوگوں کو ایک سال میں حج کے لئے آنے کی اجازت نہیں ہے ورنہ انتظام میں خلل واقع ہو جائے گا۔

وَأَذِّن فِي النَّاسِ بِالْحَجِّ يَأْتُوکَ رِجَالاً وَعَلَى كُلِّ ضَامِرٍ يَأْتِينَ مِن كُلِّ فَجٍّ عَمِيقٍ ۔ لِيَشْهَدُوا مَنَافِعَ لَهُمْ وَيَذْكُرُوا اسْمَ اللَّهِ فِي أَيَّامٍ مَّعْلُومَاتٍ عَلَى مَا رَزَقَهُم مِّن بَهِيمَةِ الْأَنْعَامِ فَكُلُوا مِنْهَا وَأَطْعِمُوا الْبَائِسَ الْفَقِيرَ ۔ ثُمَّ لْيَقْضُوا تَفَثَهُمْ وَلْيُوفُوا نُذُورَهُمْ وَلْيَطَّوَّفُوا بِالْبَيْتِ الْعَتِيقِ ۔ ذَٰلِکَ وَمَن يُعَظِّمْ حُرُمَاتِ اللَّهِ فَهُوَ خَيْرٌ لَّهُ عِندَ رَبِّهِ (حج 26-30)

”لوگوں میں حج کا اعلان کر دے وہ تیرے پاس پیادہ اور (دور کے سفر سے تھکی ماندی) دبلی سواریوں پر ہر دور دراز راستوں سے آئیں گے تا کہ وہ اپنے نفع کی جگہوں پر حاضر ہوں اور ہم نے ان کو جو چوپائے جانور رزق میں دیے ہیں (ان کی قربانی) چند معلوم دنوں میں خدا کا نام لیں تو ان میں سے کچھ تم کھاؤ اور بدحال فقیر کو کھلاؤ، اس کے بعد اپنا میل کچیل دور کریں اور اپنی منتیں پوری کریں اور اس قدیم گھر کا چکر لگائیں یہ سن چکے اور جو کوئی اللہ کے آداب کی بڑائی رکھے تو وہ اس کے لئے ان کے رب کے پاس بہتر ہے“۔

یہ ہے کہ حج کا پس منظر۔ خدا نے اپنی عبادت کے لئے اپنے بنائے ہوئے پہلے گھر میں حج کرنے کا حکم دیا اور اس کے بعد سے وہاں لگا تار حج کیا جاتا ہے، حج صرف ایک عبادت نہیں ہے، یہ ایک عظیم یادگار ہے، ان عظیم لوگوں کی یادگار جنہوں نے اپنے رب کی خوشنودی کے لئے جان و مال، وطن اور گھر کو بھی قربان کیا، جنہوں نے خدا پر یقین کا ایسا مظاہرہ کیا کہ اس سے بڑھ کر کوئی مظاہرہ نہیں ہو سکتا۔ حج تاریخ سے وابستہ ہے، عبادت ہے، خدا کے تین بندوں کی یادگار ہے یعنی حضرت ابراہیم، حضرت ہاجرہ اور حضرت اسماعیل علیہم السلام۔ انہوں نے اپنے رب پر ایمان کی جو مثال قائم کی وہ رہتی دنیا تک کے لئے مثال ہے، اور انہوں نے جو قربانی دی وہ رہتی دنیا تک نمونہ ہے۔ حج کرنا اس بات کی علامت ہے کہ خدا کی راہ میں اگر اس عظیم قربانی کی ضرورت پیش آجائے تو ہم آج بھی اس قربانی کو پیش کریں گے۔ (انشاء اللہ)

حج اسلام کی عالمگیریت کا بھی مظہر ہے اور اسلام کے عالمی مذہب ہونے کا زندہ ثبوت ہے۔ حج توحید کا عملی سبق ہے، حج دنیا کی بے ثباتی کا عملی اظہار ہے۔ حج کے دوسرے بہت سے فوائد اور مصالح ہیں جو ذیل میں بیان کئے جاتے ہیں۔

9.3 عظمت خداوندی کا اظہار

حج اللہ کی عظمت اور بڑائی کے اظہار کا اعلیٰ نمونہ ہے۔ حج میں بندہ اپنے گھر بار، دوست واحباب، وطن اور گھر کے عیش و آرام کو چھوڑ کر رب العزت کے دربار میں حاضر ہوتا ہے اور اس کی عظمت و کبریائی کو بیان کرتا ہے۔ خدا کے دربار میں وہ اس طرح حاضر ہوتا ہے کہ اس کے بدن پر صرف دو بغیر سلے ہوئے کپڑے ہوتے ہیں، یعنی اپنے حشم وخدم اور جاہ وجلال کو خاک میں ملا کر اس کے دربار میں حاضری دیتا ہے، اور پکار پکار کر کہتا ہے کہ میں حاضر ہوں، میں حاضر ہوں، پکار پکار کر اللہ کی بڑائی بیان کرتا ہے۔ اس کے حکم سے اس کے نام پر قربانیاں کرتا ہے۔ اس کے گھر کا طواف کرتا ہے۔ انسانوں کا ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر اس ایک گھر کی عظمت کے گرد پروانہ وار گھومتا ہے۔ یہ دراصل اللہ کی عظمت کا انسانوں کے درمیان ایک عملی اظہار ہے، اور خدا واحد و برتر کی عظمت کے اعتراف میں انسانی کاوشوں کا اعلیٰ معیار بھی ہے۔

9.4 توحید کا عملی اظہار

حج توحید الٰہی کا قولی اقرار اور عملی اظہار بھی ہے، بندہ صرف ایک خدا کی عظمت کے اظہار و اقرار کے لئے اپنا سب کچھ چھوڑ کر اس گھر کی زیارت کے لئے جاتا ہے جو صرف ایک خدا کی عبادت کے لئے بنایا گیا تھا، اس لئے جب حاجی اس گھر کا طواف کرتے ہیں تو ساتھ ہی اس کا بھی اعتراف کرتے جاتے ہیں کہ لاشریک لک (تیرا کوئی شریک نہیں ہے) ملک و نعمت سب تیرے لئے ہیں۔ یہ دراصل توحید الٰہی کے عقیدے کا عملی اظہار ہے۔

9.5 خراج عقیدت

حج بیت اللہ مسلمانوں کی طرف سے ان عظیم ہستیوں کے لئے خراج عقیدت بھی ہے جنہوں نے اپنے رب کی عبادت اور اپنے رب کی فرماں برداری کا حق ادا کر دیا۔ اس لئے قرآن میں کہا گیا ہے۔

فِيۡهِ آيَاتٌ بَيِّـنَاتٌ مَّقَامُ إِبۡرَاهِيۡمَ وَمَن دَخَلَهُ كَانَ آمِناً (آل عمران:96)

اس میں واضح نشانیاں ہیں، مقام ابراہیم ہے۔ اور جو اس تحو میں داخل ہوا وہ محفوظ ہوتا۔

یعنی اس مقام پر واضح نشانیاں ہیں جن کے اوپر یہ بات ثبت ہے کہ رب العزت کے ایسے بندے بھی گذرے ہیں جنہوں نے عملی طور پر خدا کے حکم کے سامنے ہر ضرورت کو پس انداز کر دیا۔ حج کے ذریعہ ان کو خراج عقیدت بھی پیش کیا جاتا ہے اور ان کے عمل کی پیروی کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ صفا و مروہ کے درمیان سعی، رمی جمرات، وقوف عرفہ اور مقام ابراہیم کی زیارت الٰہی نشانیوں اور عظمتوں کی

زیارت اور ان سے اپنی زندگی کے لئے سبق لینے سے عبارت ہے۔

حج کی اہمیت صرف عبادت کی نہیں ہے، اس کے سماجی مصالح اور فوائد بھی بے شمار ہیں، حج نے مکہ کو ایک بڑا تجارتی مرکز اور ایام حج کو اہم تجارتی ایام بنادیا ہے۔ جس میں لوگوں کو اپنے منافع دیکھنے یعنی حاصل کرنے کی پوری اجازت ہے۔ قرآن میں ہے:

لَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ أَن تَبْتَغُواْ فَضْلاً مِّن رَّبِّكُمْ (البقرۃ:198)

"تمہارے لیے یہ گناہ نہیں ہے کہ حج کے ایام میں فضل الٰہی یعنی تجارت تلاش کرو"۔

ایک دوسری آیت میں ہے:

ولا آمین البیت الحرام یبتغون فضلا من ربھم و رضوانا(مائدہ:2)

"اور نہ ان کو ستاؤ جو اس ادب والے گھر کے ارادے سے جا رہے ہوں۔ اپنے پروردگار کا فضل اور خوشنودی تلاش کرتے ہوئے"۔

حج کے تاریخی اجتماع نے یہاں ایک بڑا شہر آباد کر دیا جو اہم تجارتی مرکز بھی تھا اور یہاں کی تجارت دراصل اسی دینی اجتماع کی مرہون منت تھی جو خدائے واحد کی عبادت کے لئے مقرر کیا گیا تھا۔

حج کا ایک اہم پہلو اس کی تاریخیت بھی ہے۔ حج اس بات کی علامت ہے کہ اسلام ایک سچا مذہب ہے خدا کا دیا ہوا مذہب ہے، یہ کسی دنیا بے زار، متقشف کا وھم نہیں ہے اور نہ ہی کسی بلند فکر فلسفی کا سوچا ہوا منصوبہ، بلکہ یہ خدائے واحد کا بتایا ہوا طریقہ ہے۔ حج کی شکل میں چار ہزار سال کی تاریخ اس بات کی گواہ ہے کہ یہ پیغام جو چار ہزار برس قبل انسانوں کو دیا گیا آج بھی وہی ہے، اس میں نہ کوئی تبدیلی ہے اور نہ تغیر۔ حج کی تاریخ اس بات کا ایک واضح ثبوت ہے۔

حج کی وجہ سے بیت اللہ ایک عالمی مرکز بن گیا اور یہاں ہر طرف سے ہر قسم کے لوگ آنے لگے۔ یہ تجارتی مرکز ہے۔ تجارتی قافلے یہاں فروکش ہوتے ہیں۔ لیکن ایک اہم بات یہ ہے کہ یہ علمی مرکز بھی ہے۔ یہاں علم و دانش کے اساطین ہر سال اپنے رب کی عبادت کے لئے جمع ہوتے ہیں اور تشنگان علم ان کے چشمہ صافی سے سیرابی حاصل کرتے ہیں۔ اس لئے مکہ علم حدیث کی نشرو اشاعت کے لئے سب سے بڑا مرکز رہا ہے اور ایام حج میں بے شمار طالبان علم یہاں اس مقصد سے جمع ہوتے رہے ہیں کہ حج پر آنے والے علماء کرام سے حدیث سنیں۔

9.6 ارکان و مناسک

حج کی تین قسمیں ہیں۔

1. اِفراد
2. تمتع
3. قِران

اگر کوئی شخص صرف حج کا احرام باندھتا ہے، تو اس کو حج افراد کہتے ہیں۔ اور احرام باندھنے والے کو مفرد کہتے ہیں۔ اگر کوئی شخص حج کے ایام میں حج کے لئے احرام باندھتا ہے۔ پھر حج کرنے کے بعد احرام کھول دیتا ہے اور دوبارہ احرام باندھ کر عمرہ کرتا ہے تو اس کو حج تمتع کہتے ہیں اور اس طرح حج کرنے والے کو متمتع کہتے ہیں۔ تمتع کا مطلب ہے فائدہ اٹھانا۔ اس طریقہ حج میں حاجی ایک احرام باندھ کر حج کرتا ہے پھر احرام کھول دیتا ہے اور اس کے لئے وہ چیزیں حلال ہو جاتی ہیں جن کو حالت احرام میں نہیں کر سکتا تھا اس لئے اس کو حج تمتع کہتے ہیں۔ یعنی اس میں حاجی کچھ ایام سے فائدہ اٹھالیتا ہے۔

اگر کوئی شخص اس طرح احرام باندھے کہ حج اور عمرہ دونوں کی نیت ہو تو ایسے حج کو حج قران کہتے ہیں اور اس طرح حج کرنے والے کو مقرن کہتے ہیں۔ قران کے معنی ہیں ملانا، اس طریقہ میں حج اور عمرہ دونوں کو ملایا جاتا ہے اس لئے اس کو قران کہتے ہیں۔

حج کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ کوئی شخص حج کے ارادہ سے گھر سے نکلتا ہے، اپنی ساری تیاریوں کے بعد سفر شروع کرتا ہے اور مکہ سے کافی پہلے ایک مقام جس کو اصطلاح میں میقات کہتے ہیں اس پر پہنچ کر یا اس سے پہلے احرام باندھ لیتا ہے۔ احرام کا طریقہ یہ ہے کہ غسل کر کے عام استعمال کے کپڑے اتار دیتا ہے اور بغیر سلے ہوئے دو کپڑے زیب تن کرتا ہے، ایک تہ بند اور دوسری چادر۔ اس کے بعد دو رکعت نماز ادا کرتا ہے۔ اور باضابطہ حج کی نیت کا اعلان کرتا ہے اس کے بعد اپنے رب کو ان الفاظ میں پکارتا ہے۔

لبیک اللھم لبیک، لبیک لا شریک لک لبیک ان الحمد والنعمة لک والملک لاشریک لک

”حاضر ہوں، میرے اللہ میں حاضر ہوں، حاضر ہوں تیرا کوئی شریک نہیں، میں حاضر ہوں کوئی شک نہیں کہ حمد تیرے لئے ہے، نعمت تیری ہے، بادشاہی تیری ہے، کوئی تیرا شریک نہیں“۔

احرام باندھنے کے بعد اوپر مذکور کلمات کا کثرت سے ورد کرنا چاہئے۔ ہر نماز کے بعد، ہر صبح بیدار ہونے کے بعد، کسی سے ملتے ہوئے، جدا ہوتے ہوئے، بلندی پر چڑھتے ہوئے اور نشیب میں اترتے ہوئے ان کلمات کا ورد کرتے رہنا چاہئے ان کلمات کو اصطلاح میں تلبیہ کہتے ہیں۔ حج کا اہم ترین ذکر تلبیہ ہے۔

احرام باندھنے کے بعد انسان پر بہت سی وہ چیزیں جو عام حالات میں جائز ہوتی ہیں ناجائز قرار پاتی ہیں۔ زیب و زینت، عیش و عشرت، جنسی مقاربت حتی کہ جنسی گفت و شنید بھی ممنوع ہو جاتی ہے، خوشبو اور رنگ ممنوع ہو جاتے ہیں، شکار کرنا یا شکار میں کسی کی مدد کرنا منع ہو جاتا ہے۔ ناخن تراشنا، درخت کاٹنا حتی کہ گھاس کے تنکے بھی توڑنا منع ہو جاتا ہے۔ سر ڈھکنا منہ چھپانا منع ہو جاتا ہے۔ اس حالت میں وہ اپنے رب کی طرف قدم بہ قدم آگے بڑھتا ہے۔ جیسے ہی بیت اللہ پر نظر پڑتی ہے اللہ اکبر کہتا ہے، تہلیل کرتا ہے، تلبیہ پڑھتا ہے۔ قریب پہنچنے کے بعد حجر اسود کا استلام کرتا ہے پھر طواف کرتا ہے، بیت اللہ کے چاروں طرف سات چکر لگا کر اپنے قلب و ذھن میں رچی بسی توحید کا عملی اظہار کرتا ہے۔ اس کے بعد صفا اور مروہ نام کے پہاڑوں کے درمیان سعی کرتا ہے۔ تسبیح و تہلیل اور دعا و مناجات کرتا ہے اور مکہ میں ٹھہر جاتا ہے۔ وہاں رہتے ہوئے اس کو جو توفیق ہوتی ہے اس کے مطابق طواف، نماز، ذکر اور تلاوت نیز دعا و مناجات کرتا رہتا ہے۔

ذی الحجہ کی ساتویں تاریخ سے باقاعدہ حج کا آغاز ہوتا ہے، سارے حاجی مسجد حرام میں جمع ہوتے ہیں، امیر الحج لوگوں کے سامنے

خطبہ پڑھتا ہے، حج کے احکام بتاتا ہے، حج کے موقعہ پر اللہ کی رحمتوں اور برکتوں کا بیان کرتا ہے۔ آٹھ ذی الحجہ کو لوگ منی کی طرف روانہ ہو جاتے ہیں اور اگلے دن صبح تک وہیں رہتے ہیں، پھر عرفات کی طرف کوچ کرتے ہیں۔ عرفات کا میدان مکہ سے بارہ میل دور واقع ہے، سارے لوگ اس میدان میں جمع ہو جاتے ہیں۔ دن ڈھلنے پر امام خطبہ دیتا ہے اس کے بعد ظہر اور عصر کی نماز جمع کر کے پڑھی جاتی ہے۔ اس کے بعد امام جبل الرحمۃ کے پاس قبلہ رو ہو کر دعا کرتا ہے۔ لوگ اس دعا میں شریک ہوتے ہیں، امام لوگوں کو نصیحتیں بھی کرتا ہے۔ دن چھپنے کے بعد سارے لوگ مزدلفہ نام کے مقام کی طرف روانہ ہو جاتے ہیں۔ اور وہاں اپنا پڑاؤ ڈالتے ہیں۔ امام جبل قزح کے پاس ٹھہرتا ہے۔ عشاء کے وقت مغرب اور عشاء دونوں وقت کی نماز جمع کر کے پڑھی جاتی ہے۔ رات یہیں بسر ہوتی ہے، دسویں ذی الحجہ کی صبح اول وقت میں فجر کی نماز پڑھ لی جاتی ہے۔ اس کے بعد ہر شخص ذکر و استغفار میں مشغول ہو جاتا ہے اور تلبیہ پڑھتا رہتا ہے، جب روشنی پھیل جاتی ہے تو وہاں سے چل کر منی میں آتے ہیں، یہاں رمی جمرات ہوتا ہے یعنی جمرۃ العقبہ کو سات مرتبہ کنکریوں سے مارتے ہیں، ہر دفعہ اللہ اکبر کہتے ہیں اور تلبیہ پڑھتے جاتے ہیں۔ اس کے بعد حج کے اعمال کی تکمیل کے مرحلے میں داخل ہو جاتے ہیں، تلبیہ بھی بند ہو جاتا ہے۔ لوگ قربانیاں کرتے ہیں اور حلق کراتے ہیں۔ اب حج مکمل ہو گیا۔ اس کے بعد بھی لوگ تین دن تک منی میں مقیم رہتے ہیں۔ تینوں دن رمی جمرہ کرتے ہیں۔ اپنے اوقات کو نماز، تلاوت، ذکر، استغفار، اور مناجات میں گذارتے ہیں، حجر اسود اور باب کعبہ کا درمیانی حصہ جو ملتزم کہلاتا ہے اس سے اپنا چہرہ اور سینہ ملتے ہیں، غلاف کعبہ کو پکڑ کر دعائیں مانگتے ہیں۔ پھر آخری طواف کر کے اپنے گھروں کو واپس ہو جاتے ہیں۔ حج کا یہ چند دن کا تربیتی نصاب انسان کو رب العالمین کے اتنا قریب کر دیتا ہے کہ اس کا رب اس سے راضی ہو جاتا ہے۔ اس کے گناہ بخش دیئے جاتے ہیں۔ اور توحید کی عملی مشق اس کی زندگی کو اس طرح ڈھال دیتی ہے کہ زندگی کے ہر میدان میں وہ جو کام بھی کرے گا اس میں رب العالمین کے حکم کی اتباع کرے گا۔ حج کے سلسلہ میں اللہ کے رسول کا فرمان ہے کہ حج کا ثواب یا بدلا سوائے جنت کے اور کچھ نہیں ہے۔

حج کے اندر تین چیزیں فرض ہیں:

1. احرام باندھنا
2. میدان عرفات میں قیام کرنا
3. طواف زیارت

ان فرائض کے علاوہ کچھ شرائط بھی ہیں ان شرائط کا پورا ہونا ضروری ہے۔ پہلی شرط ہے فرائض حج میں ترتیب کا قائم رکھنا، اگر ترتیب قائم نہیں رہی تو حج نہیں ہو گا۔ دوسری شرط یہ ہے کہ حج صرف ایام حج میں ہی ہو سکتا ہے کسی اور وقت میں نہیں ہو سکتا، اور فرائض کے لئے جو وقت مقرر ہے ان کو ان کے وقت پر ادا کرنا ضروری ہے، مثلاً 9 ذی الحجہ کو وقوف عرفہ 10 ذی الحجہ کو مزدلفہ میں جانا اور رمی جمرات کرنا اور آخر میں طواف زیارت کرنا۔

فرائض و شرائط کے علاوہ حج میں کچھ واجبات بھی ہیں۔ حج میں پانچ چیزیں واجب ہیں۔ 1. دسویں ذی الحجہ کو مزدلفہ میں قیام کرنا، 2. رمی جمرہ کرنا، 3. سعی کے دوران دوڑنا، 4. حلق کرانا یا بال کٹوانا مردوں کے لئے اور عورتوں کے لئے تھوڑے سے بال کتروالینا، 5. طواف صدر، یعنی مکہ کے باہر سے آنے والوں کے لئے جب مکہ سے جانے لگیں تو طواف کرنا۔ اس کو طواف وداع بھی کہتے ہیں یعنی رخصت ہونے کا طواف۔

حج اور عمرہ کے لئے احرام باندھنے کے بعد درج ذیل چیزیں منع ہو جاتی ہیں۔ ان میں کچھ چیزیں پہلے سے منع ہیں لیکن حج کے ایام میں ان کی شناعت بڑھ جاتی ہے۔

1. غیبت کرنا، 2. تہمت لگانا، 3. جھوٹ بولنا، 4. لڑائی جھگڑا کرنا، 5. گالی دینا یا فحش گوئی کرنا وغیرہ۔

جو چیزیں خاص حالت احرام میں منع ہیں وہ یہ ہیں 1. خشکی کے جانوروں کا شکار کرنا، 2. بدن کے کسی بھی حصے کے بال مونڈنا، 3. ناخن کاٹنا، 4. موزے پہننا، 5. عمامہ باندھنا یا ٹوپی پہنا، 6. سلے ہوئے کپڑے پہننا، 7. خوشبو یا تیل لگانا، 8. جنسی تلذذ کا کوئی بھی طریقہ اختیار کرنا۔ یہ چیزیں چاہے بھول سے سرزد ہوں یا جان بوجھ کر، ان کے کرنے پر انسان کے اوپر دم واجب ہو جاتا ہے یعنی اس کو ایک یا دو اضافی قربانی کرنی ہو گی۔

احرام کے سلسلے میں یہ احتیاط ہے کہ مردوں کا احرام دو بغیر سلے ہوئے کپڑے ہیں اور عورتوں کا احرام ان کے عام لباس کی طرح ہی ہے۔ البتہ چہرہ، ہاتھ اور پیروں کے پنجے کھلا رکھنا ضروری ہے۔ چہرہ چھپانے کی اجازت نہیں، البتہ شرم و حیاء کے غلبہ میں اجنبی مردوں کے سامنے چہرہ آڑ میں کیا جا سکتا ہے۔

حج کے فرض ہونے کے لئے درج ذیل شرائط کا پایا جانا ضروری ہے۔ حج اس پر فرض ہو گا جس کے پاس سفر کے لئے سفر خرچ ہو، دوران سفر کا خرچ ہو اور واپس آنے کا بھی خرچ ہو اور اپنی عدم موجودگی میں اپنے زیر کفالت لوگوں کا خرچ بھی چھوڑ کر جائے۔ صحت وغیرہ بھی ایسی ہو کہ سفر کر سکے، سفر کے لئے سواری کا انتظام ہو، راستہ پر امن ہو، کوئی ظاہری رکاوٹ نہ ہو۔ اور انسان کے اپنے حالات ایسے ہوں کہ سفر بھی کر سکتا ہو، یعنی اس کی عدم موجودگی میں اس کے اہل و عیال اور زیر کفالت لوگوں میں کسی بڑے نقصان کا اندیشہ نہ ہو، یہ شرائط پوری ہو جائیں تو سفر حج فرض ہو جاتا ہے، اس میں تاخیر گناہ ہے۔

حج کی خاص دعاؤں میں تلبیہ ہے جس کا اوپر ذکر آیا، اس کے علاوہ ملتزم کی دعا بھی بہت اہم ہے، وہ دعا یہ ہے۔

يا واجد يا ماجد لا تزل عنى نعمة انعمتها على۔

”اے قدرت والے، اے عزت والے مجھ سے اپنی وہ نعمت نہ چھیننا جو تو نے عطا فرمائی ہے“۔

اس طرح میزاب رحمت کی دعا بھی اہم ہے، وہ دعا یہ ہے۔

الهم انى اسئلک ایمانا لایزول و یقیناً لاینفد و مرافقة نبیک محمد صلی الله علیه وسلم اللهم اظلنى تحت ظل عرشک یوم لاظل الا ظل عرشک و اسقنى بکاس محمد صلی الله علیه وسلم شربة لا ظماء بعد ها ابداً۔

”اے اللہ میں تجھ سے ایسا ایمان مانگتا ہوں جو مجھ سے کبھی جدا نہ ہو اور ایسا یقین مانگتا ہوں جو کبھی ختم نہ ہو اور قیامت میں تیرے نبی محمد ﷺ کی رفاقت چاہتا ہوں، اے اللہ مجھے قیامت کے دن اپنے عرش کے سایے میں جگہ دے، اس دن تیرے عرش کے علاوہ اور کہیں سایہ نہ ہو گا، اور محمد ﷺ کے حوض کوثر سے ایسا پیالہ پلا کہ پھر اس کے بعد پیاس نہ ہو“۔

مقام ابراہیم پر یہ دعا مانگنی چاہئے:

اللہم ہذا مقام ابراہیم العائذ الائذ بک من النار حرم لحومنا و بشر تنا علی النار

اے اللہ یہ تیرے خلیل حضرت ابراہیم کا مقام ہے جنہوں نے اس وقت تیری پناہ ڈھونڈی اور تیرا سہارا لیا جب کافروں نے انہیں آگ میں ڈالا، پس جس طرح تو نے انھیں آگ سے بچایا ہمارے گوشت و پوست کو بھی دوزخ کی آگ سے بچا۔

ذیل میں حج کی چند اصطلاحات کا تذکرہ کر دینا بھی ضروری ہے۔

طواف :خانہ کعبہ کے چاروں طرف چکر لگانے کو طواف کہتے ہیں۔

شوط :کعبہ کے گرد ایک چکر لگانے یا صفا و مروہ کے درمیان ایک چکر لگانے کو شوط کہتے ہیں۔

استلام :حجر اسود کا بوسہ دینے، چھونے یا دونوں ہتھیلیوں کو اس کی طرف کرنے کو استلام کہتے ہیں۔

وقوف :عرفات کے میدان اور مزدلفہ میں پہنچ کر کچھ دیر ٹھہرنے کو وقوف کہتے ہیں۔

رمی :رمی کے معنی ہیں پھینکنا، جمرہ پر کنکری پھینکنے کو رمی کہتے ہیں یہ تین ہیں جمرہ اولی، جمرہ وسطی اور جمرہ عقبہ۔

رمل :رمل کے معنی اکڑ کر یا بازو ہلا کر چلنا طواف کے پہلے تین چکروں میں بازو ہلا کر اور ذرا اکڑ کر چلنے کو رمل کہتے ہیں۔

سعی :صفا اور مروہ کے درمیان تیز چلنے اور دوڑنے کو سعی کہتے ہیں۔

اضطباع :طواف شروع کرنے سے پہلے مردوں کو چاہیے کہ اپنی چادر کے داہنے حصے کو داہنی بغل سے نکال کر کندھے پر ڈال لیں۔ ایسا کرنا عورتوں کے لیے مکروہ ہے۔

تحلیق :حلق کے معنی بال مونڈنے کے آتے ہیں۔ حج کے بعض ارکان کی تکمیل کے بعد مردوں کو اپنے بال منڈوانے چاہیئے۔

تقصیر :قصر کے معنی چھوٹا کرنے کے آتے ہیں جو اپنے بال نہ مونڈے تو وہ تقصیر کرالے یہ بھی تحلیق کے قائم مقام ہوگا۔

حطیم :خانہ کعبہ کا وہ حصہ جو اب خانہ کعبہ سے باہر ہے حطیم کہلاتا ہے۔

حجر اسود :حجر اسود یعنی کالا پتھر، یہ پتھر کعبہ کے مشرقی کونے پر نصب ہے۔ جہاں یہ پتھر نصب ہے اس کو رکن یمانی کہتے ہیں۔ اس کا استلام کر کے طواف شروع کیا جاتا ہے۔

صفا و مروہ :دو پہاڑیاں ہیں جن کے درمیان سعی کی جاتی ہے۔

میلین اخضرین: سعی کرتے وقت دو مقام ملتے ہیں ان پر سبز نشان بنے ہوئے ہیں اس لیے ان کو میلین اخضرین کہتے ہیں۔

عرفات :ایک میدان ہے جس کا رقبہ تقریباً 12 مربع میل ہے۔ حج کے دوران وقوف عرفات فرض ہے۔ اس کے وسط میں ایک پہاڑ ہے جس کو جبل رحمت کہتے ہیں۔

منی : مکہ سے تین میل کے فاصلے پر ایک آبادی ہے۔

مزدلفہ : منی اور عرفات کے درمیان ایک جگہ ہے وقوف عرفات کے بعد لوگ یہاں آتے ہیں۔

9.7 اجتماعیت

حج مسلمانوں کا ایک عالمی اور بین الاقوامی اجتماع ہے۔ مسلمانوں کی ایک عالمی مرکزیت کا داعی اور نقیب ہے۔ اس کی عالمیت کا تصور مسلمانوں کے دلوں میں روزاول سے ہی موجود تھا۔ اور حق یہ ہے کہ اسے عالمی مرکز ہونا ہی چاہئے۔ جس طرح سے کہ مسلمان وہاں سال کے سال جمع ہوتے ہیں مختلف ملکوں کے رہنے والے، مختلف زبانیں بولنے والے، مختلف رنگوں کے لوگ، مختلف نسلوں کے لوگ مختلف تمدنوں کے لوگ، جس طرح اپنے تمام طبعی اختلافات کو مٹا کر ایک ہی لباس میں ایک ہی شہر میں ایک ہی وقت میں جمع ہوتے ہیں۔ ایک ہی کعبہ کا طواف کرتے ہیں۔ ایک ہی زبان بولتے ہیں۔ وہاں سارے ظاہری فروق ختم ہو جاتے ہیں اور ایسا روح پرور اجتماع ہوتا ہے کہ اس سے زیادہ بہتر عالمی مرکزیت کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ گویا ساری دنیا کے مسلمانوں کا واحد مرکز بیت اللہ ہے۔ ہر جگہ اور ملک سے مسلمان اس کی طرف آتے ہیں اور حج کرتے ہیں۔ نماز میں بھی اپنا رخ اس طرف رکھتے ہیں۔ اسی طرح عالمی پیمانے پر یہ محسوس کیا جا سکتا ہے کہ بیت اللہ واقعی ایک بین الاقوامی مرکز ہے اور نماز و طواف اور سعی وغیرہ اس کا عملی ظہور ہیں۔

اسلام سے پہلے بھی حج ہوتا تھا، اسلام نے سابقہ طریقہ حج کو باقی رکھا اور اس میں جو عملی خرابیاں پیدا ہو گئی تھیں رسول اللہؐ نے ان کی اصلاح فرما دی۔ اور بقیہ حج کو سنت ابراہیم علیہ السلام کے مطابق جاری رکھا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بیت اللہ کی مرکزیت کو مزید مستحکم کرنے کے لئے بعض خصوصی احکام بھی صادر کیے۔ مثلاً جانوروں کا شکار نہ کرنا، گھاس نہ کاٹنا اور ہتھیاروں کے لے کر جانے کی ممانعت وغیرہ۔ رسول اللہؐ کی ان تعلیمات کے نتیجہ میں بیت اللہ کا حج عالم اسلام کا نقطہ اجتماع بن گیا۔ حج کے موقعہ پر سال بہ سال جس طرح مسلمانوں کا وہاں اجتماع ہوتا ہے وہ ایک غیر معمولی اور بے مثال واقعہ ہے۔ حج کا یہ تصور عہد نبوی میں بہت واضح ہو گیا تھا۔ اس کی حیثیت ایک عالمی منشور گاہ کی بن گئی تھی۔ حج بیت اللہ کے موقعہ پر اجتماع کو سیاسی اہمیت رکھنے والے اعلانات کے لئے بھی استعمال کیا گیا۔ چنانچہ مشرکین سے برأت کا اعلان حج کے موقع پر کیا گیا، اسی طرح حجۃ الوداع کے موقع پر بھی رسول اللہ ﷺ نے عالمی انداز کی ہدایات جاری فرمائیں۔ انسانوں میں مساوات، سود اور خونی انتقام کی حرمت، بیت اللہ کی حرمت، لوگوں کے انسانی حقوق وغیرہ کا اعلان اسی حجتہ الوداع کے موقع پر کیا گیا۔

امت مسلمہ پر اللہ تعالی کے بے شمار احسانات میں سے ایک خاص احسان دین کی تکمیل کا تصور ہے۔ دین کی تکمیل کی آیت حج کے اجتماع کے موقع پر نازل ہوئی اور اسی موقع پر اس کا اعلان کیا گیا۔ یہ اتنا اہم اعلان تھا کہ ایک یہودی عالم نے حضرت عمرؓ سے ایک مرتبہ کہا کہ قرآن میں ایک ایسی آیت ہے جو اگر ہمارے مذہب میں ہوتی تو ہم اس کے یوم نزول کو عید بنا لیتے (بخاری)۔

حج کی اس اجتماعیت اور مرکزیت کا ادراک و احساس ہر زمانے کے لوگ کرتے رہے۔ بلکہ لوگ حیرت زدہ ہیں کہ آخر کیسی

مرکزیت ہے جو ایک طرف تو دل میں ہے اور اسی کا اظہار عمل سے ہو رہا ہے، اور ایک نکتہ پر ساری امت متحد ہے، علامہ سید سلیمان ندوی نے سیرۃ النبی میں اسلام کی عطا کردہ وحدت کی اس اہم بنیاد کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا ہے:

”لوگ آج یہ خواب دیکھتے ہیں کہ قومیت و وطنیت کی تنگنائیوں سے نکل کر وہ انسانی برادری کے وسعت آباد میں داخل ہوں مگر ملت ابراہیمی کی ابتدائی دعوت اور ملت محمدی کی تجدیدی پکار نے سینکڑوں ہزاروں برس پہلے اس خواب کو دیکھا اور دنیا کے سامنے اس کی تعبیر پیش کی۔ لوگ آج تمام دنیا کے لئے ایک واحد زبان کی ایجاد کی کوشش میں مصروف ہیں، مگر خانہ کعبہ کی مرکزیت کے فیصلے نے آل ابراہیم کے لئے مدت دراز سے اس مشکل کو حل کر دیا ہے، لوگ آج دنیا کی قوموں میں اتحاد پیدا کرنے کے لئے عالمگیر مجلس کے انعقاد کے درپے ہیں لیکن جہاں تک مسلمانوں کا تعلق ہے، ساڑھے تیرہ سو برس سے یہ مجلس دنیا میں قائم ہے اور اسلام کے علم، تمدن، مذہب اور اخلاق کی وحدت کی علمبردار ہے، آج دنیا کی قومیں (ہیگ) میں اقوام عالم کی مشترکہ عدالت گاہ کی بنیاد ڈالتی ہیں لیکن اس کے فیصلے کو کسی طاقت سے منوا نہیں سکتیں، لیکن مسلمان اقوام عالم کے لیے یہ مشترکہ عدالت گاہ ہمیشہ سے قائم ہے جس عدالت کا حقیقی کرسی نشیں خود احکم الحاکمین ہے جس کے فیصلہ سے کسی کو سرتابی کی مجال نہیں۔“(سیرۃ النبی ص258،5)

عصر حاضر کا ایک اور مصنف فلپ کے حتی نے حج کی اس عالمگیر اجتماعیت کے بارے میں لکھا ہے:

”صدیوں سے حج کا طریقہ اسلامی دنیا کی وحدت کا سب سے قوی سبب رہا ہے اور مختلف مسلمانوں کا مشترکہ رشتہ ہے یہ ہر صاحب حیثیت مسلمان کو طوعاو کرہاً زندگی میں ایک بار سیاح ضرور بنا دیتا ہے۔ دنیا کے بعید ترین گوشوں سے برادران دین کا اس طرح جمع ہونا، میل جول بڑھانے کا ایسا ذریعہ ہے کہ اس کے تمدنی اثرات کو جتنا زیادہ سمجھا جائے کم ہے۔ اس نے حبشی، بربر، چینی، ایرانی، ترک، شامی، امیر، غریب ہر قسم کے مسلمانوں کو ایک دین کے میدان میں لانے اور مواخات بڑھانے کا موقع فراہم کیا، دنیا کے جملہ مذاہب میں بظاہر اسلام نے نسل و رنگ ملک و قوم کی دیواریں توڑنے میں سب مذہبوں سے زیادہ کامیابی حاصل کی، اس میں فرقہ بندی کی لکیر صرف مسلمان اور غیر مسلمان کے درمیان کھینچی گئی ہے۔ ورنہ ملت اسلامی کے اندر سب انسان یکساں ہیں۔ بلاشبہ اس کی کامیابی میں حج کی اجتماعیت کا بڑا حصہ ہے۔“(تاریخ العرب)

حج نے مسلمانوں کے درمیان اجتماعیت اور عالمگیریت کی ایسی روح بیدار کی کہ مشرق و مغرب اور جنوب و شمال ہر جگہ کے مسلمان ایک مرکز پر جمع ہونے لگے، اور کعبۃ اللہ نے دراصل مسلمانوں کے لئے نکتہ اتحاد یا مرکز اتحاد کا کام کیا۔

9.8 مساوات

حج نے مسلمانوں کے اندر مساوات کی روح کو بھی پوری طرح جاگزیں کر دیا، دنیا ہمیشہ سے رنگ و نسل، زبان اور علاقائیت کی تفریق میں مبتلا رہی ہے، اور مختلف تراشے ہوئے لات و منات کا نام لے کر لوگ ہمیشہ ایک کی برتری اور دوسرے کی کم تری کے قائل رہے۔ انسان کی تاریخ اونچ نیچ کے اس تصور سے بھری پڑی ہے۔ اسلام نے چودہ سو سال قبل مسلمانوں کی عالمی منشور گاہ یعنی میدان عرفات سے

اس نسلی تفریق کو مٹانے کی دعوت دی تھی۔ رسول اللہ ﷺ نے حج کے عالمی اجتماع کے موقع پر یہ اعلان فرمایا کہ کسی گورے کو کالے پر یا کسی عربی کو عجمی پر کوئی فضیلت نہیں ہے۔ سارے لوگ ایک خدا کے بندے ہیں۔ اور آپس میں بھائی بھائی ہیں۔ مساوات انسانی کی یہ آواز اجنبی تو نہیں تھی، اسلام کی دعوت ہمیشہ سے یہی رہی ہے لیکن اس آخری دعوت نے مساوات کے لئے عملی بنیادیں ایسی فراہم کر دیں کہ باوجود کوشش کے مساوات کا یہ عملی سبق مسلمانوں کے درمیان سے مٹایا نہیں جا سکا اور ملت اسلامیہ مساوات کے تصور اور اس کے عملی مظاہر کے ذریعہ اس پیغام پر خود بھی عمل کرتی رہی اور اس کا عملی مظاہرہ بھی پیش کرتی رہی۔

اسلام نے خانہ کعبہ کو ایسا مرکز توحید بنایا کہ یہاں سب اپنے لسانی، جغرافیائی، رنگ و نسل کے فروق کو مٹا کر ایک ہی انداز کی عبادت کرتے ہیں۔ ایک ہی خدا کو پکارتے ہیں۔ ایک ہی لباس پہنتے ہیں۔ ایک ہی طریقہ سے عبادت کرتے ہیں اس طرح سب کے درمیان حقیقی مساوات قائم ہو جاتی ہے۔ اللہ تعالی نے اس عملی مساوات کو اصول بنا کر مسلمانوں کو اس نکتہ پر مرتکز فرما دیا ہے۔ قرآن میں ہے۔

سَوَاء الْعَاكِفُ فِيْهِ وَالْبَادِ (الحج:25)

وہاں سارے انسان برابر ہیں چاہے کوئی مسافر ہو یا مقیم۔

یعنی مکہ میں تمام انسانوں کے حقوق برابر ہیں وہاں اگر کوئی غیر عرب ہے تو اس کو بھی وہی مراعات حاصل ہوں گی جو عرب کو ہیں، وہاں اگر کوئی مسافر ہے تو اس کو بھی وہی حقوق حاصل ہوں گے جو مقیم کو ہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے اس کے بارے میں فرمایا کہ مكة مناخ لمن سبق (جو شخص اس شہر یعنی مکہ میں کسی جگہ اتر جائے وہ جگہ اس کی ہے) اس طرح حج نے مسلمانوں کے اندر مساوات کی وہ روح پیدا کی اور اس کا عملی مظاہرہ کیا جو انسانوں کے درمیان مطلوب ہے۔ توحید کعبہ نے یہ مساوات ہر جگہ قائم کر دی، ہر مسجد میں سارے مسلمان ایک ساتھ کھڑے ہو کر ایک امام کے پیچھے نماز پڑھتے ہیں اور سب کا رخ کعبہ کی طرف ہوتا ہے، اور حج نے اس مساوات کو عالمگیریت بخشی، ہر جگہ کے مسلمان ایک ہی لباس میں ایک جگہ جمع ہو کر ایک خدا کی عبادت کرتے ہیں۔

9.9 باہمی تعارف

حج کے من جملہ فوائد میں سے ایک یہ بھی کہ یہاں دنیا بھر کے مسلمان جمع ہوتے ہیں، افریقی، ہندی، ترکی، چینی، ایشیائی، یوروپ امریکہ اور دور دراز اور نزدیک و قریب کے لوگ ایک جگہ جمع ہو کر ایک ہی عبادت انجام دیتے ہیں۔ اس طرح مختلف رنگوں و نسلوں کے لوگ ایک جگہ جمع ہو کر ایک ہی عبادت کرتے ہیں تو مسلمانوں کے اندر باہمی تعارف اور ایک دوسرے کو جاننے اور سمجھنے کا موقع ملتا ہے۔ وہاں اس کا پورا موقع ہوتا ہے کہ مختلف قومیں ایک دوسرے سے واقف ہوں اور قومی و نسلی دوریاں کم ہوں، ہندوستان کے مسلمان یہ جانیں کہ افریقہ کے مسلمان بھی اسی طرح عبادت کرتے ہیں جیسے ترک و چین کے لوگ کرتے ہیں۔ یوروپ میں بھی مسلمان اسی طرح ہیں جیسے مشرق بعید کے ممالک میں ہیں۔ اور کالے مسلمانوں کا بھی وہی مذہب ہے جو گورے مسلمانوں کا ہے۔

البتہ حج ایک اعتبار سے خاص تعارف کا ذریعہ بھی رہا ہے حج کے موقع پر دنیا بھر کے اہل علم وہاں جمع ہوتے رہے ہیں اور طالب علم

ان سے خاص ایام حج میں بھی علم سیکھتے رہے ہیں۔ خاص طور پر علم حدیث کی نشر و اشاعت میں حج کا اہم کردار ہے۔

9.10 اکتسابی نتائج

اس اکائی میں آپ نے درج ذیل نکات سیکھے:

- حج کے معنی ارادہ کرنے کے آتے ہیں۔ اصطلاح شریعت میں حج بیت اللہ کی زیارت کرنے کا ارادہ کرنے اور وہاں جا کر کچھ اعمال و ارکان کے ادا کرنے کا نام ہے۔ حج صرف ایام حج میں ہی کیا جاسکتا ہے۔ حج بھی اسلام کا بنیادی رکن ہے اور نہایت اہم عبادت ہے۔
- حج سیدنا ابراہیم علیہ السلام کی سنت اور ان کی یادگار ہے۔ حج کی بڑی فضیلت ہے۔ حدیث میں آتا ہے کہ جو شخص صاحب استطاعت ہو اور حج نہ کرے تو وہ چاہے یہودی مرے یا نصرانی مرے۔ اس لئے صاحب استطاعت کو حج کرنا ضروری ہے۔
- حج کے ذریعہ حضرت ابراہیم حضرت اسماعیل اور حضرت ہاجرہ علیہم السلام کی عظیم قربانی کو یاد کیا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ حج توحید ربانی کا عملی اظہار ہے، اور عظمت خداوندی کے اظہار کا ذریعہ۔ حج کے ذریعہ مسلمانوں میں باہم اجتماعیت اور مساوات کا عملی درس ملتا ہے۔
- حج کے اندر تین فرائض ہیں۔ احرام باندھنا، وقوف عرفہ اور طواف زیارت۔ اور کچھ شرائط ہیں جیسے ایام حج کا ہونا اور حج کے ارکان میں ترتیب قائم رکھنا۔ اگر فرائض یا شرائط میں سے کوئی چیز چھوٹ گئی تو حج ادا نہیں ہوگا۔ حج میں کچھ اعمال واجبات ہیں جیسے دسویں ذی الحجہ کو مزدلفہ میں قیام کرنا، رمی جمرہ کرنا، سعی کے دوران دوڑنا، حلق کرنا اور طواف صدر، ان میں سے کوئی عمل چھوٹ جائے تو حج تو ہو جائے گا لیکن اس کے لئے دم دینا ہوگا یعنی قربانی کرنی پڑے گی۔
- حج کی تین قسمیں ہیں۔ تمتع، قران اور افراد۔ افراد کا مطلب ہے صرف حج کی نیت سے احرام باندھا جائے۔ ایسا شخص حج سے فارغ ہوتے ہی احرام کھول دے۔ قران کا مطلب ہوتا ہے حج اور عمرہ کا احرام ایک ساتھ باندھنا، ایسا شخص حج کے بعد عمرہ کرے پھر احرام کھولے۔ اور تمتع کا مطلب ہوتا ہے فائدہ اٹھانا یعنی حج کے ایام میں حج کا احرام باندھے اور حج پورا کر کے احرام کھول دے پھر دوبارہ احرام باندھ کر عمرہ کرے۔
- حالت احرام میں انسان کے اوپر کچھ پابندیاں عائد ہوتی ہیں ان کا پاس و لحاظ رکھنا ضروری ہے ورنہ ان کے لئے بھی دم دینا ہوگا۔
- حج عبادت و اطاعت کے لئے ہے۔ حج کے ایام میں غیبت، جھوٹ جھگڑا و فساد، اسی طرح عورتوں سے مباشرت اور کسی چیز کو نقصان پہنچانا حتی کہ شکار کرنا، بال مونڈنا، گھاس وغیرہ کو توڑنا بھی منع ہو جاتا ہے۔

9.11 نمونہ امتحانی سوالات

9.11.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات

1. حج اسلام کا کون سا رکن ہے؟

(a).چوتھا (b).پانچواں (c).چھٹا (d).سب غلط

2. مکہ میں واقع بیت اللہ کی زیارت اور وہاں مخصوص ارکان کی ادائیگی کو کیا کہا جاتا ہے؟

(a).زکوٰۃ (b).حج (c).صوم (d).نماز

3. حج کی کتنی قسمیں ہیں؟

(a).تین (b).چار (c).سات (d).گیارہ

4. اگر کوئی شخص صرف حج کا احرام باندھتا ہے، تو اسے کون سا حج کہتے ہیں؟

(a).حج افراد (b).حج تمتع (c).حج قران (d).سب صحیح

5. تمتع کا معنی بتائیں؟

(a).فائدہ اٹھانا (b).نقصان اٹھانا (c).خسارہ برداشت کرنا (d).سب غلط

6. اگر کوئی شخص اس طرح احرام باندھے کہ حج اور عمرہ دونوں کی نیت ہو تو ایسے حج کو کیا کہتے ہیں؟

(a).حج افراد (b).حج تمتع (c).حج قران (d).سب صحیح

7. عرفات کا میدان مکہ سے کتنی دوری پر واقع ہے؟

(a).بارہ میل (b).پانچ میل (c).نو میل (d).سات میل

8. صفا اور مروہ کے درمیان تیز چلنے اور دوڑنے کو کیا کہتے ہیں؟

(a).سعی (b).وقوف (c).استلام (d).سب صحیح

9. حج کے اندر کتنی چیزیں فرض ہیں؟

(a).تین (b).پانچ (c).سات (d).ایک

10. حج میں کتنی چیزیں واجب ہیں؟

(a).تین (b).پانچ (c).سات (d).ایک

9.11.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات

1. حج کے فرائض و واجبات کیا ہیں؟ مختصر نوٹ لکھیے۔
2. حج کے فرض ہونے کی شرائط کیا ہیں؟ بیان کیجیے
3. حج کے سماجی مصالح اور فوائد پر روشنی ڈالیے۔
4. حج کی عظمت اور خداوندی کے اظہار پر مضمون لکھیے۔

5. حج کے اندر مساوات کی اہمیت پر نوٹ لکھیے۔

9.11.3 طویل جوابات کے حامل سوالات

1. حج کے ارکان ومناسک پر تفصیلی گفتگو کیجیے۔
2. حج کا پس منظر اور تفصیلی تعارف پیش کیجیے۔
3. حج کے ذریعہ مسلمانوں میں عالمگیریت اور اتحاد کیسے پیدا ہوتا ہے؟ بیان کیجیے

9.12 تجویز کردہ اکتسابی مواد

1. اسلامی فقہ : مولانا مجیب اللہ ندوی
2. ارکان اربعہ : مولانا ابوالحسن علی ندوی
3. خطبات : مولانا ابوالاعلی مودودی
4. سیرت النبی : سید سلیمان ندوی
5. اسلامی عبادات : عفیف عبدالفتاح طیارہ

اکائی 10: حقیقت جہاد

اکائی کے اجزا:

10.0 تمہید

10.1 مقاصد

10.2 تعارف اور حقیقت

10.3 اکتسابی نتائج

10.4 نمونہ امتحانی سوالات

10.4.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات

10.4.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات

10.4.3 طویل جوابات کے حامل سوالات

10.5 تجویز کردہ اکتسابی مواد

10.0 تمہید

جہاد کا مطلب جنگ نہیں ہے جیسا کہ بعض لوگ مشہور کرتے ہیں۔ بلکہ جہاد کا مطلب ہے اپنی انتہائی کوشش کرنا، جہد و عمل کے ذریعہ کسی بھی کام میں اپنی صلاحیت صرف کرنا، چاہے یہ نفس کی اصلاح ہو یا اشاعت دین کا راستہ ہو، صبر وضبط کی پرورش ہو یا جنگ کا میدان، ہر جگہ اپنی کوشش اور صلاحیت کے لگا دینے کو جہاد کہتے ہیں۔ اس اکائی میں جہاد کی ان جملہ اقسام کا بیان کیا جائے گا۔

10.1 مقاصد

اس اکائی کا مقصد اس اکائی کا مطالعہ کرنے کے بعد طلبہ اس بات سے واقف ہو جائیں گے کہ جہاد کا معنی و مفہوم کیا ہے، وہ جہاد کی اقسام اور جہاد کے شرائط سے بھی واقفیت حاصل کرلیں گے اور یہ پتہ چل جائے گا کہ اسلام کی نظر میں کن کن مقامات پر طاقت کے استعمال کی اجازت ہے اور کہاں صرف صبر کی طاقت استعمال کی جائے گی، اور ہتھیار اٹھانے کی اجازت نہیں ہو گی۔

10.2 تعارف اور حقیقت

جہاد عربی زبان کا لفظ ہے، اس کے معنی ہیں کوشش کرنا، جدوجہد کرنا، عام طور پر انتہائی کوشش کا مفہوم اس میں شامل ہے، کسی بھی کام کے لیے جو انتہائی کوشش یا محنت کی جاتی ہے اس کو جہاد کہا جاتا ہے جیسا کہ عربی لغت کی کتابوں میں اس کی صراحت ہے۔ قرآن و حدیث میں اطاعت و عبادات میں جہاد، قرآن کے ذریعے جہاد، ماں باپ کی خدمت میں جہاد وغیرہ احکام اس کی دلیل ہیں کہ اسلام کی نظر میں جہاد جنگ کے ساتھ مخصوص نہیں ہے۔ مثلاً کوئی عبادت و ریاضت میں محنت کرتا ہے تو اس کو مجاہدہ کرنا کہتے ہیں۔

جہاد اپنے مدلول کے اعتبار سے جنگ سے تعلق نہیں رکھتا بلکہ وہ جنگ جہاد کی ایک قسم ہے۔ لیکن موجودہ دور کے مخصوص سیاسی احوال میں یا صحافتی زبان میں جہاد صرف قتال کے لئے استعمال ہو رہا ہے۔ اپنی اصل کے اعتبار سے قتال جہاد کا صرف ایک حصہ ہے، کل جہاد نہیں ہے۔

جہاد عمل کا نام ہے اور ترک جہاد بے عملی کا نام ہے۔ اسلام کے مطابق انسان کو مہلتِ عمر بہت تھوڑی ملی ہے اور کار جہاں دراز ہیں۔ اس مختصر مہلت میں اس کو ایسی زندگی کی تعمیر کرنی ہے جو ابد الآباد تک باقی رہنے والی زندگی ہے۔ جہاں موت نہیں ہے اور اس زندگی کی تعمیر کلیۃ اسی مختصر وقفہ حیات پر منحصر ہے جو ہر زندہ انسان کو عارضی طور پر ملا ہوا ہے۔ اگلی زندگی میں صرف وہی چیز کام آئے گی جو اس حیات میں جمع کر لی۔ اگر اس زندگی کو بے معنی انداز میں گزار دیا یا سستی و کاہلی کی نظر کر دیا تو ہمیشہ کی زندگی میں صرف کف افسوس ملنا رہ جائے گا۔ ایک لمحہ کی غفلت بسا اوقات صدیوں کا سفر بن جاتی ہے جہاد دراصل اسی مصروفیت کے ادراک کا نام ہے۔ اس حقیقت کی طرف سورہ نساء کی اس آیت سے واضح اشارہ ملتا ہے۔

لاَّ يَسْتَوِي الْقَاعِدُونَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ غَيْرُ أُوْلِي الضَّرَرِ وَالْمُجَاهِدُونَ فِي سَبِيْلِ اللّهِ بِأَمْوَالِهِمْ وَأَنفُسِهِمْ فَضَّلَ اللّهُ الْمُجَاهِدِيْنَ بِأَمْوَالِهِمْ وَأَنفُسِهِمْ عَلَى الْقَاعِدِيْنَ دَرَجَةً وَكُـلاًّ وَعَدَ اللّهُ الْحُسْنَى وَفَضَّلَ اللّهُ الْمُجَاهِدِيْنَ عَلَى الْقَاعِدِيْنَ أَجْراً عَظِيْماً (النساء:95)

”مسلمانوں میں سے وہ جن کو کوئی جسمانی معذوری نہ ہو اور وہ پھر بیٹھے رہیں اور وہ جو خدا کی راہ میں اپنی جان ومال سے جہاد کر رہے ہیں برابر نہیں۔ اللہ نے اپنی جان ومال سے جہاد کرنے والوں کو بیٹھنے والوں پر ایک درجہ کی فضیلت عطا کی ہے اور ہر ایک سے خدا نے بھلائی کا وعدہ کیا ہے اور جہاد کرنے والوں کو بیٹھنے والوں پر بڑے اجر کی فضیلت بخشی ہے“۔

اس آیت میں بیٹھنے والوں کے مقابلے میں جہاد کرنے والوں کا تذکرہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ جہاد سستی، کاہلی اور آرام کے مقابلے میں ہے، اور اس آیت سے اس طرف بھی اشارہ ملتا ہے کہ جہاد کوئی بسیط تصور نہیں ہے بلکہ جہاد کی مختلف اقسام ہیں، خود اسی آیت میں جہاد کی دو قسمیں بیان کی گئی ہیں۔

1. جہاد بالنفس   2. جہاد بالمال

جہاد کا مفہوم کوشش اور جدوجہد ہے۔ چونکہ جنگ بھی ایک کوشش اور محنت ہوتی ہے اس لئے اس کو بھی جہاد کہا جاتا ہے۔ ورنہ سب سے بڑا جہاد تو وہ ہے، زندگی کے ہر لمحہ میں بغیر ہتھیار کے لڑا جاتا ہے۔ آٹھ پہر کی جنگ سب سے بڑا جہاد ہے یہ جنگ بنا ہتھیار کی جنگ ہے اس میں کوئی جائے قرار اور راہ فرار نہیں۔ اگر اس جنگ میں راہ فرار اختیار کی تو دنیا و آخرت دونوں برباد ہو جاتی ہیں۔ ایک روایت میں اس کو جہاد اکبر کہا گیا ہے۔ حضرت جابرؓ بیان کرتے ہیں کہ آپؐ نے ان صحابہ سے جو ابھی ابھی لڑائی کے میدان سے آئے تھے فرمایا کہ تمہارا آنا مبارک ہو تم چھوٹے جہاد (الجہاد الاصغر) سے بڑے جہاد (الجہاد الاکبر) کی طرف آئے ہو کہ بڑا جہاد بندہ کا اپنے ہوائے نفس سے لڑنا ہے۔ اس مفہوم کی اور بھی روایات ہیں لیکن محدثین نے ان روایات کی صحت کے بارے میں کلام کیا ہے۔ یعنی اپنی سند کے اعتبار سے وہ اس پایہ استناد کو نہیں پہنچتی جو حدیث کے صحیح ہونے کے لیے ضروری ہے، لیکن ان احادیث کا مفہوم پورے طور پر درست ہے۔ چونکہ قرآن مجید میں ایسے ہی مفہوم کی ایک آیت موجود ہے جس میں غیر جنگ کی ایک حالت کو جہاد کبیر کہا گیا ہے۔

فَلَا تُطِعِ الْكَافِرِينَ وَجَاهِدْهُم بِهِ جِهَادًا كَبِيرًا (فرقان:52)

”پس کافروں کی اتباع مت کرو اور ان کے ساتھ اس (قرآن کریم) کے ذریعہ جہاد کرو، بڑا جہاد“۔

اس طرح کی اور بھی آیات قرآن مجید میں ہیں جن میں اسلام کی راہ میں محنت، جدوجہد، کوشش اور اپنی صلاحیتوں کے لگا دینے کو جہاد کا نام دیا گیا ہے۔ مثلاً ایک آیت ہے:

وَالَّذِينَ جَاهَدُوا فِينَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا (عنکبوت:69)

”اور جنہوں نے ہمارے راستہ میں جہاد کیا ہم ان کو اپنا راستہ دکھائیں گے“۔

انبیاء سابقین کی دعوت کے حوالے سے کہا ہے:

وَمَن جَاهَدَ فَإِنَّمَا يُجَاهِدُ لِنَفْسِهِ إِنَّ اللَّهَ لَغَنِيٌّ عَنِ الْعَالَمِينَ (عنکوبت:6)

”اور جو کوئی جہاد کرتا ہے وہ اپنے لیے ہی جہاد کرتا ہے۔ اللہ تعالی دنیا والوں سے بے نیاز ہے“۔

خدا کی راہ میں محنت اور جدوجہد کرنے والوں کو دئے جانے والے انعام کا ذکر اس طرح کیا گیا ہے:

وَجَاهِدُوا فِي اللَّهِ حَقَّ جِهَادِهِ هُوَ اجْتَبَاكُمْ وَمَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّينِ مِنْ حَرَجٍ مِّلَّةَ أَبِيكُمْ إِبْرَاهِيمَ (حج:
78)

”اور محنت کرو اللہ کی راہ میں پوری محنت، اس نے تم کو چنا ہے اور تمہارے دین میں تم پر کوئی تنگی نہیں کی، تمہارے باپ ابراہیم کا دین“۔

اللہ کے راستہ میں محنت جدوجہد، اس کے دین کی اشاعت کے لیے سعی بلیغ کرنا، اس کے دین پر عمل پیرا ہونے کے لئے محنت کرنا ایک بڑا جہاد ہے۔ قرآن مجید کی متعدد آیات میں اس جہاد کا تذکرہ ہے، اور ظاہر ہے یہ جہاد بالسیف یا جنگ نہیں ہے۔ اس جہاد کا تذکرہ صحیح

ابن حبان کی ایک روایت میں اس طرح آیا ہے کہ المجاہد من جاہد لنفسہ (مجاہد وہ ہے جو اپنے نفس سے جہاد کرے)۔ اور دوسری بہت سی روایات میں اس جہاد کا تذکرہ ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تیرہ سالہ مکی زندگی اور دس سالہ مدنی زندگی کے زیادہ تر ایام اسی جہاد کا عملی اسوہ ہیں جس میں آپ نے ایک طرف تو خود عبادت و اطاعت الٰہی کا اسوہ قائم کیا اور دوسری طرف صحابہ کرام کی ایسی جماعت تیار کی جو اس جہاد کا عملی پیکر تھی۔

جہاد کی ایک اور قسم ہے جہاد بالعلم۔ یعنی لوگوں کے دلوں کو علم کے ہتھیار سے فتح کرنا اور لوگوں کو دین اسلام کا پیغام اور قرآن کی تعلیم کے پہنچانے کے لئے جدوجہد کرنا، تاکہ کفر و گمراہی کی اندھیریوں میں پڑے ہوئے لوگ نور ایمان کی رشنی میں راہ ہدایت اختیار کر سکیں۔ قرآن مجید میں اس جہاد کا تذکرہ کئی جگہ موجود ہے۔ ایک آیت جس کا تذکرہ اوپر بھی آیا ہے، سورہ فرقان کی ہے جس میں کہا گیا ہے کہ قرآن کے ذریعہ کفار سے جہاد کبیر کرو۔ متعدد مفسرین نے اس آیت کی تفسیر میں لکھا ہے کہ جہاد بالقرآن جس کو جہاد کبیر کہا گیا ہے وہ جہاد بالنفس اور جہاد بالمال سے بھی بڑھ کر ہے۔ چونکہ جہاد بالنفس اور جہاد بالمال کے اثرات میں وہ وسعت نہیں ہے جو جہاد بالقرآن میں ہے اور جہاد بالقرآن کا موقعہ ہمیشہ باقی رہتا ہے۔ یہ ایک نہ ختم ہونے والا جہاد ہے جو ہمہ وقت جاری و ساری رہتا ہے۔

جہاد کی ایک قسم جہاد بالمال ہے یعنی راہ خدا میں اپنا مال خرچ کرنا، حق کی حمایت میں اپنی دولت نثار کرنا، قرآن مجید میں اس جہاد کا بھی تذکرہ ہے۔ سورہ انفال میں ہے:

إِنَّ الَّذِيْنَ آمَنُواْ وَهَاجَرُواْ وَجَاهَدُواْ بِأَمْوَالِهِمْ وَأَنفُسِهِمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّهِ (انفال:72)

بے شک وہ جو ایمان لائے اور ہجرت کی اور اپنے مال اور جان سے اللہ کی راہ میں جہاد کیا۔

متعدد اور بھی آیات میں جہاد بالمال کا تذکرہ آیا ہے جن میں سے بعض آیات کا تذکرہ اوپر گزر چکا ہے۔ ایک اور آیت سورہ حجرات میں ہے:

إِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ الَّذِيْنَ آمَنُوا بِاللَّهِ وَرَسُولِهِ ثُمَّ لَمْ يَرْتَابُوا وَجَاهَدُوا بِأَمْوَالِهِمْ وَأَنفُسِهِمْ فِيْ سَبِيْلِ اللَّهِ أُوْلَئِكَ هُمُ الصَّادِقُونَ (حجرات:15)

مومن وہی ہیں جو اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لائے پھر اس میں شک نہیں کیا اور اپنے مال اور اپنی جان سے خدا کی راہ میں جہاد کیا، یہی لوگ سچے ہیں۔

جہاد کی ایک قسم کلمہ حق کا اعلان ہے، حدیث شریف میں آیا ہے کہ ظالم حکمراں کے سامنے حق بات کہنا بڑا جہاد ہے۔ (افضل الجہاد کلمۃ حق عند سلطان جائر) (ترمذی) اس کے علاوہ بھی جہاد کی اور اقسام ہیں۔ مثلاً حدیث شریف میں کہا گیا ہے کہ عورتوں کا جہاد حج ہے۔ (بخاری) وغیرہ

جہاد کی وہ قسم جس کو جہاد بالسیف یا جنگ یا قتال کہتے ہیں اسلام نے اس کی بھی پوری گنجائش رکھی ہے۔ جہاں طاقت کے استعمال کی

ضرورت ہو وہاں طاقت کا استعمال کرنا ضروری ہے۔ لیکن طاقت کا یہ استعمال صرف بقائے امن یا قیام امن کے لیے ہو گا اور ہر کسی کو خود ساختہ جہادی بننے کی اجازت نہیں ہو گی۔ اس کے اصول و آداب اور شرائط ہیں۔ ان شرائط کے بغیر جہاد بمعنی جنگ نہیں کیا جاسکتا۔ جہاد اگر جنگ کے معنی میں ہو تو وہ جہاد ہے جو اس کی شرائط کو پوری کرتا ہو، اگر جہاد کے شرائط پورے نہ ہوں تو پھر وہ جہاد فی سبیل اللہ نہیں بلکہ فساد ہے۔

جہاد کے ان درجات یا قسموں کا تذکرہ ایک حدیث میں بہت واضح انداز میں آیا ہے کہ:

”رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مجھ سے پہلے اللہ تعالی نے جس نبی کو مبعوث فرمایا اس کو اپنی امت میں سے ایسے مخلص پیرو اور ساتھی ضرور ملے جو اس کے طریقے کو مضبوطی سے اختیار کئے رہتے اور اسکی ہدایتوں کا اتباع کرتے رہتے۔ پھر ان کی جگہ ان کے بعد ایسے ناخلف آئے کہ جن کا حال یہ ہوتا کہ جو کہتے اس پر عمل نہ کرتے اور وہ کرتے جس کا ان کو حکم نہیں دیا گیا تھا، پس جس نے ان کے خلاف اپنے ہاتھ سے جہاد کیا وہ مومن ہے اور جس نے اپنی زبان سے جہاد کیا وہ مومن ہے اور جس نے اپنے قلب سے جہاد کیا وہ مومن ہے۔ اس کے بعد رائی کے دانے کے برابر بھی ایمان نہیں ہے“۔ (مسلم)

جہاد بالسیف یا قتال بھی اسلام میں بہت مہتم بالشان عمل ہے۔ اس کے حدود و آداب اور طریقہ کار کی بابت اسلام میں تفصیلی ہدایات ہیں۔ فرد، معاشرہ اور حکومت کے ذریعہ قوت کے استعمال کے سلسلہ میں اسلامی ہدایات کا مطالعہ کرنے سے پہلے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ جہاد کی اہمیت اور فضیلت کے سلسلہ میں اسلام کا نقطہ نظر سامنے آجائے۔

اسلام میں جہاد کی اہمیت کا تذکرہ کرتے ہوئے قرآن مجید میں آیا ہے:

یَا أَیُّھَا الَّذِیْنَ آمَنُوا ھَلْ أَدُلُّکُمْ عَلَی تِجَارَۃٍ تُنجِیْکُم مِّنْ عَذَابٍ أَلِیْمٍ ۔ تُؤْمِنُونَ بِاللَّہِ وَرَسُولِہِ وَتُجَاھِدُونَ فِیْ سَبِیْلِ اللَّہِ بِأَمْوَالِکُمْ وَأَنفُسِکُمْ (صف:11)

اے ایمان والو کیا میں تمہیں وہ تجارت بتائوں جو تمہیں آخرت کے دردناک عذاب سے بچالے، وہ یہ ہے کہ اللہ پر اور اس کے رسول پر ایمان رکھو اور اپنے مالوں اور اپنی جانوں سے راہ خدا میں جہاد کرو۔

ایک اور آیت ہے:

أَمْ حَسِبْتُمْ أَن تُتْرَکُواْ وَلَمَّا یَعْلَمِ اللّہُ الَّذِیْنَ جَاھَدُواْ مِنکُمْ وَلَمْ یَتَّخِذُواْ مِن دُونِ اللّہِ وَلاَ رَسُولِہِ وَلاَ الْمُؤْمِنِیْنَ وَلِیْجَۃً (التوبہ:16)

کیا تم نے یہ سمجھ لیا ہے کہ تم یونہی چھوڑ دیے جاؤ گے حالانکہ ابھی اللہ نے یہ نہیں دیکھا کہ تم میں سے کون ہیں جنہوں نے جہاد کیا اور کون ہیں جنہوں نے اللہ اور رسول اور مومنوں کو چھوڑ کر دوسروں سے اندرونی تعلق رکھا۔

ایک آیت میں ہے:

إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الَّذِيْنَ يُقَاتِلُونَ فِيْ سَبِيْلِهِ صَفّاً كَأَنَّهُم بُنيَانٌ مَّرْصُوصٌ(صف:4)

بلاشبہ اللہ ان لوگوں سے محبت رکھتا ہے جو اس کی راہ میں اس طرح صفیں باندھ کر لڑتے ہیں گویا سیسہ پلائی ہوئی دیوار ہیں۔

قرآن میں اور بھی متعدد مقامات پر جہاد، قتال اور قتال میں شہید ہونے والے لوگوں کی فضیلت بیان کی گئی ہے۔ قرآن کے علاوہ احادیث میں بھی جہاد کی بڑی فضیلت آئی ہے۔ ایک روایت میں ہے۔ ایک شب و روز کی سرحدوں کی نگرانی ایک مہینے کے مسلسل روزوں اور نمازوں سے بھی افضل ہے۔ (مسلم) ایک اور روایت میں ہے: قسم ہے اس ذات کی جس کی مٹھی میں محمدؐ کی جان ہے۔ اللہ کی راہ میں جہاد کرنے والے کے لیے ایک صبح یا ایک شام کا سفر دنیا و مافیہا سے بڑھ کر ہے، اور راہ خدا میں دشمن کے مقابلے میں جم کر ٹھہرا رہنا گھر کی ستر برس کی نمازوں سے بہتر ہے۔ (ترمذی)

متعدد دیگر احادیث میں جہاد کی فضیلت وارد ہوئی ہے۔ جہاد راہ خدا میں دین کی سربلندی کے لیے جدوجہد ہے، اس کے ہر ہر حصے کی فضیلت ایسی ہے اور خاص طور پر قتال کے فضائل کا بیان اس لئے بھی ہوا کہ اول تو انسان کا گھر سے نکلنا خاص طور پر دینی ضرورت کے لیے گھر سے نکلنا دشوار ہوتا ہے، اس میں بھی محض دینی کام کے لیے نکلنا جس کا فائدہ بعد میں ظاہر ہونے والا ہے بڑا دشوار ہوتا ہے۔ ایسا سفر جس میں جان کی بازی لگانی ہو وہ تو اور بھی مشکل ہوگا ان دنیاوی دشواریوں کی وجہ سے جہاد بالسیف کوئی آسان کام نہیں ہے بلکہ انتہائی دشوار گزار کام ہے، بڑے حوصلے اور دل گردے کے لوگ ہی ان مشکلات میں ثابت قدم رہ پاتے ہیں۔ اس لئے ان کے فضائل کو روایات میں تفصیل سے بیان کیا گیا اور راہ خدا میں جہاد نہ کرنے کی مذمت بھی احادیث میں بکثرت آئی ہے۔ ان سب کا مقصد یہ ہے کہ جہاد کی اہمیت سب لوگوں کو معلوم رہے اور جہاد کے لئے نکلنے کی ضرورت ہو تو وہ لوگ جہاد سے جی نہ چرائیں۔

اسلام میں جہاد کی عملی طور پر صورت حال کچھ اس طرح ہے کہ جہاد کے نام پر وہی جنگ جائز ہوگی جس میں درج ذیل شرائط پورے ہوں۔

1. جنگ ایک ایسے امیر کی قیادت میں لڑی جائے، جس کو اپنی جماعت پر اقتدار حاصل ہو اور جس کا حکم عملاً نافذ ہو۔ یعنی وہ باضابطہ حکمراں ہو۔ حدیث شریف میں ہے: انما الامام جنة ، يقاتل من ورائه و يتقى به (البخاری) بلاشبہ امام ڈھال ہے، اس کی قیادت میں جنگ ہوتی ہے اور اس کے ذریعہ حفاظت حاصل کی جاتی ہے۔
2. دوسری شرط یہ ہے کہ جہاد صرف فی سبیل اللہ کیا جائے، اس میں محض قومی و علاقائی تعصب یا دولت و اقتدار کا حصول پیش نظر نہ ہو۔

   حدیث میں ہے:

   من قاتل لتكون كلمة الله ہی العليا فهو فی سبيل الله۔ (بخاری)

   جو شخص اس لیے جہاد کرے کہ اللہ تعالی کا کلمہ سربلند ہو تو وہ فی سبیل اللہ ہے۔

ایک دوسری حدیث میں ہے: لیس منا من قاتل علی عصبیة و لیس منا من مات علی عصبیة(ابوداؤد)
وہ شخص ہم میں سے نہیں ہے جو کسی عصبیت کے لئے جنگ کرے اور وہ ہم میں سے نہیں ہے جو عصبیت کی بنا پر جان دے۔

3. تیسری شرط یہ ہے کہ جہاد با مقصد ہو۔ بامقصد ہونے کا مطلب یہ ہے کہ شریعت نے جن مقاصد کے لیے جہاد کی اجازت دی ہے صرف انہیں کے تحت کیا جائے اور جب تک کے لیے اجازت دی ہے اسی وقت تک کیا جائے۔ قرآن میں ہے:

وَقَاتِلُواْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ الَّذِيْنَ يُقَاتِلُوْنَكُمْ وَلاَ تَعْتَدُواْ(البقرہ:190)

"اور اللہ کی راہ میں ان لوگوں سے لڑو جو تم سے لڑتے ہیں اور زیادتی مت کرو"۔

4. چوتھی شرط یہ ہے کہ اس میں کوئی ناجائز طریقہ اختیار نہ کیا جائے۔

5. پانچویں شرط یہ ہے کہ کامیابی کا یقین ہو، اگر ناکامی کا قوی اندیشہ ہو تو جہاد جائز نہیں، بلکہ ایسی صورت میں اپنی اپنی قوتوں کو محفوظ کر کے ان کو بڑھانا ضروری ہے۔ فقہاء نے اس کی صراحت کی ہے۔

ان شرائط کے ساتھ مسلمان ظلم و جارحیت کے جواب میں، مظلوم مسلمانوں کی مدد کے لیے اور قبول حق کی راہ میں مزاحم قوتوں کے خلاف جنگ کر سکتے ہیں۔

اسلام میں جنگ پسندیدہ عمل نہیں ہے بلکہ جنگ ایک ناگزیر عمل ہے۔ اسلام کی نظر میں پسندیدہ عمل صبر ہے، اسلام نے کشادگی کے انتظار کو عبادت قرار دیا ہے۔(ترمذی) اس لئے جنگ کی اجازت شرط کے ساتھ دی گئی۔ اللہ تعالی کا ارشاد ہے:

أُذِنَ لِلَّذِيْنَ يُقَاتَلُونَ بِأَنَّهُمْ ظُلِمُوا وَإِنَّ اللَّهَ عَلَى نَصْرِهِمْ لَقَدِيْرٌ۔ الَّذِيْنَ أُخْرِجُوا مِن دِيَارِهِمْ بِغَيْرِ حَقٍّ إِلَّا أَن يَقُولُوا رَبُّنَا اللَّهُ(الحج:39-40)

"اجازت دی گئی ان لوگوں کو جن کے خلاف جنگ کی جارہی ہے کیوں کہ وہ مظلوم ہیں اور اللہ یقینا ان کی مدد پر قادر ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جو اپنے گھروں سے ناحق نکال دئے گئے۔ صرف اس قصور پر کہ وہ کہتے تھے ہمارا رب اللہ ہے"۔

کوئی ظالم یا جارح قوت مسلمانوں پر حملہ آور ہو تو یہ بھی اپنے دفاع کی شکل ہے قرآن مجید میں ہے:

وَقَاتِلُواْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ الَّذِيْنَ يُقَاتِلُوْنَكُمْ وَلاَ تَعْتَدُواْ(البقرہ:190)

"اور تم اللہ کی راہ میں ان لوگوں سے لڑو جو تم سے لڑتے ہیں مگر زیادتی نہ کرو"۔

مذکورہ آیات کی روشنی میں جہاد کی دو صورتیں قرار پاتی ہیں۔ اور قرآن پاک کی صراحت کے مطابق ان دونوں شکلوں میں جہاد کرنا جائز ہے۔ لیکن اس میں برابر کا بدلہ لیا جاسکتا ہے، کسی ظلم و تعدی کی اجازت نہیں، اس لیے کہ اوپر مذکورہ آیت میں ولاتعتدوا کی قید موجود ہے۔ اوراسطرح کی دیگر آیات میں بھی قید موجود ہے۔ اس لیے تعدی مطلقًا ناجائز ہے صرف بدلہ جائز ہے۔

یہ دونوں صورتیں دفاعی جنگ کی ہیں۔ جارحیت خواہ انسان کی آزادی کے خلاف ہو یا اس کے عقیدہ و مذہب کے خلاف، دونوں

شکلوں میں جرم ہے اور اسکا دفاع انسان کا فطری حق ہے۔

اگرچہ ان دونوں صورتوں میں جہاد کی اجازت ہے، لیکن ضروری نہیں ہے کہ ہر حال میں جہاد کیا ہی جائے، اگر بغیر جنگ و جدال کے مقصد حل ہو سکتا ہے اور مظلوم کا حق دلایا جا سکتا ہے تو بہتر ہو گا کہ جنگ سے احتراز کیا جائے۔

جہاد کی یہ دونوں شکلیں دفاع کی شکلیں ہیں۔ ان کے علاوہ ایک صورت یہ بھی ہو سکتی ہے کہیں مسلمان کمزور ہوں، اپنے عقیدہ و مذہب کی وجہ سے ظلم و ستم کا نشانہ بن رہے ہوں، اور کسی ظالم قوم نے ان پر عرصہ ٔحیات تنگ کرر کھا ہو تو ایسے حالات میں اسلامی حکومت پر واجب ہو گا کہ ان کی مدد کرے۔ قرآن مجید میں ہے:

وَمَا لَكُمْ لاَ تُقَاتِلُونَ فِيْ سَبِيْلِ اللّهِ وَالْمُسْتَضْعَفِيْنَ مِنَ الرِّجَالِ وَالنِّسَاء وَالْوِلْدَانِ الَّذِيْنَ يَقُولُونَ رَبَّنَا أَخْرِجْنَا مِنْ هَـذِهِ الْقَرْيَةِ الظَّالِمِ أَهْلُهَا(النساء:75)

”آخر کیا وجہ یہ کہ تم اللہ کی راہ میں ان بے بس مردوں، عورتوں اور بچوں کی خاطر نہ لڑو جو کمزور پا کر دبا لیے گئے ہوں اور فریاد کر رہے ہوں کہ خدایا! ہم کو اس بستی سے نکال، جس کے باشندے ظالم ہیں“۔

لیکن ان مظلوم مسلمانوں کی مدد بھی صرف اس قوم کے خلاف کی جائے گی، جس قوم سے کوئی معاہدہ نہ ہو۔ اگر معاہدہ ہو گا تو ان کی مدد نہیں کی جائے گی۔ بلکہ جب تک معاہدہ باقی ہے اس کا احترام کیا جائے گا۔

اس شرط کی صراحت قرآن پاک نے ان الفاظ میں کی ہے:

وَإِنِ اسْتَنصَرُوكُمْ فِيْ الدِّيْنِ فَعَلَيْكُمُ النَّصْرُ إِلاَّ عَلَى قَوْمٍ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَهُم مِّيْثَاقٌ وَاللّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ بَصِيْرٌ(الانفال:72)

”اگر وہ دین کے معاملے میں تم سے مدد مانگیں تو ان کی مدد کرنا تم پر فرص ہے لیکن کسی ایسی قوم کے خلاف نہیں، جس سے تمہارا معاہدہ ہو، جو کچھ تم کرتے ہو اللہ اسے دیکھتا ہے“۔

یہاں ایک بات اور ملحوظ رہنی چاہیے کہ موجودہ زمانے میں بعض نام نہاد سیکولر طاقتیں آزادی دلانے، جمہوریت قائم کرنے یا خواتین کو آزادی دلانے کے نام پر ظلم و بربریت کا بازار گرم کئے ہوئے ہیں ان کے مقاصد دوسرے ہیں، نعرے دوسرے ہیں۔ اسلام میں اسطرح کی دہری پالیسی کی قطعاً گنجائش نہیں ہے۔

اس کے علاوہ ایک صورت یہ ہو سکتی ہے کہ ظالم قوتیں اپنے زیر اثر لوگوں پر یہ پابندی عائد کر دیں کہ وہ راہ حق کو قبول نہیں کر سکتے۔ اس پابندی کے ازالے اور قبول حق کے انسانی حق کو بحال کرنے کے لیے بھی اسلام جنگ کی اجازت دیتا ہے۔

جہاد (جنگ) صرف اس وقت تک جائز ہے جب تک باطل قوتوں کا فتنہ موجود ہے۔ فتنے کی آگ فرو ہو جانے کے بعد جنگ ختم ہو جاتی ہے۔ قرآن پاک میں ہے:

وَقَاتِلُوهُمْ حَتَّى لاَ تَكُونَ فِتْنَةٌ وَيَكُونَ الدِّينُ لِلّهِ فَإِنِ انتَهَواْ فَلاَ عُدْوَانَ إِلاَّ عَلَى الظَّالِمِينَ (البقرہ:193)

”تم ان سے لڑتے رہو یہاں تک کہ فتنہ باقی نہ رہے اور دین اللہ کے لیے ہو جائے۔ پھر اگر وہ باز آجائیں تو جان لو کہ اللہ معاف کرنے والا اور رحم فرمانے والا ہے“۔

استیصال فتنہ یا جارحین کے آمادہ صلح ہو جانے کے بعد بھی جنگ ختم ہو جاتی ہے۔ اس سلسلے میں چند آیتیں یہ ہیں:

حَتَّى تَضَعَ الْحَرْبُ أَوْزَارَهَا (محمد:4)   تا آں کہ جنگ اپنے ہتھیار رکھ دے۔

وَإِن جَنَحُواْ لِلسَّلْمِ فَاجْنَحْ لَهَا (انفال:61)   اگر دشمن صلح و سلامتی کی طرف مائل ہو تو تم بھی اس کے لیے آمادہ ہو جائو۔

فَإِنِ اعْتَزَلُوكُمْ فَلَمْ يُقَاتِلُوكُمْ وَأَلْقَوْاْ إِلَيْكُمُ السَّلَمَ فَمَا جَعَلَ اللّهُ لَكُمْ عَلَيْهِمْ سَبِيلاً (النساء:90)

لہذا اگر وہ تم سے کنارہ کش ہو جائیں اور لڑنے سے باز رہیں اور تمہاری طرف صلح و آشتی کا ہاتھ بڑھائیں تو اللہ نے تمہارے لئے ان پر دست درازی کی کوئی سبیل نہیں رکھی ہے۔

اسلام محض ناگزیر صورت حال میں جنگ یا جہاد کی اجازت دیتا ہے۔ وہ صورت حال ختم ہو جانے کے بعد جنگ کی اجازت ختم ہو جاتی ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام نے ہمیشہ جنگ پر عدم جنگ کو ترجیح دی ہے۔ آپ ہمیشہ جنگ سے اجتناب کی کوشش فرماتے تھے۔ ایک حدیث میں ارشاد ہے:

لاتتمنوا لقاء العدو۔ (بخاری) (دشمن سے مڈ بھیڑ کی تمنامت کرو)

صلح حدیبیہ کی مثال ہمارے سامنے ہے۔ صلح حدیبیہ ایسی صلح ہے جو محض جنگ سے اعراض اور امن کے قیام کے لیے دشمن کی ہر خواہش کو تسلیم کر کے عمل میں آئی۔ دشمنوں نے طرح طرح سے امن کے عمل کو سبوتاژ کرنے کی کوشش کی، نہایت اہانت آمیز اور مشکل شرائط پر یہ معاہدہ مکمل ہوا۔ ایک مسلمان ابو جندل جو مشرکین کے ظلم و ستم کا شکار تھے آگئے اور خود کو مکہ سے نکالنے کی درخواست کی، اہل مکہ نے معاہدہ کی رو سے اس کی مخالفت کی۔ مسلمانوں کے لیے یہ جذباتی مسئلہ تھا جس کی وجہ سے ان کو ایک مرتبہ پھر صبر آزما مرحلے سے گزرنا پڑا، لیکن امن کے قیام کے لیے مسلمانوں نے یہ بھاری قیمت بھی ادا کی اور بعد میں پھر حالات نے ایسا پلٹا کھایا کہ اس قیمت کا بدل بلکہ نعم البدل ان کو عطا ہوا۔

ان تمام تفصیلات سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اسلام میں جہاد کا کیا مقام ہے، اور جہاد بمعنی جنگ کن حالات میں یا کن شرائط کے ساتھ کیا جاسکتا ہے۔ بعض لوگوں کی طرف سے یہ بات آتی ہے کہ اسلام کے نام پر اور خلوص نیت کے ساتھ جو جنگ ہو رہی ہے اسے جہاد کیوں نہ کہا جائے۔

لیکن انہیں معلوم ہونا چاہیے کہ اسلام میں جنگ کے کچھ اصول و ضوابط اور حدود و آداب ہیں۔ ان کی رعایت کے بغیر کوئی جنگ جہاد نہیں ہو گی۔ یہ تو ایسا ہی ہے جیسے کوئی متاع تجارت کو دریا برد کر کے نفع کی توقع رکھے اور اسے تجارت کہے اور کہے کہ میری نیت درست ہے

اس لیے مجھے اس تجارت میں نفع ملنا چاہیے۔ جنگ ایک غیر معمولی صورت حال ہے اس کی اجازت غیر معمولی حالات میں دی جاسکتی ہے۔ عام حالات میں جنگ نہیں ہے۔ امن ہے، امن ایک پائیدار اور تعمیری قوت کا نام ہے۔ اپنے اثرات کے لحاظ سے امن کی طاقت تلوار کی طاقت سے بہت زیادہ ہے۔ قرآن مجید میں اس بات کو اس طرح کہا گیا ہے:

و لا تستوی الحسنة و لا السیئة ادفع بالتی ہی احسن فاذا الذی بینک و بینه عداوة کانه ولی حمیم و مایلقها الا الذین صبروا و مایلقها الا ذو حظ عظیم (حم سجدہ: 34-35)

”نیکی اور برائی برابر نہیں ہو سکتی۔ برائی کو اچھی بات سے ٹالئے آپ دیکھیں گے کہ وہ شخص جس کے ساتھ آپ کی دشمنی تھی وہ آپ کا جگری دوست ہو جائے گا“۔

آخری بات یہ ہے کہ اسلام کی نظر میں جنگ شجر ممنوعہ نہیں ہے، بلکہ بڑی فضیلت کا عمل ہے، لیکن خود ساختہ جہاد کی کوئی گنجائش نہیں ہے، صرف شرعی حکومت جنگ کی تعیین کر سکتی ہے۔ اور مطلوبہ مقاصد جن کا اوپر ذکر ہوا ان کے لئے ہی جنگ ہو سکتی ہے، کسی اور مقصد کے لئے نہیں۔ جب تک جنگ کے لئے ایسے حالات پیدا نہ ہوں جنگ کرنا جائز نہیں ہے۔ البتہ جہاد کی دوسری صورتیں موجود ہیں۔ ان صورتوں پر عمل کرنا ہمہ وقت مطلوب ہے۔ ایک حدیث شریف میں آیا ہے۔

الجہاد ماض الی یوم القیامہ (جہاد قیامت تک جاری رہے گا)

اس کا مطلب وہی جہاد ہے جو انسان اپنے نفس کے خلاف کرتا ہے اور اطاعت و عبادت کے لئے کرتا ہے۔ چوں کہ متعدد روایات سے پتہ چلتا ہے کہ قیامت سے قبل ایسا زمانہ بھی آئے گا جب سارے لوگ حق کے متبع ہوں گے۔ اس لئے اس وقت جنگ تو نہیں ہو سکتی اس لئے اس روایت میں جہاد سے مراد جہاد نفس ہے نہ کہ جہاد سیف۔

10.3 اکتسابی نتائج

اس اکائی میں آپ نے درج ذیل نکات سیکھے:

- جہاد کے لفظی معنی محنت اور جدوجہد کرنے کے آتے ہیں۔ کسی کام میں اپنی طاقت لگا دینے کو جہاد کہتے ہیں۔ جہاد زندگانی کا ایک اہم اصول ہے۔ جہاد ہی کامیابی کی ضمانت ہے۔ اسلام کی نظر میں جہاد عمل کا نام ہے اور ترک جہاد کاہلی و سستی ہے۔ جہاد کی متعدد اقسام ہیں۔ جہاد بالنفس، جہاد بالمال، جہاد بالقرآن اور جہاد بالسیف یعنی جنگ وغیرہ۔ اسلام نے ہر قسم کے جہاد کی اجازت دی ہے، لیکن جہاد بالسیف یا جنگ کی اجازت مشروط ہے۔ اس کے لئے اسلام نے پانچ بنیادی شرطیں مقرر کی ہیں۔ اگر وہ شرائط پوری ہوں گی تو جنگ کرنے کی اجازت ہو گی ورنہ نہیں۔ وہ شرائط حسب ذیل ہیں:

1. جنگ کسی امام کی ماتحتی میں لڑی جائے گی یعنی باضابطہ حکومت کو ہی جنگ کرنے کا اختیار ہو گا۔
2. جہاد فی سبیل اللہ وہ ہے جو صرف اعلائے کلمۃ اللہ کے لئے ہو۔

3. جہاد با مقصد ہو۔
4. کامیابی کا ظن غالب ہو۔
5. جہاد میں صرف جائز طریقے اختیار کئے گئے ہوں۔

- جس صورت حال میں اسلام نے جنگ کی اجازت دی ہے دنیا کا ہر معاشرہ اس سے بھی کم میں جنگ کرنے کو جائز قرار دیتا ہے۔ اس لئے اسلام میں جنگ کوئی حکم نہیں ہے، بلکہ اجازت ہے۔ یعنی جب انسان کی حق تلفی ایک حد تک پہنچ جائے اور من جملہ دوسرے اسباب موجود ہوں تو جنگ کی اجازت ہے۔
- جنگ کی اسلام میں تین قسمیں ہیں: 1. دفاعی 2. اقدامی 3. امدادی
- تینوں قسموں کے اپنے حدود و شرائط ہیں۔ ان کا پاس رکھنا لازمی ہے۔ جنگ کی اجازت کے باوجود اسلام میں احسن طریقے کو پسند کیا گیا ہے۔ جہاں جنگ کے بغیر امن کی طاقت سے مسائل حل ہوتے ہوں یا دشمن مصالحت پر آمادہ ہو جائے تو امن کو ترجیح دینا چاہیے۔

10.4 نمونہ امتحانی سوالات

10.4.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات

1. جہاد کس زبان کا لفظ ہے؟
(a). عربی (b). فارسی (c). عبرانی (d). یونانی

2. جہاد کے معنی بتائیں؟
(a). کوشش کرنا (b). جدوجہد نہ کرنا (c). سعی نہ کرنا (d). سب غلط

3. لوگوں کے دلوں کو علم کے ذریعے فتح کرنا یہ جہاد کی کون سی قسم ہے؟
(a). جہاد بالعلم (b). جہاد بالمال (c). سب غلط

4. جہاد بالمال کسے کہتے ہیں؟
(a). راہ خدا میں مال خرچ کرنا (b). علم سے دلوں کو فتح کرنا (c). دونوں صحیح (d). سب غلط

5. جہاد کی اسلام میں کتنی قسمیں ہیں؟
(a). تین (b). پانچ (c). سات (d). نو

6. عبادت وریاضت میں محنت کرنے والے کو کیا کہتے ہیں؟
(a). مجاہدہ (b). جہاد بالمال (c). جہاد بالقلم (d). سب صحیح

7. اسلام میں جنگ پسندیدہ عمل ہے؟

(a). نہیں (b). ہاں (c). سب غلط (d).

8. اسلام کی نظر میں پسندیدہ عمل ہے؟

(a). صبر (b). جلدبازی (c). عجلت (d). سب صحیح

9. جہاد بالسیف کے لیے اسلام نے کتنی شرطیں مقرر کی ہیں؟

(a). پانچ (b). سات (c). نو (d). گیارہ

10. مومن اپنے اندرونی خصوصیات کو بہتر بناتا ہے اور اللہ کی راہ میں اپنے عملوں کو صاف اور پاک بناتا ہے۔ یہ کون سی جنگ ہے؟

(a). جہاد بالنفس (b). جہاد بالمال (c). جہاد بالقلم (d). سب غلط

10.4.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات

1. جہاد کی قسموں پر مختصر نوٹ لکھیے۔
2. جہاد بالسیف کے شرائط بیان کیجیے۔
3. جہاد کے معنی و مفہوم بیان کیجیے۔
4. جہاد بالنفس پر روشنی ڈالیے۔
5. جہاد کا مختصر تعارف پیش کیجیے۔

10.4.3 طویل جوابات کے حامل سوالات

1. جہاد کی حقیقت کو بیان کیجیے۔
2. جہاد کا تعارف قرآن کی روشنی میں بیان کیجیے۔
3. حدیث کی روشنی میں جہاد کا تعارف پیش کیجیے۔

10.5 تجویز کردہ اکتسابی مواد

---

1. الجہاد فی الاسلام : مولانا ابو الاعلی مودودی
2. سیرۃ النبی : علامہ سید سلیمان ندوی
3. اسلام ایک نظر میں : مولانا صدرالدین اصلاحی
4. آثار الحرب فی الاسلام : وہبہ زحیلی
5. دہشت گردی اور اسلامی تعلیمات : مفتی محمد مشتاق تجاروی

اکائی 11: حقوق اللہ

اکائی کے اجزا:

11.0 تمہید
11.1 مقاصد
11.2 حقوق اللہ
11.3 توحید
  11.3.1 لغوی واصطلاحی معنی
  11.3.2 توحید کی اقسام
  11.3.3 اللہ تعالیٰ کے اسماء حسنی
11.4 اسماء حسنی، ان کی اقسام اور ان پر ایمان کا مفہوم
11.5 شرک سے اجتناب
11.6 شرک کی قسمیں
  11.6.1 شرک کے بعض دیگر ذرائع
11.7 عبادت
  11.7.1 عبادت کی اقسام
  11.7.2 عبادت بندوں پر اللہ تعالیٰ کا حق
11.8 تعظیم
11.9 دعاء
  11.9.1 دعاء کی اقسام
  11.9.2 دعاء کا تعلق عقیدہ سے

11.10 اکتسابی نتائج
11.11 کلیدی الفاظ
11.12 نمونہ امتحانی سوالات
11.12.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات
11.12.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات
11.12.3 طویل جوابات کے حامل سوالات
11.13 تجویز کردہ اکتسابی مواد

11.0 تمہید

اللہ تعالیٰ نے انسان کو پیدا کیا اور آسمان وزمین کی تمام چیزوں کو اس کے لئے مسخر کیا، اس کی خدمت میں لگا دیا، دنیا کی زندگی میں انسان ان سے بھرپور فائدہ اٹھا سکتا ہے، انسان اللہ کے اس احسان کا بدلہ نہیں دے سکتا اور نہ اللہ کو اس کی ضرورت ہے، دنیا کی ہر چیز ہر وقت اس کی تسبیح بیان کررہی ہے؛ لیکن یہ خود انسان کی فطری خواہش ہوتی ہے کہ وہ اس کریم اور رحیم ذات کے اس احسان کی قدر کرتے ہوئے اس کو دریافت کرے، اس کو پہچانے، اس کی تعظیم کرے اور اس کی تعظیم کے اظہار کے لئے اس کی عبادت کرے، اپنی ضرورت کے لئے اس سے دعاء کرے، انسان اپنے طور پر اللہ کی تعظیم کا حق ادا کرنا چاہتا تو صحیح طریقہ پر نہیں کر سکتا تھا، اس لئے اللہ تعالیٰ نے اس کے اسی فطری جذبہ کی تسکین کی رہنمائی فرمادی اور اپنی کتابوں بالخصوص آخری کتاب قرآن مجید میں تفصیل سے اس کی وضاحت فرمادی اور بندوں پر اس کو ضروری قرار دے دیا، جو شخص اس سے روشنی حاصل کئے بغیر اپنے فطری جذبہ کی تسکین کے لئے مالک کے سامنے جھکنا اور اس کے لئے عقیدت کا اظہار کرنا چاہتا ہے، وہ صحیح راستہ سے ہٹ جاتا ہے اور بسا اوقات اس تعظیم میں اللہ کے ساتھ کسی اور کو بھی شامل کرلیتا ہے، یہی شرک ہے، اس اکائی میں اللہ تعالیٰ کے چند حقوق توحید، شرک سے اجتناب، عبادت، تعظیم اور دعاء سے متعلق ضروری تفصیلات ذکر کی جائیں گی۔

11.1 مقاصد

اس اکائی کا مقصد اس اکائی کے پڑھنے کے بعد آپ کو معلوم ہوگا کہ ”حقوق اللہ“ کا مفہوم کیا ہے؟ توحید کسے کہتے ہیں؟ اس کی کتنی قسمیں ہیں، اللہ کے اسماء حسنیٰ کیا ہیں؟ ان کی نوعیت کیا ہے؟ اسی طرح آپ یہ بھی جان سکیں گے کہ شرک کی حقیقت کیا ہے، اس کی کتنی قسمیں ہیں؟ اس سے بچنا کیوں ضروری ہے؟ نیز آپ اللہ کی عبادت اور اللہ کی تعظیم کے مفہوم، ان کی اقسام اور ان کی اہمیت کو بھی سمجھ سکیں

گے ، اخیر میں دعاء کی حقیقت، اس کی اقسام، اس کے فضائل وآداب سے بھی آپ کو واقف کرایا جائے گا اور عقیدہ کی رو سے بھی اس کی اہمیت اجاگر کی جائے گی۔

11.2 حقوق اللہ

حقوق کا لفظ حق کی جمع ہے، حقوق اللہ سے مراد وہ حقوق ہیں جو صرف اللہ کے لئے خاص ہیں، ان میں سے کوئی حق اللہ کے سوا کسی بندہ کو نہیں دیا جائے گا، اور جن کی ادائیگی خالص اللہ کے لئے بندوں پر ضروری ہیں' ان حقوق کی وضاحت پیغمبر اسلام کی ایک حدیث میں آئی ہے چنانچہ حضرت محمد مصطفیؐ نے حضرت معاذؓ سے دریافت فرمایا:

”اے معاذ! کیا تم جانتے ہو اللہ کا حق اس کے بندوں پر کیا ہے؟ اور بندوں کا حق اللہ پر کیا ہے، انہوں نے فرمایا: اللہ اور اس کے رسول بہتر جانتے ہیں، حضورؐ نے فرمایا: اللہ کا حق بندوں پر یہ ہے کہ وہ اس کی عبادت کریں اور اس کے ساتھ کسی چیز کو شریک نہ کریں۔ اور بندوں کا حق اللہ پر یہ ہے کہ وہ ان بندوں کو عذاب نہ دے جو اس کے ساتھ کسی کو شریک نہیں کرتے ہیں“(بخاری، حدیث نمبر:2856)

اس حدیث سے اللہ کا حق بھی معلوم ہو رہا ہے اور اس کا اجر وثواب بھی واضح ہو رہا ہے، عبادت میں اللہ کو پہچاننا، اس کو ایک ماننا، اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرنا اور صرف اسی کی عبادت کرنا، اسی سے مانگنا اور اس کے لئے تعظیم کے جو طریقے خاص ہیں ان کو دوسروں کے لئے اختیار نہ کرنا، یہ ساری باتیں شامل ہیں، جیسا کہ قرآن مجید میں فرمایا گیا:

وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالإِنْسَ إِلاَّ لِيَعْبُدُوْنِ(الذاریات:56)

(میں نے جنوں اور انسانوں کو صرف اس لئے پیدا کیا کہ وہ میری ہی عبادت کریں)

مشہور مفسر مجاہد کہتے ہیں: اس کا مفہوم یہ ہے کہ وہ مجھے پہچانیں ایک دوسرے مفسر، کلبی کہتے ہیں: تا کہ وہ میری توحید کے قائل ہوں اور مجھے ایک تسلیم کریں۔ اللہ کے بندوں پر بے شمار حقوق ہیں، جن میں اہم یہ ہیں: توحید، شرک سے اجتناب، عبادت، تعظیم اور دعاء ذیل کی سطروں میں ان پانچ حقوق کو بیان کیا جائے گا۔

11.3 توحید

11.3.1 لغوی واصطلاحی معنی

لغوی اعتبار سے توحید کا لفظ عربی کے وزن ”تفعیل“ پر ہے' اور عربی لفظ ہے، اس کا لفظی معنی ہے کسی چیز یا کسی شخص کو ایک بنانا یا ایک ماننا، یہ لفظ ”واحد“ سے بنا ہے، جس کے معنی ”ایک“ کے آتے ہیں۔

جہاں تک توحید کے اصطلاحی معنی کا تعلق ہے تو وہ یہ ہے کہ عبادت کو صرف ایک معبود حقیقی کے ساتھ اس اعتقاد کے لئے خاص کرنا کہ وہ اپنی ذات وصفات اور افعال میں یکتا ہے، یعنی یہ اعتقاد رکھنا کہ اللہ تعالیٰ اپنی سلطنت، اشیاء کی تخلیق اور کائنات کی تدبیر میں اکیلا ہے،

اس کا کوئی شریک نہیں، وہ تنہا عبادت کا مستحق ہے، کوئی اور عبادت کا سزاوار نہیں، اس کی ذات، صفات اور اس کے اسماء حسنیٰ میں اس کا کوئی ہمسر اور شریک نہیں، وہ ہمیشہ سے اپنی خصوصیات کے ساتھ ہے، اور ہمیشہ اسی طرح رہے گا۔

11.3.2 توحید کی اقسام

1. توحید ربوبیت

توحید ربوبیت کا مفہوم یہ ہے کہ بندہ یہ ایمان رکھے کہ اللہ ہی پیدا کرنے والا اور رزق دینے والا ہے وہ کائنات کے ہر ذرہ کا علم رکھنے والا ہے، آسمان، زمین اور دونوں کے درمیان جو کچھ ہے سب اس نے پیدا کیا، جن وانس کو اس نے پیدا کیا اور اس نے ہر چیز کو پیدا کیا، قرآن میں ہے:

”اَللّٰهُ خَالِقُ كُلِّ شَيْءٍ“ (الزمر: 62) (اللہ ہر چیز کو پیدا کرنے والا ہے)

عقلی طور پر ہر ”حادث“ (وجود میں آنے والی چیز) کا کوئی ”محدث“ (وجود میں لانے والا) ضرور ہوگا، یہ کائنات اور اس میں جو چیزیں ہیں خود سے وجود میں نہیں آئیں، یہ بھی ممکن نہیں کہ انہوں نے خود ہی اپنے آپ کو پیدا کیا ہو، چونکہ کوئی چیز خود اپنے وجود کی خالق نہیں ہو سکتی، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ”أَمْ خُلِقُوْا مِنْ غَيْرِ شَيْءٍ أَمْ هُمُ الْخَالِقُوْنَ“ (الطور: 35)

اس آیت کے معنی یہ ہیں کہ نہ یہ لوگ بغیر خالق کے پیدا ہوئے نہ خود انہوں نے اپنے آپ کو پیدا کیا؛ اس لئے یہ ثابت ہوا کہ ان کا خالق اللہ تبارک وتعالیٰ ہے۔ اس توحید کو مکہ کے مشرکین بھی مانتے تھے، قرآن مجید میں ہے:

”وَلَئِنْ سَأَلْتَهُمْ مَنْ خَلَقَهُمْ لیقولن الله“ (الزخرف: 87)

(اگر آپ ان سے پوچھیں کہ کس نے ان کو پیدا کیا وہ ضرور کہیں گے: اللہ نے)

ایک دوسری آیت میں فرمایا گیا: (مشرکین سے) کہیے: تمہیں آسمان وزمین سے کون رزق دیتا ہے، یا کان اور آنکھوں کا مالک کون ہے، کون زندہ کو مردہ سے نکالتا ہے اور کون مردہ کو زندہ سے نکالتا ہے اور ہر کام کی تدبیر کون کرتا ہے تو وہ عنقریب کہیں گے: اللہ)۔ (یونس: 31)

یہ آیتیں بتا رہی ہیں کہ مشرکین بھی اللہ کے بارے میں اتنی باتیں مانتے تھے؛ لیکن وہ عبادت صرف ایک اللہ کی نہیں کرتے تھے اور اللہ تعالیٰ پر اس کے اسماء حسنیٰ اور صفات قدسیہ کے ساتھ ایمان نہیں رکھتے تھے، اس لئے وہ اسلام کے دائرہ میں نہیں آسکے۔

2. توحید الوہیت

توحید الوہیت کا مفہوم یہ ہے کہ عبادت صرف ایک اللہ کی ہو۔ لا إلہ إلا اللہ کے یہی معنی ہیں، یعنی ”لا معبود حقٌّ إلا الله“ (اللہ کے سوا کوئی معبود برحق نہیں) اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

”ذٰلِكَ بِأَنَّ اللّٰهَ هُوَ الْحَقُّ وَأَنَّ مَا يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖ هُوَ الْبَاطِلُ“ (الحج: 62)

(یہ (نصرت) اس سبب سے (یقینی) ہے کہ اللہ تعالیٰ ہی ہستی میں کامل ہے اور جن چیزوں کی اللہ تعالیٰ کے سوا یہ لوگ عبادت کر رہے ہیں وہ بالکل ہی لچر ہیں)

ایک دوسری جگہ فرمایا: "فَاعْبُدِ اللّٰهَ مُخْلِصًا لَّهُ الدِّيْنَ" (الزمر:2)

(سو آپ خالص اعتقاد کر کے اللہ تعالیٰ کی عبادت کرتے رہیے)

"إِيَّاکَ نَعْبُدُ وإِيَّاکَ نَسْتَعِيْنُ" (الفاتحۃ:5)

(ہم آپ ہی کی عبادت کرتے ہیں اور آپ ہی سے درخواست اعانت کی کرتے ہیں)

اس میں بھی توحید کا اعتراف بندہ کی زبان سے کرایا گیا ہے، توحید ربوبیت کے ساتھ اس توحید کا ماننا بھی ضروری ہے، انبیاء کرام اس کی دعوت دیتے تھے، اور مشرکین اسی کا انکار کرتے تھے، جب کہ قرآن کی تاکید یہ ہے:

"فَاعْلَمْ أَنَّهٗ لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ وَاسْتَغْفِرْ لِذَنْبِکَ" (محمد:19)

(تو آپ اس کا یقین رکھیے کہ بجز اللہ کے اور کوئی قابل عبادت نہیں اور آپ اپنی خطا کی معافی مانگتے رہئے)

3. اسماء اور صفات میں توحید

توحید کی تیسری قسم اللہ تعالیٰ پر ان تمام اسماء وصفات کے ساتھ ایمان لانا ہے، جو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول حضرت محمدؐ کے بتائے ہوئے ہیں، اللہ تعالیٰ کے اسماء حسنی اس کے ساتھ خاص ہیں، اس کا ہمسر، اس کا برابر اور اس کے مشابہ کوئی نہیں، اللہ کمال کی تمام صفات سے متصف ہے، اور نقص وتشبیہ کی تمام صفات سے وہ پاک ہے، اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

"وَلِلّٰهِ الْأَسْمَاءُ الْحُسْنٰى فَادْعُوْهُ بِهَا" (الأعراف:180)

(اور اچھے اچھے نام اللہ ہی کے لیے ہیں سو ان ناموں سے اللہ ہی کو پکارو)

اور ان صفات میں اللہ کا کوئی شریک نہیں: "لَيْسَ كَمِثْلِهٖ شَيْءٌ وَهُوَ السَّمِيْعُ الْبَصِيْرُ" (الشوریٰ:11)

(کوئی چیز اس کے مثل نہیں اور وہی ہر بات کا سننے والا اور دیکھنے والا ہے)

11.3.3 اللہ تعالیٰ کے اسماء حسنی

ابھی آپ نے توحید کی اقسام کا مطالعہ کیا، اب آپ کو اللہ کے مخصوص اسماء حسنی سے واقف کرایا جائے گا؛ تاکہ ان کے ذریعہ توحید کی معنویت اور زیادہ واضح ہو سکے، علماء نے اسماء حسنیٰ سے واقفیت کو توحید کی بنیاد قرار دیا ہے۔

یہ بات یاد رکھنی چاہئے کہ قرآن مجید میں چار مقامات پر یہ ذکر آیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے "اسماء حسنی" ہیں، حسنی کا لفظ احسن کی تانیث ہے جس کا معنی ہے، یعنی سب سے بہتر نام، اسماء حسنی یہ اللہ کے صفاتی نام ہیں، ان میں صرف لفظ "اللہ" نام قرآن مجید میں عَلَم کے طور پر

استعمال ہوا ہے، بعض حضرات نے ”الرحمن“ کو بھی علم ثابت کیا ہے، جیسے قرآنی آیت ”الرحمن، علم القرآن“ میں ہے، قرآن وحدیث میں اللہ کے سو سے زائد نام ملتے ہیں؛ لیکن حضور اکرمؐ نے فرمایا: ”اللہ کے ننانوے نام ہیں، سو میں ایک کم، جو ان کو یاد کرے یا شمار کرے وہ جنت میں داخل ہوگا“۔ صحیح حدیثوں میں ان ناموں کی وضاحت نہیں ملتی، بعض حدیثوں میں ان ننانوے ناموں کو شمار بھی کرایا گیا ہے؛ لیکن وہ سند کے اعتبار سے ضعیف ہیں، اور زیادہ صحیح یہ ہے کہ راویوں نے قرآن وحدیث کے گہرے مطالعہ کے ذریعہ ان ننانوے ناموں کو خود دریافت کیا ہے۔ ان میں بعض وہ ہیں جو قرآن میں آئے ہیں، بعض وہ ہیں جن کی دعاؤں میں آپؐ نے تعلیم فرمائی ہے، یہ بات ذہن نشیں رہنی چاہئے کہ اکثر ائمہ ومحدثین کے نزدیک اللہ تعالیٰ کے اسماء وصفات انہیں ننانوے ناموں میں محدود نہیں یعنی ان کے علاوہ بھی نام قرآن وحدیث میں آئے ہیں، جیسا کہ اوپر ذکر کیا گیا۔ ایک سوال ذہن میں یہ آسکتا ہے کہ یہ نام مکمل سو کیوں نہیں ہیں، اس کی وجہ ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ طاق ہے اور وہ طاق عدد کو پسند کرتا ہے، اس سے توحید کی صفت اور کھل کر سامنے آتی ہے، دوسرے ناموں کے درمیان ان ناموں کی حیثیت فضیلت میں اس طرح بڑھی ہوئی ہے کہ ان کو یاد کرنے یا شمار کرنے پر جنت میں داخلہ کی ضمانت دی گئی ہے۔

یہ اور ان کے علاوہ قرآن وحدیث میں اللہ کے جو نام آئے ہیں وہ توقیفی ہیں جس کا مطلب یہ ہے کہ ہم اپنی طرف سے اللہ کے کسی فعل کو اس کی طرف منسوب کرتے ہوئے کسی صفت کا استعمال نہیں کرسکتے، بعض علماء مثلاً امام غزالی اور امام رازی وغیرہ نے اس شرط کے ساتھ اللہ کے لئے قرآن وحدیث میں مذکور اسماء کے علاوہ دوسرے ناموں کے استعمال کی اجازت دی ہے کہ اس لفظ سے کوئی ایسے معنی نکلتے ہوں جو اللہ تعالیٰ کے شایان شان ہوں۔

11.4 اسماء حسنی، ان کی اقسام اور ان پر ایمان کا مفہوم

اللہ تعالیٰ کے ننانوے اسماء حسنی یہ ہیں:

هُوَ اللّٰهُ الَّذِيْ لَاۤ إِلٰهَ إِلَّا هُوَ

وہ اللہ ہے جس کے سوا کوئی معبود نہیں

1۔ اَلرَّحْمٰنُ	2۔ اَلرَّحِيْمُ	3۔ اَلْمَلِکُ	4۔ اَلْقُدُّوْسُ	5۔اَلسَّلَامُ
بے حد رحم کرنے والا	بڑا مہربان	حقیقی بادشاہ	برائیوں سے پاک	بے عیب ذات
6۔ اَلْمُؤْمِنُ	7۔اَلْمُهَيْمِنُ	8۔ اَلْعَزِيْزُ	9۔ اَلْجَبَّارُ	10۔ اَلْمُتَكَبِّرُ
امن دینے والا	نگہباں	سب پر غالب	سب سے زبردست	بڑائی اور بزرگی والا
11۔ اَلْخَالِقُ	12۔ اَلْبَارِئُ	13۔ اَلْمُصَوِّرُ	14۔ اَلْغَفَّارُ	15۔ اَلْقَهَّارُ
پیدا کرنے والا	جان ڈالنے والا	صورت دینے والا	درگذر کرنے والا	اپنے قابو میں رکھنے والا
16۔ اَلْوَهَّابُ	17۔ اَلرَّزَّاقُ	18۔ اَلْفَتَّاحُ	19۔ اَلْعَلِيْمُ	20۔ اَلْقَابِضُ

عطا کرنے والا	رزق دینے والا	مشکل کشا	وسیع علم والا	روزی تنگ کرنے والا
21- اَلْبَاسِطُ	22- اَلْخَافِضُ	23- اَلرَّافِعُ	24- اَلْمُعِزُّ	25- اَلْمُذِلُّ
روزی فراخ کرنے والا	پست کرنے والا	بلند کرنے والا	عزت دینے والا	ذلت دینے والا
26- اَلسَّمِيْعُ	27- اَلْبَصِيْرُ	28- اَلْحَكَمُ	29- اَلْعَدْلُ	30- اَللَّطِيْفُ
سب کچھ سننے والا	سب کچھ دیکھنے والا	حاکم مطلق	سراپا انصاف	بہت نرمی کرنے والا
31- اَلْخَبِيْرُ	32- اَلْحَلِيْمُ	33- اَلْعَظِيْمُ	34- اَلْغَفُوْرُ	35- اَلشَّكُوْرُ
سب کچھ جاننے والا	بڑا بردبار	بڑا بزرگ	بہت بخشنے والا	قدر دان
36- اَلْعَلِيُّ	37- اَلْكَبِيْرُ	38- اَلْحَفِيْظُ	39- اَلْمُقِيْتُ	40- اَلْحَسِيْبُ
بہت بلند و برتر	بہت بڑا	سب کا محافظ	توانائی دینے والا	کفایت کرنے والا
41- اَلْجَلِيْلُ	42- اَلْكَرِيْمُ	43- اَلرَّقِيْبُ	44- اَلْمُجِيْبُ	45- اَلْوَاسِعُ
بلند مرتبہ والا	بہت کرم کرنے والا	بڑا نگہبان	دعا قبول کرنے والا	وسعت دینے والا
46- اَلْحَكِيْمُ	47- اَلْوَدُوْدُ	48- اَلْمَجِيْدُ	49- اَلْبَاعِثُ	50- اَلشَّهِيْدُ
بڑی حکمتوں والا	بہت محبت کرنے والا	بڑا بزرگ	مردوں کو زندہ کرنے والا	حاضر و ناظر
51- اَلْحَقُّ	52- اَلْوَكِيْلُ	53- اَلْقَوِيُّ	54- اَلْمَتِيْنُ	55- اَلْوَلِيُّ
برحق و برقرار	بڑا کارساز	بڑی طاقت والا	شدید قوت والا	مددگار و حمایتی
53- اَلْحَمِيْدُ	57- اَلْمُحْصِيْ	58- اَلْمُبْدِئُ	59- اَلْمُعِيْدُ	60- اَلْمُحْيِيْ
لائق تعریف	شمار میں رکھنے والا	پہلی بار پیدا کرنے والا	دوبارہ پیدا کرنے والا	زندگی دینے والا
61- اَلْمُمِيْتُ	62- اَلْحَيُّ	63- اَلْقَيُّوْمُ	64- اَلْوَاجِدُ	65- اَلْمَاجِدُ
موت دینے والا	ہمیشہ زندہ رہنے والا	ہمیشہ قائم رکھنے والا	ہر چیز کو پانے والا	بزرگی
66- اَلْوَاحِدُ	67- اَلْأَحَدُ	68- اَلصَّمَدُ	69- اَلْقَادِرُ	70- اَلْمُقْتَدِرُ
بڑائی والا	اکیلا تنہا	بے نیاز	قدرت والا	پوری مقدرت رکھنے والا
71- اَلْمُقَدِّمُ	72- اَلْمُؤَخِّرُ	73- اَلْأَوَّلُ	74- اَلْآخِرُ	75- اَلظَّاہِرُ
پہلے اور آگے کرنے والا	پیچھے اور بعد میں رکھنے والا	سب سے پہلے	سب کے بعد	ظاہر و آشکارہ
76- اَلْبَاطِنُ	77- اَلْوَالِيْ	78- اَلْمُتَعَالِيْ	79- اَلْبَرُّ	80- اَلتَّوَّابُ

پوشیدہ وپنہاں	متولی اور متصرف	سب سے بلند اور برتر	بڑا اچھا سلوک کرنے والا	توبہ قبول کرنے والا
81۔ اَلْمُنْتَقِمُ	82۔ اَلْعَفُوُّ	83۔ اَلرَّؤُفُ	84۔ مَالِکُ الْمُلْکِ	85۔ ذُو الْجَلاَلِ وَالْإِکْرَامِ
بدلہ لینے والا	معاف کرنے والا	بہت بڑا مشفق	سلطنت کامالک	عظمت وجلال اور انعام واکرام والا
86۔ اَلْمُقْسِطُ	87۔ اَلْجَامِعُ	88۔ اَلْغَنِيُّ	89۔ اَلْمُغْنِيْ	90۔ اَلْمَانِعُ
عدل وانصاف کرنے والا	سب کو جمع کرنے والا	بڑا بے نیاز	بے نیاز و غنی بنا دینے والا	روک دینے والا
91۔ اَلضَّارُّ	92۔ اَلنَّافِعُ	93۔ اَلنُّوْرُ	94۔ اَلْهَادِيْ	95۔ اَلْبَدِيْعُ
نقصان پہنچانے والا	نفع پہنچانے والا	سراپا نور	سیدھا راستہ دکھانے والا	ایجاد کرنے والا
96۔ اَلْبَاقِيْ	97۔ اَلْوَارِثُ	98۔ اَلرَّشِیْدُ	99۔ اَلصَّبُوْرُ	
ہمیشہ باقی رہنے والا	سب کے بعد موجود رہنے والا	بڑا نیک	بہت زیادہ صبر و تحمل والا	

ان میں کچھ صفات وہ ہیں جن سے اللہ تعالیٰ کے رحم وکرم اور محبت کا اظہار ہوتا ہے، کچھ صفات وہ ہیں جن سے خدا کی بڑائی اور کبریائی کا اظہار ہوتا ہے، اور کچھ وہ ہیں جن سے اللہ تعالیٰ کی خوبی، بڑائی، بزرگی اور ہر وصف میں اس کا کامل ہونا ظاہر ہوتا ہے، اس طرح یہ اسماء وصفات پانچ قسم کے ہیں، ایک وہ جو اس کی وحدانیت سے متعلق ہیں، دوسرے وہ جو وجود سے تعلق رکھتے ہیں، تیسرے اس کے علم سے، چوتھے اس کی قدرت سے اور پانچویں اس کی تنزیہہ اور پاکی سے۔

غالباً سب سے پہلے حضرت امام جعفر صادقؒ نے اللہ تعالیٰ کے اسماء قرآن کریم سے اخذ کئے، ان کے بعد سفیان بن عیینہ اور ابوزید بغوی نے قرآن کریم سے ان ناموں کی تخریج کی، اوپر ذکر کئے گئے اسماء حسنیٰ ترمذی کی ایک روایت (حدیث نمبر: 3849) میں ہیں، اور ان حضرات کے قرآن وحدیث سے ننانوے ناموں کے انتخاب میں جزوی فرق بھی پایا جاتا ہے۔

قرآن وحدیث میں اللہ تعالیٰ کی جو صفات بیان کی گئی ہیں ان پر بغیر کسی تشبیہ وتمثیل اور تکییف (مشابہت، مثالی اور کیفیت) کے ایمان لانا واجب ہے، مثلاً اللہ تعالیٰ خوب سننے اور جاننے والا ہے، یہ سننا اور جاننا انسان کے سننے اور جاننے سے اپنی نوعیت، اپنی وسعت اور اپنے مرتبہ میں بہت بلند ہے، اللہ تعالیٰ کی ان صفات کو انسان میں پائی جانے والی صفات سے تشبیہ دینا جائز نہیں، اسی طرح مثلاً اللہ تعالیٰ کے ہاتھ اور انگلیوں وغیرہ کا تذکرہ بھی قرآن وحدیث میں آیا ہے، ان پر بغیر تشبیہ وتمثیل کے ایمان لانا ضروری ہے اسی طرح حدیث میں ہے کہ اللہ تعالیٰ ہر رات آسمان دنیا (قریبی آسمان) پر نزول فرماتے ہیں، اللہ تعالیٰ کے اس نزول پر کیفیت کی تلاش وجستجو کے بغیر ایمان لانا ضروری ہے۔

11.5 شرک سے اجتناب

اللہ تعالیٰ کا بندوں پر دوسرا حق یہ ہے کہ وہ اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ کریں، شرک سے اجتناب بھی حقوق الٰہی میں شامل ہے۔

لغوی واصطلاحی معنی

شرک کے لغوی معنی یہ ہوتے ہیں کہ کوئی چیز دو یا دو سے زیادہ افراد کے درمیان مشترک ہو، ان میں سے کسی ایک کے ساتھ خاص نہ ہو، شریعت میں ”شرک“ کے معنی یہ ہیں کہ اللہ کی ذات، اس کے اسماء حسنیٰ، اس کی عبادت اور اس کے دوسرے حقوق میں کسی غیر کو اس کا شریک قرار دینا، یعنی مخلوق کی عبادت یا مخلوق کی تعظیم اس طرح کرنا جیسے اللہ کی تعظیم واجب ہے، یا اللہ تعالیٰ کے ساتھ جو اوصاف اور حقوق خاص ہیں، ان کو کسی بندے کے لئے ماننا شرک ہے، شاہ اسماعیل شہید دہلوی فرماتے ہیں:

”شرک صرف اس بات پر موقوف نہیں کہ بلا کسی فرق کے انسان کسی کو اللہ کے برابر کر دے؛ بلکہ شرک یہ بھی ہے کہ انسان وہ مخصوص اعمال اللہ کے علاوہ کسی اور کے لئے انجام دے جو اللہ تعالیٰ نے اپنی ذات والا صفات کے لئے خاص کئے ہیں، اور جن کو بندوں کے لئے بندگی کی علامت قرار دیا ہے“۔

قرآن وحدیث میں شرک اور کفر دونوں ایک معنی میں استعمال ہوئے ہیں اور فرق کے ساتھ بھی، دونوں میں فرق یہ ہے کہ کفر کے معنی اللہ کی ناشکری یا اللہ کا انکار کرنے کے ہیں جب کہ شرک کے معنی اللہ تعالیٰ کو ماننے کے ساتھ ساتھ کسی اور کو اس کی کسی خاص صفت میں شریک کر لینا ہے۔

11.6 شرک کی قسمیں

1. شرک اکبر یا شرک جلی

شرک کی پہلی قسم شرک اکبر یا شرک جلی ہے، یعنی بڑا شرک یا نمایاں شرک جیسے کسی کو اللہ کی ذات میں شریک کرنا مثلاً خدا کو کسی سے یا کسی کو خدا سے قرار دینا، کسی کو اس کی ذات برادری سمجھنا، کسی کو اس کا باپ یا بیٹا کہنا مثلاً عیسائیوں کا یہ عقیدہ کہ مسیح خدا کے جوہر سے ہیں یا خدا نے ان کو جنا ہے، یا حضرت مریم خدا کی ماں ہیں، یا عربوں کا یہ عقیدہ کہ فرشتے خدا کی بیٹیاں ہیں۔ یہ ساری باتیں خدا کے ازلی اور ابدی ہونے اور ان تمام صفات کمال کے منافی ہیں جن کا ماننا عقل، فطرت اور مذہب کی رو سے لازم ہے۔ یا کسی کو اللہ کی صفات میں شریک کرنا یعنی جو صفات کمال خدا کے لئے مخصوص ہیں، مثلاً خلق، تدبیر، قدرت، علم، حکمت وغیرہ ان میں کسی کو خدا کا ساجھی قرار دینا؛ لیکن ان میں سے بہت سی صفات کے ساتھ یہ قید لگی ہوئی ہے کہ جس مفہوم میں وہ خدا کے لئے مستعمل ہیں، ان میں ساجھی قرار دینا، چونکہ یہی صفتیں بسا اوقات ہم اپنے ہی جیسے انسانوں کے لئے بھی استعمال کرتے ہیں، لیکن ظاہر ہے کہ جب ہم ان کو خدا کے لئے بولتے ہیں تو ان کا مفہوم بالکل خاص ہوتا ہے جو اس کے شایان شان ہوتا ہے۔ اور جب ان کو انسانوں کے لئے بولتے ہیں تو خدائی مفہوم سے ان کو بالکل الگ کر کے بولتے ہیں، مثلاً حکیم کی صفت ہم خدا اور آدمی دونوں کے لئے بولتے ہیں، لیکن جب اس کو خدا کے لئے بولتے ہیں تو اس کا مطلب کچھ اور ہوتا ہے، اگر انسان کے لئے بھی اس صفت کو اسی مفہوم میں بول دیں جس مفہوم میں خدا کے لئے بولتے ہیں تو یہ صفات میں شرک قرار دیا جائے گا۔ یا اللہ کے حقوق میں کسی کو شریک کیا جائے، اس کا مفہوم یہ ہے کہ خدا کی صفات کمال سے جو باتیں لازم آتی ہیں یا جو حقوق ہم پر

عائد ہوتے ہیں، ان میں کسی کو شریک ٹھہرانا مثلاً خدا خالق ہے تو اس سے لازم آتا ہے کہ تمام عالم میں حکم اور انتظام بھی اس کا نافذ ہو، اب اگر کوئی یہ مانے کہ آسمان وزمین کا خالق خدا ہے؛ لیکن ساتھ ہی یہ بھی مان لے کہ ان کا انتظام خدا کے سوا کسی اور کے ہاتھ میں ہے تو یہ بھی شرک ہے۔

2. علم غیب

شرک کی ایک قسم یہ ہے کہ خدا کے ساتھ جو اوصاف مخصوص ہیں اوروں میں تسلیم کئے جائیں، ان میں سے ایک صفت علم غیب ہے، بنی اسرائیل کے زمانہ میں کاہنوں کا یہی کام تھا کہ وہ آئندہ کے واقعات کی پیشن گوئیاں کیا کرتے تھے، کبھی فال سے، کبھی پانسے پھینک کر اور کبھی یہ ظاہر کرکے کہ ان کو جنات غیب کا حال بتاتے ہیں۔ حضورؐ نے نہایت تاکید کے ساتھ اس خیال کو مٹایا اور علم غیب کی تمام صورتیں باطل قرار دیں، قرآن مجید میں بے شمار آیتیں نازل ہوئیں جن میں اللہ کے علاوہ کسی اور کو براہِ راست علم غیب ہونے کی نفی کی گئی ہے، ایک آیت میں فرمایا گیا:

> ”اور خدا کے پاس غیب کی کنجیاں ہیں جن کو خدا کے سوا کوئی نہیں جانتا“ (الأنعام:95)

حضورؐ نے اس کی وضاحت اس طرح فرمائی:

”پانچ چیزیں ایسی ہیں جو مفاتیح غیب (غیب کی کنجیاں) ہیں جن کو خدا کے سوا کوئی نہیں جانتا (1) کل کیا ہوگا (2) مادر رحم میں جو کمی بیشی ہوتی ہے، لڑکا ہے یا لڑکی (3) بارش کب ہوگی (4) کس جگہ موت آئے گی (5) قیامت کب آئے گی (بخاری:4697)

علم غیب کی اور بھی صورتیں ہیں؛ لیکن زیادہ تر لوگ علم غیب کا دعوی کرنے والوں سے انہیں باتوں کو جاننا چاہتے تھے، ایک دفعہ ایک شادی کے موقع پر حضورؐ تشریف فرما تھے، انصار کی بچیاں گا رہی تھیں، اسی درمیان انہوں نے یہ گانا شروع کیا: ”وَفِيْنَا نَبِيٌّ يَعْلَمُ مَا فِيْ غَدِ“ (اور ہم میں ایک ایسا پیغمبر ہے جو کل کی بات جانتا ہے) حضورؐ نے منع فرمایا کہ یہ نہ کہو، وہی کہو جو پہلے کہہ رہی تھیں (بخاری: 6551)، اللہ تعالیٰ نے حضورؐ کو حکم فرمایا کہ آپ اس حقیقت کو واضح کر دیں کہ:

> ”کہہ دو کہ میں یہ نہیں کہتا کہ میرے پاس اللہ کے خزانے ہیں اور نہ میں غیب کی باتیں جانتا ہوں“ (الانعام:50)

3. غیر اللہ کی قسمیں کھانا

شرک کی ایک نہایت باریک صورت یہ تھی کہ لوگ غیر اللہ کی قسمیں کھاتے تھے، قسم کھانے کے معنی حقیقت میں شہادت کے ہیں، جس کی قسم کھائی جاتی ہے اس کو دراصل واقعہ پر گواہ بنایا جاتا ہے، عربوں میں بت پرستی کے رواج کی وجہ سے بتوں اور دیوتاؤں کی قسمیں کھائی جاتی تھیں جو صریح کفر تھا، قریش اپنے دیوتاؤں لات وعزی کی قسمیں کھایا کرتے تھے، حضورؐ نے اس سے منع فرمایا؛ لیکن رواج اور عادت کی وجہ سے مسلمان ہونے کے بعد بھی بے اختیار ان کی زبان سے ان بتوں کی قسمیں نکل جاتی تھیں، آپ نے فرمایا کہ:

> ”جس شخص کی زبان سے لات وعُزّٰی کی قسمیں نکل جائے وہ فوراً لا الہ الا اللہ کہہ لے“ (ابن حبان:5705)

یہ گویا اس کفر کے کلمہ سے توبہ ہے، قریش میں باپ اور ماں کی قسمیں کھانے کا رواج تھا، اس سے بھی آپ نے منع فرمایا، کعبہ کی قسم کھانے سے بھی منع فرمایا، ایک دفعہ حضرت عبد اللہ بن عمرؓ نے کسی کو کعبہ کی قسم کھاتے سنا تو اس کو منع کیا اور فرمایا کہ:

”غیر خدا کی قسم نہ کھائی جائے، میں نے رسول اللہؐ کو یہ کہتے ہوئے سنا کہ جس نے غیر اللہ کی قسم کھائی اس نے کفر کیا“ (مستدرک حاکم:169)

تمام فقہاء کا اتفاق ہے کہ اللہ کے علاوہ کسی اور کی قسم کھانا ممنوع ہے، حنابلہ اس کو حرام سمجھتے ہیں، احناف مکروہ تحریمی، مالکیہ اور شوافع مکروہ تنزیہی، لیکن یہ اس وقت ہے جب کہ اس کے علاوہ کسی اور کی قسم کھانے میں اللہ کی سی تعظیم مقصود نہ ہو، گو کہ اس کے باوجود بھی ایمان وعقیدہ کے لئے نقصان دہ ہے، اور اس سے بچنا ضروری ہے، لیکن اگر غیر اللہ کو اللہ کا درجہ دے کر اس کی قسم کھائی جائے تو یہ شرک ہے۔

اسی سے ملتا جلتا ایک مسئلہ یہ ہے کہ بعض لوگ اللہ تعالیٰ کی مشیت میں دوسروں کو شریک کر لیتے ہیں، حضور اکرمؐ کے سامنے جب کسی نے کہا:

”جو خدا چاہے اور جو حضور چاہیں تو آپؐ نے اس سے منع فرمایا، اور یہ تصحیح فرمائی کہ خدا اور غیر کی مشیت کے درمیان عطف کا واؤ (اور) نہ لایا جائے کہ اس سے برابری کا شائبہ ہو؛ بلکہ ثم (پھر) کا لفظ بولا جائے“ (نسائی:4696)

تاکہ معلوم ہو کہ خدا کی مشیت کے بعد اوروں کی مشیت کا درجہ ہے۔

11.6.1 شرک کے بعض دیگر ذرائع

کائنات میں اللہ تعالیٰ کے علاوہ جن غیبی اسباب اور علتوں یعنی جادو، طلسم، جنات وشیاطین اور ارواح خبیثہ اور دوسری قسم کی قوتوں کی غیبی قدرت اور تصرف کا عقیدہ لوگوں میں عام تھا اور ان سے بچنے کے لئے ان کے ناموں کی دہائی دی جاتی تھی، نذر چڑھائی جاتی تھی، قربانی کی جاتی۔ تھی، حضور اکرمؐ نے ان سے بھی منع فرمایا تاکہ اللہ کے سوا کسی اور پوشیدہ طاقت کا ڈر دل میں نہ رہ جائے اور دعاء اور قرآنی آیات کے علاوہ ہر قسم کے جھاڑ پھونک، منتر، تعویذ گنڈے، ٹوٹکے جن میں کسی غیر اللہ سے غیبی استمداد یا شرک کا کلمہ ہو، آپ نے اس کو شرک قرار دیا (مستدرک حاکم:7513)، اسی طرح ان اوہام وخرافات کو بھی موثر حقیقی سمجھنے سے روک دیا جن کے بارے میں یہ غلط عقیدہ رائج تھا، آپؐ نے فرمایا:

”نہ چھوت ہے، نہ بدفالی، نہ پیٹ میں بھوک کا سانپ ہے، نہ مردہ کی کھوپڑی سے پرندہ نکلتا ہے“ (بخاری:5707)

چوں کہ یہ چیزیں شرک تک پہنچانے والی ہیں، آپؐ نے ان سے بھی منع فرمایا، ایک روایت میں فرمایا:

”پرندوں کی بولی سے فال لینا، ان کے اڑنے سے فال لینا اور کنکری پھینک کر یا خط کھینچ کر حال بتانا شیطانی کام ہے“

اسی طرح جن باتوں میں شرک کا ذرا بھی شائبہ پایا جاتا ان سے بھی آپ نے بالکل منع فرما دیا، عبد کے معنی بندے اور غلام کے

ہوتے ہیں، شمس کے معنی سورج کے، آپ نے عبد الشمس نام رکھنے سے منع فرمایا کہ اس سے شرک کی بو آتی ہے، کسی کو شہنشاہ یعنی تمام بادشاہوں کا بادشاہ کہنے سے روک دیا کہ اس میں بھی شرک کا احتمال تھا، اسلام میں قبر پرستی اور یادگار پرستی سے بھی اس لئے منع فرمایا گیا کہ یہاں سے شرک کا دروازہ کھلتا ہے، وفات سے پانچ دن پہلے آپؐ نے فرمایا:

”تم سے پہلے لوگ قبروں کو مسجد بنالیتے تھے، میں تم کو منع کرتا ہوں، قبروں کو مسجد نہ بنانا“(مسلم:1216)

عین وفات سے پہلے چادر چہرہ سے الٹ دی اور فرمایا کہ خدا یہود ونصاری پر لعنت کرے کہ ان لوگوں نے اپنے پیغمبروں کی قبروں کو مسجد بنایا(مسند احمد 26932)۔

1. شرک خفی یا شرک اصغر

اسلام میں توحید کی اہمیت کا اندازہ لگانے کے لئے یہ کافی ہے کہ جس طرح ایسے اعمال سے منع کر دیا گیا جو شرک ہیں، ایسی نیتوں سے بھی روک دیا گیا جو اللہ کے علاوہ کسی اور کے لئے کی گئی ہوں، حضرت ابو سعید خدریؓ کہتے ہیں کہ حضورؐ نے فرمایا:

”جس نے دکھاوے کی نماز پڑھی اس نے شرک کیا، جس نے دکھاوے کا روزہ رکھا اس نے شرک کیا، جس نے دکھاوے کی خیرات کی اس نے شرک کیا“(مسند احمد:17140)

حضرت محمود بن لبید انصاری کہتے ہیں کہ آپؐ نے صحابہؓ سے فرمایا:

”مجھ کو سب سے زیادہ جس کا تم پر خوف ہے وہ شرک اصغر ہے، صحابہ نے عرض کیا: یارسول اللہ! شرک اصغر کیا ہے؟ فرمایا: قیامت کے دن جب لوگوں کو اپنے اپنے عمل کا بدلہ مل رہا ہوگا، خدا ریاکار لوگوں سے کہے گا کہ تمہارے لئے ہمارے یہاں کچھ نہیں، تم انہیں کے پاس جاؤ جن کو دکھانے کے لئے دنیا میں کام کیا کرتے تھے“(شعب الایمان للبیہقی:6412)

شرک کی مذمت

جیسا کہ شروع میں ذکر کیا گیا کہ اللہ تعالیٰ کو ذات وصفات میں یکتا سمجھنا بندوں پر اللہ کا پہلا حق ہے، جو چیز بھی اس عقیدہ کو ٹھیس پہنچانے والی ہو وہ قابل مذمت ہوگی، اس لئے قرآن مجید میں شرک کو ظلم عظیم قرار دیا گیا(لقمان:13) اللہ تعالیٰ نے شرک کرنے والے کے لئے ہمیشہ کی جہنم لکھ دی ہے، اور جنت کو اس پر حرام قرار دیا ہے، انسان بڑے سے بڑے گناہ کے بعد بغیر توبہ کے اس دنیا سے چلا جائے تو اللہ کی رحمت سے اس کی معافی کی امید کی جاسکتی ہے؛ لیکن شرک ایک ایسا گناہ عظیم ہے کہ اللہ تعالیٰ نے یہاں تک فرمادیا:

”إِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ أَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ وَيَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَاءُ“(النساء:48)

(اللہ تعالیٰ یہ معاف نہیں فرمائے گا کہ اس کے ساتھ شرک کیا جائے اور اس کے علاوہ جو چاہے گا معاف فرمادے گا)۔

11.7 عبادت

لغوی واصطلاحی معنی

لغوی معنی: ”عبادۃ“ عَبَدَ یَعبُدُ کا مصدر ہے، اس کے معنی ہے: تعظیم کی نیت اور ارادہ سے کسی کے سامنے جھکنا اور پست ہونا، یہ عمل صرف اللہ کے لئے جائز ہے، یہ لفظ اطاعت کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے، اہل عرب ایسے اونٹ کو بَعیرٌ مُعَبَّدٌ کہتے ہیں جو سواری کے لئے پوری طرح قابو میں آ گیا ہو اور ”طَرِیْقٌ مُعَبَّدٌ“ اس راستہ کو کہتے ہیں جو کثرت سے پامال ہو کر ہموار بن گیا ہو۔

اصطلاحی معنی: اس کی کئی تعریف کی گئی ہے، ان میں چند یہ ہیں:

(1) اللہ کے لئے جھکاؤ اور عاجزی کا سب سے اعلیٰ درجہ۔

(2) مکلف کا اپنے نفس کے تقاضہ کے خلاف اپنے رب کی تعظیم میں کوئی کام کرنا۔

(3) ایسا کام کرنا جس سے صرف اللہ کی تعظیم مقصود ہو اور اللہ تعالیٰ نے اس کا حکم بھی دیا ہو۔

(4) ہر وہ قول اور قلبی وجسمانی عمل جس کو اللہ تعالیٰ پسند فرماتا ہے اور جس سے خوش ہوتا ہے عبادت ہے۔

(5) وہ عمل جس کے کرنے پر ثواب ہو، اور اس کا صحیح ہونا نیت پر موقوف ہو۔

علامہ ابن تیمیہؒ فرماتے ہیں: ہر وہ قول وعمل جو اللہ تعالیٰ کو پسند ہو، خواہ وہ ظاہری ہو یا باطنی عبادت ہے، مثلاً نماز، زکوۃ، روزہ، حج، سچ بولنا، امانت کا پاس ولحاظ کرنا، والدین کے ساتھ حسن سلوک، صلہ رحمی، وعدہ کو پورا کرنا، بھلائی کا حکم دینا، برائی سے روکنا، حق کے غلبہ کے لئے ہر طرح کی جدوجہد، پڑوسیوں، یتیموں، مسافروں، غلاموں اور جانوروں کے ساتھ اچھا سلوک، ذکر و دعاء، قرآن کی تلاوت، اللہ کی محبت، اس کا خوف، اس کی طرف رجوع، اخلاص، شکر و صبر، تقدیر پر راضی رہنا، توکل اور اللہ کی رحمت کی امید اور ان جیسے تمام کام عبادت میں داخل ہیں۔

11.7.1 عبادت کی اقسام

قلبی اعمال: وہ اعمال جن کا تعلق دل سے ہے، جیسے توکل یعنی صرف ایک اللہ پر بھروسہ کرنا، ”رجاء“ صرف اللہ سے ہی اچھی امید رکھنا، ”خوف“ صرف اللہ سے ڈرنا، ”انابت“ صرف اللہ سے رجوع ہونا، حضورؐ نے فرمایا: ”اچھا گمان کرنا بھی بہترین عبادت ہے“ (مسند احمد: 7956) ایک حدیث میں آپؐ نے فرمایا: ”سب سے افضل عبادت مصیبت کے ختم ہونے کا انتظار ہے“ (ترمذی: 3919)

تعبّدی اعمال: وہ مخصوص اعمال جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے اللہ کی بندگی کی علامت قرار پا گئے، ان کی تین قسمیں ہیں: بدنی عبادتیں جیسے نماز اور روزہ، مالی عبادتیں جیسے زکوۃ، بدنی اور مالی دونوں خصوصیت رکھنے والی عبادت جیسے حج۔ جب مطلق ”عبادت“ یا ”عبادات“ کا لفظ ذکر کیا جاتا ہے تو ان سے یہی عبادتیں مراد ہوتی ہیں، ان کو عبادات خاص طور سے اس لئے کہتے ہیں کہ یہ اخروی اعمال ہیں، جب تک ان کو بجالانے کا مقصد دنیا طلبی نہ ہو ان پر آخرت کا ثواب اور جزاء کا وعدہ ہے، اگرچہ ہماری عقلیں ان کی مصلحتوں اور فوائد کو نہ سمجھ سکیں۔

ایسے تمام اعمال کو جن کے کرنے یا نہ کرنے پر ثواب کا وعدہ ہے، بجالانا، یا ان سے بچنا بھی عبادت ہے، اس کے لئے شرط یہ ہے کہ ان میں اللہ سے قریب ہونے کی نیت ہو، ایک حدیث میں حضورؐ نے فرمایا:

”اے ابوہریرہ! ورِع (پرہیز گار) بن جاؤ سب سے بڑے عبادت گذار ہو جاؤ گے“ (ابن ماجہ: 4217)

ورع یا متقی اس شخص کو کہتے ہیں جو حرام و مکروہ اور مشتبہ چیزوں سے بچنے والا ہو، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلام نے عبادت کا دائرہ بہت وسیع کر دیا ہے، حتی کہ ہر وہ عمل جس سے معاشرہ کو فائدہ پہنچے اسلام میں عبادت کے زمرہ میں داخل ہے شرط یہ ہے کہ اس کام کو کرنے والے کی نیت صرف شہرت حاصل کرنا اور لوگوں سے تعریفیں سننا نہ ہو، حضورؐ نے دو جھگڑا کرنے والوں کے درمیان صلح کرانے کے بارے میں فرمایا کہ روزہ، نماز اور صدقہ سے بہتر ہے (الأدب المفرد: 1391) روزہ، نماز اور صدقہ وغیرہ خالص عبادتیں ہیں، لیکن ایک شخص اگر نفل نمازوں، روزے اور صدقے کی ادائیگی کے بجائے دلوں کو ملانے کا کام انجام دیتا ہے تو یہ بھی عبادت ہے، اور اس کا ثواب بسا اوقات ان سے بڑھ کر ہے، مریض کی عیادت کے بارے میں حضورؐ نے فرمایا:

”جو کسی مریض کی عیادت کے لئے نکلتا ہے آسمان سے ایک آواز دینے والا یہ آواز دے کر کہتا ہے کہ تم پاکیزہ، تمہارا چلنا مبارک، تم نے جنت میں ایک ٹھکانہ بنالیا (ابن ماجہ: 1443)

اسلام ان اعمال کو صرف پسند نہیں کرتا بلکہ ان کی ترغیب بھی دیتا ہے، ان کا حکم دیتا ہے، اور ان کو ایک مسلمان کی یومیہ ذمہ داری قرار دیتا ہے، بلکہ اسلام نے ان کی اہمیت اس قدر بڑھادی ہے کہ کہیں ان کو ”صدقہ“ اور کہیں ”صلاۃ“ کے لفظ سے یاد کیا، ایک حدیث میں ہے، حضورؐ نے فرمایا:

”انسان کے ہر جوڑ پر صدقہ ہے، ہر دن جس میں سورج طلوع ہوتا ہے، اگر وہ دو لوگوں کے درمیان انصاف کرتا ہے تو یہ صدقہ ہے، کسی کی مدد اس کے جانور کے سلسلے میں کر دیتا ہے، اس کو اس پر سوار کر دیتا ہے یا اس پر اس کا سامان رکھ دیتا ہے تو یہ صدقہ ہے، بھلی بات کہنا بھی صدقہ ہے، نماز کے لئے چل کر جاتا ہے تو اس کا ہر ہر قدم صدقہ ہے، راستہ سے تکلیف دہ چیز ہٹاتا ہے تو یہ بھی صدقہ ہے“ (بخاری: 2989)

صدقہ اصلاً اللہ کی رضا کے لئے کسی غریب کی مالی مدد کو کہتے ہیں، اور یہ خالص عبادت ہے: لیکن ہر شخص اس کی استطاعت نہیں رکھتا؛ چنانچہ اسلام نے بھلائی کے تمام کاموں کو صدقہ قرار دے دیا، اور اس طرح ان کو بھی عبادت میں شامل کر دیا، ایک حدیث میں آپ ا نے یہاں تک فرمایا:

”انسان کے ہر جوڑ پر ہر دن نماز ہے، ایک شخص نے کہا: یارسول اللہ! یہ تو بہت مشکل ہے، آپ نے فرمایا: بھلائی کا حکم دینا، برائی سے روکنا، کمزور کی مدد کرنا، اور ہر وہ قدم جو تم میں سے کوئی نماز کے لئے اٹھاتا ہے نماز ہے“ (المعجم الکبیر للطبرانی: 11791)

اس سے زیادہ حیرت انگیز بات یہ ہے کہ آپؐ نے خالص دنیوی کاموں کو جو انسان اپنی گذر بسر کے لئے کرتا ہے عبادت قرار دیا ہے، شرط یہ ہے کہ وہ کام اسلام کی نظر میں درست ہو، اس میں اچھی نیت شامل ہو، اس میں اللہ کے حدود کا لحاظ رکھا گیا ہو، دوسروں کی حق تلفی، خیانت اور دھوکہ سے اپنے معاملہ کو محفوظ رکھا گیا ہو، اور دنیوی کاموں میں مشغولیت کی وجہ سے دینی فرائض وواجبات سے غفلت نہ ہونے پائے، اگر ایک مسلمان ان امور کی رعایت کرتا ہے تو وہ اپنی دنیوی مشغولیتوں میں بھی عبادت گذار شمار ہوگا گو کہ وہ مسجد میں نہ

ہو۔ اسی طرح خالص وہ امور جو انسان اپنی فطری خواہشات کی تکمیل کے لئے کرتا ہے نیت کی درستگی سے عبادت بن جاتے ہیں، جیسے کھانا پینا، بیوی سے مباشرت وغیرہ، اس کی سب سے بڑی دلیل وہ حدیث ہے جس میں آپؐ نے صحابہؓ سے فرمایا:

”تم میں سے کوئی اپنی بیوی سے ہمبستری کرتا ہے یہ بھی صدقہ ہے، صحابہ نے کہا: ایک شخص اپنی شہوت پوری کرتا ہے، کیا اس پر بھی وہ اجر وثواب کا مستحق ہے؟ حضورؐ نے فرمایا: تم غور کرو کہ اگر وہ اپنی خواہش کسی حرام ذریعہ سے پوری کرتا تو اس پر گناہ نہ ہوتا؟ انہوں نے کہا: جی ہاں! آپ نے فرمایا: اسی طرح جب وہ حلال ذریعہ سے اپنی خواہش پوری کررہاہے تو وہ ثواب کا مستحق ہے“(ابن حبان: 4167)

حقیقت میں یہ اللہ تعالیٰ کی اپنے بندوں پر بے انتہا رحمت کی بات ہے کہ وہ فطری خواہش کی تکمیل کو بھی عبادت بنا دیتا ہے، اور اس پر ثواب عطا فرماتا ہے؛ لیکن شرط یہ ہے کہ بیوی کے حقوق کی ادائیگی اور شرمگاہ کی حفاظت کی نیت کی جائے۔

اسلام کی ان تعلیمات سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلام میں عبادت صرف مخصوص اعمال سے مربوط نہیں بلکہ اس کا رشتہ پوری زندگی سے ہے، اسی لئے حضرت معاذ بن جبلؓ فرمایا کرتے تھے:

”وَأَرْجُوْ فِيْ نَوْمَتِيْ مَا أَرْجُوْ فِيْ قَوْمَتِيْ“

(جس طرح میں تہجد میں اجر وثواب کی امید رکھتاہوں سونے میں بھی اجر وثواب کی امید رکھتاہوں)۔

11.7.2 عبادت بندوں پر اللہ تعالیٰ کا حق

اسلام میں معبود صرف ایک ذات برحق کو قرار دیا گیا ہے، جو خالق ہے، اور تمام بندوں کی حیثیت عابد (عبادت کرنے والے) کی ہے، عبادت کے مختلف طریقے ہیں، کچھ وہ ہیں جن کے لئے عبادت کا لفظ استعمال ہوتا ہے، اور کچھ وہ ہیں جو نیت کی وجہ سے عبادت بن جاتے ہیں، اور عبادت اپنی تمام شکلوں کے ساتھ مخلوق پر خالق کا حق ہے اور عقلی طور پر بھی یہی بات قرین انصاف ہے کہ جس ذات نے اپنے بندوں کو وجود بخشا اور ان کو ہر طرح کی ظاہری وباطنی نعمتوں سے ہر وقت نواز رہا ہے صرف اسی کی عبادت کی جائے، یہ اس کا لازمی حق ہے، اس کا یہ حق کسی اور کو دینا یا اس کے کسی حصہ میں شریک کرنا ظلم ہے، اسلام سے پہلے لوگ طرح طرح کے شرک میں مبتلا تھے، اور مختلف قومیں اپنے اپنے خیالات کے مطابق جس چیز میں کوئی غیر معمولی بڑائی دیکھتی اس کے سامنے جھکنا شروع کر دیتی تھیں، اسلام نے واضح کیا کہ اللہ کے علاوہ کوئی عبادت کے لائق نہیں، اسی نے سب کو پیدا کیا ہے، اور وہی عبادت کے لائق ہے، اور ”لاالہ الا اللہ“ کو اسلام کا کلمہ قرار دیا، قرآن کریم اسلام کا دستور ہے، پورے قرآن کریم کا نچوڑ سورہ فاتحہ ہے، اور سورہ فاتحہ کا نچوڑ اس کی آیت ”اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ“ یعنی ہم آپ کے علاوہ نہ کسی چیز کی عبادت کرتے ہیں نہ کسی ذات کی، اور آپ کے علاوہ کسی سے مدد نہیں مانگتے، جب بھی کوئی شخص اسلام لاتا حضورؐ اس کو اولین ہدایت یہ دیتے کہ ایک اللہ کی عبادت کرو اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرو' قرآن نے یہ بھی واضح کیا ہے کہ یہی تمام انبیاء کی دعوت رہی ہے، ہر ایک نے اللہ کی عبادت کا حکم دیا اور طاغوت کی عبادت سے روکا۔

11.8 تعظیم

لغوی واصطلاحی معنی

لغت میں تعظیم کے معنی کسی کو بزرگ وبرتر سمجھنے اور ماننے کے ہیں، یہ عربی میں عَظَّمَ یُعَظِّمُ سے مصدر ہے، اور یہ مصدر (ع، ظ، م) کے مادہ سے ماخوذ ہے، اور اس مادہ سے بڑائی اور قوت کے الفاظ نکلتے ہیں، اسی سے لفظ "عظیم" بنا ہے جو اللہ تعالیٰ کی ایک صفت بھی ہے، بندہ اپنے رب کی تسبیح بیان کرتے ہوئے کہتا ہے: "سُبْحَانَ رَبِّيَ الْعَظِيْم" جب اللہ تعالیٰ کے لئے عظیم کی صفت استعمال کی جائے تو اس کے معنی ہوتے ہیں وہ ذات جو بہت بلند وبالا ہے اور عقل انسانی کی حدود سے برتر ہے، عقل انسانی اس کی حقیقت کو پورے طور پر سمجھنے کا تصور بھی نہیں کر سکتی، حضور ﷺ نے فرمایا: "رکوع میں رب کی عظمت بیان کرو" (نسائی:1120)، رب کی عظمت کی کوئی کیفیت یا حد نہیں بیان کی جاسکتی اور کسی شئے سے اس کی مثال بھی نہیں دی جاسکتی، وہ اسی طرح عظیم ہے جیسا کہ اس نے اپنے بارے میں بیان کیا ہے، اس کی کوئی کیفیت یا حد بندی نہیں کی جاسکتی، بڑوں کا احترام بھی ان کی تعظیم ہے، لیکن وہ تعظیم جس میں آخری درجہ تذلل ہو اور اس میں عبادت کا تصور بھی شامل ہو صرف اللہ کے ساتھ خاص ہے۔

اللہ تعالیٰ کی تعظیم کا مفہوم

تعظیم اللہ تعالیٰ کا بندوں پر حق ہے، اس کی تعظیم یہ ہے کہ صرف اسی کو خدائے واحد مانا جائے، اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ کیا جائے، اس کے اسمائے حسنی کے ساتھ اس پر ایمان لایا جائے، اس کو ہر قسم کے نقص اور عیب سے پاک سمجھا جائے، اس کے بارے میں کوئی کلمہ زبان سے ایسا نہ نکالا جائے جو اس کی شان عالی کے خلاف ہو، تعظیم میں شعائر اللہ کی تعظیم، حرمات اللہ کی تعظیم، رسول اللہ کی تعظیم، کتاب اللہ کی تعظیم اور اللہ کے اوامر ونواہی کی تعظیم سب داخل ہیں۔

1. شعائر اللہ کی تعظیم

شعائر شَعِیرۃٌ کی جمع ہے، جس کے معنی نشان وعلامت کے ہیں، یعنی وہ اعمال جن سے اللہ تعالیٰ کے دین، دین کے اَعلام اور کام جن سے اسلام کی پہچان ہو، اور یہ معلوم ہو کہ یہ وہ کام ہے جس کے ذریعہ اللہ کا تقرب حاصل کیا جاتا ہے، جیسے اذان، نماز، اور مسجد وغیرہ، مناسک حج یعنی حج سے متعلق مقامات واعمال وغیرہ بھی اس میں داخل ہیں، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: "بے شک صفا ومروہ اللہ کے شعائر (نشانیوں) میں سے ہیں" (البقرۃ:158)

ایک جگہ اللہ کے شعائر کی تعظیم کا ذکر کرتے ہوئے کہا گیا:

"ذٰلِكَ وَمَنْ يُّعَظِّمْ شَعَآئِرَ اللّٰهِ فَإِنَّهَا مِنْ تَقْوَى الْقُلُوْبِ" (الحج:32)

(یہ ہے اصل معاملہ اسے سمجھ لو اور جو اللہ کے مقرر کردہ شعائر کا احترام کرے تو یہ دلوں کے تقوی سے ہے)

اور ایک جگہ اس کی بے حرمتی سے منع کیا گیا:

(اے وہ لوگو! جو ایمان لا چکے ہو! اللہ کے شعائر کی بے حرمتی نہ کرو) (المائدۃ:2)

شعائر اللہ دو طرح کے ہیں:

(1) مناسک حج، جیسے احرام، طواف، سعی، عرفہ، مزدلفہ اور منیٰ کا قیام، قربانی کا جانور اور دیگر اعمال حج۔

(2) حج کے اعمال کے علاوہ شعائر مثلاً اذان، اقامت، نماز باجماعت، جمعہ، عیدین وغیرہ۔

بحیثیت مجموعی تمام مسلمانوں پر شعائر اللہ کا اہتمام کرنا اور ان کا اظہار کرنا واجب ہے، وہ شعائر فرائض میں سے ہوں۔

2. حرمات اللہ کی تعظیم

حرمات لفظ حرمۃ کی جمع ہے، یعنی ہر وہ چیز جس کے احترام کا حکم دیا گیا، اور اس کے کہنے یا کرنے سے روک دیا گیا ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

”وَمَنْ يُّعَظِّمْ حُرُمَاتِ اللّٰهِ فَهُوَ خَيْرٌ لَّهٗ عِنْدَ رَبِّهٖ“ (الحج:30)

(اور جو کوئی اللہ کی قائم کردہ حرمتوں کا احترام کرے تو یہ اس کے رب کے نزدیک خود اسی کے لیے بہتر ہے)

یہ آیت مناسک حج کے بیان میں آئی ہے اس لئے زیادہ تر علماء نے ان سے اولاً مناسک حج کو مراد لیا ہے، اس کے بعد دوسرے گناہوں کو، مثلاً مجاہد کا قول ہے، حرمات اللہ سے مراد مکہ، حج، عمرہ اور وہ تمام گناہ کے کام ہیں جن سے اللہ تعالیٰ نے منع فرمادیا ہے۔

تعظیم حرمات کے تین درجات ہیں:

1. اللہ کے اوامر ونواہی کی تعظیم، اور وہ اس طرح کہ کسی حکم میں غیر ضروری رخصت سے بھی اجتناب ہو اور کسی حکم میں غلو سے بھی بچا جائے۔
2. اللہ کے حکم کی تعظیم ہر حال میں ہو، وہ بات عقل میں آئے یا نہ آئے، اس کی مصلحت معلوم ہو یا نہ ہو، اس میں کوئی کجی نکالنا، اپنے ناقص علم کی بنیاد پر اس کی تردید کرنا، یا دنیا کے کسی عوض پر اس کو تبدیل کرنے پر راضی ہو جانا اس کی توہین ہے۔
3. اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی تعظیم اور وہ اس لئے کہ حکم اسی کا ہے، اور یہ یقین ہو کہ وہ اپنے اس حکم کو نافذ کرنے میں کسی کا محتاج نہیں، اور اس کے اس اختیار کو اس سے کوئی چھین نہیں سکتا، اور جب حاکم قابل تعظیم ہے تو اس کا حکم بھی قابل تعظیم ہو گا۔

3. کتاب اللہ کی تعظیم

قرآن مجید اللہ کا کلام ہے، اس نسبت سے اس کی تعظیم بھی ایمان کا جزو ہے، اور اس کی تعظیم گویا خود اللہ کی تعظیم ہے، امام نوویؒ فرماتے ہیں: ”قرآن مجید کی تعظیم، اس کو ہر نقص سے پاک سمجھنے اور اس کی حفاظت کے واجب ہونے پر تمام مسلمانوں کا اتفاق ہے“ قاضی عیاضؒ فرماتے ہیں: جس نے قرآن مجید یا اس مصحف کو جس میں قرآن لکھا ہوا ہے، یا اس کے کسی جزو کا بھی مذاق اڑایا یا اسے ہلکا سمجھا تو اس کے کافر ہونے پر تمام مسلمانوں کا اتفاق ہے۔

اس کی تعظیم کا حق یہ ہے کہ اس کی تلاوت کی جائے، اس کے مضامین کی تصدیق کی جائے، اس کے حروف اور حدود کی حفاظت کی جائے، اور اس کی بتائی ہوئی شاہراہ پر چلا جائے، اس کی تعظیم کا حق یہ بھی ہے کہ اس کو بغیر طہارت کے ہاتھ نہ لگایا جائے، حضورؐ نے حضرت عمرو بن حزم کو خط لکھ کر نصیحت کی اور اس میں یہ بھی لکھا کہ قرآن کو وہی ہاتھ لگائے جو طاہر ہو (موطا)۔ قرآن کی آیت ''**لا یمسه إلاَّ المطهرون**'' (الواقعۃ:79) (جسے مطہرین کے سوا کوئی چھو نہیں سکتا) سے بھی عطاءؒ، سالمؒ اور محمد باقرؒ وغیرہ نے یہ مفہوم نکالا ہے، اور زیادہ تر علماء نے اس آیت سے قرآن کے چھونے کے لئے وضو کے واجب ہونے پر استدلال نہیں کیا، بلکہ ''**مطهرون**'' سے مراد فرشتوں کو لیا ہے، لیکن احادیث صحیحہ کی بنیاد پر حضرت علیؓ، ابن مسعودؓ، سعد بن ابی وقاصؓ، سعید بن زیدؓ، عطاء، زہریؒ، نخعیؒ، ابو حنیفہؒ، مالکؒ، شافعیؒ، احمدؒ سب کا یہی مسلک ہے کہ قرآن کو ہاتھ لگانے کے لئے ظاہری نجاست سے ہاتھ کا پاک ہونا، باوضو ہونا، حالت جنابت میں نہ ہونا سب شرط ہے، اس کے خلاف کرنا گناہ ہے۔

4. رسول اللہ ﷺ کی تعظیم

اللہ تعالیٰ کی تعظیم اور اس پر ایمان لانے کا ایک تقاضہ یہ بھی ہے کہ اس کے بندہ اور رسول حضرت محمد اکی رسالت پر ایمان لایا جائے اور آپ کی تعظیم کی جائے، اللہ تعالیٰ نے آپ کی تعظیم کا حکم فرمایا ہے: ''وَتُعَزِّرُوْهُ وَتُوَقِّرُوْهُ'' (الفتح:9) (تاکہ اس کی مدد کرو اور اس کی تعظیم کرو) اسی تعظیم کا تقاضہ یہ ہے کہ حضور ا کو عام انسانوں کی طرح مخاطب کرنے سے منع فرمایا گیا:

''لَا تَجْعَلُوْا دُعَاءَ الرَّسُوْلِ بَيْنَكُمْ كَدُعَاءِ بَعْضِكُمْ بَعْضًا'' (النور:63)

(مسلمانو! اپنے درمیان رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کے بلانے کو آپس میں ایک دوسرے کا سا بلانا نہ سمجھ بیٹھو)

اللہ تعالیٰ نے خود اپنے نبی اور محبوب بندہ کو یہ عزت دی کہ ان کو قرآن میں کہیں ''یا محمد'' کہہ کر نہیں پکارا، جب کہ بہت سے انبیاء کو نام لے کر پکارا۔ آپ کا ذکر اسلام کے کلمۂ شہادت میں ہے، اذان اور نماز میں ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو بہت اونچے مقام سے نوازا، آپ کی تعظیم یہ بھی ہے کہ آپ پر درود و سلام بھیجا جائے، آپ کی احادیث کا احترام کیا جائے اور ان پر عمل کیا جائے، امام دارمیؒ نے اپنی ''السنن'' میں متعدد احادیث نقل کی ہیں جن میں یہ دکھایا ہے کہ جس نے حضورؐ سے ثابت شدہ احادیث کی تعظیم نہیں کی وہ مستحق سزا ہے، اور ان پر یہ عنوان قائم کیا ہے، ''**باب تعجيل عقوبة من بلغه عن النبی حديث فلم يعظمه ولم يوقره**'' (ایسے شخص کی سزا کا بیان جس کے پاس حضورؐ کی کوئی حدیث پہنچی تو اس نے اس کی تعظیم و تکریم نہیں کی) ہاں اس بات کا لحاظ ضروری ہے کہ جس طرح رسول اللہؐ کو عام انسانوں کی صف میں لا کھڑا کرنا آپ کی توہین ہے اور ایسا کرنے والا ایمان سے محروم ہو جاتا ہے، اسی طرح آپ کی تعظیم میں اس طرح غلو کرنا کہ آپ کو مقام الوہیت تک پہنچا دیا جائے یہ بھی ممنوع ہے۔

11.9 دعاء

لغوی و شرعی معنی

دُعَاء کا لفظ دَعَایَدْعُو کا مصدر ہے، اس کے مصدری معنٰی مانگنے اور پکارنے کے ہیں؛ لیکن یہ اسم مفعول کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے، یعنی وہ الفاظ جن کے ذریعہ اللہ سے مانگا جائے۔

جہاں تک اس کے شرعی معنی کا تعلق ہے، خطّابی فرماتے ہیں: دعاء کے معنی بندہ کا اپنے رب کی توجہ چاہنا، اور اس سے مدد طلب کرنا ہے، اور اس کی حقیقت اللہ کے سامنے عاجزی کا اظہار اور اس کے علاوہ ہر دوسری طاقت سے براءت کا اظہار کرنا ہے، امام شوکانی فرماتے ہیں: حقیقۃً اور شرعاً دونوں اعتبار سے دعاء کے معنی طلب اور سوال کے ہیں۔

11.9.1 دعاء کی اقسام

1. دعاءِ عبادت: وہ دعاء جس میں اللہ کی حمد وثناء بیان کی جائے، اور اس میں اللہ کی رحمت کی امید اور اس کے عذاب کا خوف بھی شامل ہو۔
2. دعاءِ سوال: ایسی دعاء جس میں دعاء مانگنے والا اپنے کسی فائدہ کا سوال کر رہا ہو، یا اپنی کسی مصیبت سے یا کسی نقصان دینے والی چیز سے پناہ مانگ رہا ہے۔
3. قرآن مجید میں کبھی لفظ دعاء پہلے معنی کے لئے استعمال ہوتا ہے، کبھی دوسرے معنی کے لئے، کبھی دونوں کے لئے، مثلاً ایک جگہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ”أُجِيبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ إِذَا دَعَانِ“ (البقرۃ:186) (پکارنے والا جب مجھے پکارتا ہے، میں اس کی پکار سنتا اور جواب دیتا ہوں) اس آیت میں دعاء کی دونوں قسمیں داخل ہیں، اور آیت کی تفسیر میں دونوں باتیں کہی گئی ہیں، میں اس کو دیتا ہوں جب وہ مجھ سے سوال کرتا ہے، اور میں اس کو ثواب عطا کرتا ہوں جب وہ میری عبادت کرتا ہے، ایک آیت میں فرمایا: ”فَادْعُوا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ“ (غافر:14) (پس اے رجوع کرنے والو) اللہ ہی کو پکارو اپنے دین کو اس کے لیے خالص کر کے)؛ لیکن اس کے بر خلاف: ”وَقِيْلَ ادْعُوْا شُرَكَاءَ كُمْ فَدَعَوْهُمْ فَلَمْ يَسْتَجِيْبُوْا لَهُمْ“ (القصص:64) (پھر ان سے کہا جائے گا کہ پکارو اب اپنے ٹھہرائے ہوئے شریکوں کو۔ یہ انہیں پکاریں گے مگر وہ ان کو کوئی جواب نہ دیں گے) میں سوال مراد ہے، اللہ تعالیٰ ان کو عار دلا رہا ہے کہ قیامت کے دن ان سے کہا جائے گا کہ اپنے شریکوں سے مانگو، وہ مانگیں گے لیکن وہ ان کی دعاء قبول نہیں کر سکیں گے، یہاں عبادت کے معنی میں نہیں ہے۔

دعاء کے آداب

دعاء کے متعدد آداب ہیں، جن میں چند یہ ہیں:

1. دعاء مانگنے والے کو چاہیے کہ مناسب اوقات کا انتخاب کرے جن میں دعاء کی قبولیت کا وعدہ ہو، مثلاً سال میں عرفہ کا دن، مہینوں میں رمضان، ہفتہ میں جمعہ کا دن، رات کی ساعت میں سحر کا وقت وغیرہ۔
2. مناسب احوال کا انتخاب کرے، مثلاً بارش کے وقت، اذان اور اقامت کے درمیان، افطار کے وقت، سجدہ میں، سفر میں، وغیرہ۔
3. قبلہ رخ ہو کر دعاء مانگے، ہاتھ سینے تک اٹھائے، اور ہاتھوں کو پہلوؤں سے الگ رکھے، آواز پست رکھے، دعاء میں تکلف اور ہم وزن

جملوں کے استعمال سے پرہیز کرے، چونکہ دعاء مانگنے والے کو عاجزی اختیار کرنا چاہیے، تکلف اس حالت میں مناسب نہیں۔

4. دعاء میں اخلاص ہو، خشوع ہو، گریہ وزاری ہو، خوف اور امید کے درمیان کی کیفیت ہو، دعاء یقین کے الفاظ کے ساتھ مانگے، شک کے الفاظ سے نہیں، اور قبولیت کا یقین رکھے۔
5. دعاء میں الحاح سے کام لے، ایک ایک دعاء کو تین بار مانگے تو زیادہ بہتر ہے، اور قبولیت میں جلدی نہ کرے۔
6. دعاء میں اللہ کا ذکر، اس کے بعد حضورؐ پر درود سے شروع کرے پھر سوال کرے، اخیر میں بھی حمد وثناء کا اہتمام کرے، اور آمین کہے۔
7. دعاء کے اخیر میں اپنے دونوں ہاتھ چہرہ پر پھیرلے۔
8. باطنی ادب یہ ہے کہ پہلے توبہ کرلے، دوسروں کے حقوق ادا کرلے، اللہ کی طرف پورے قلب کے ساتھ متوجہ ہو اور حلال کھانے کا اہتمام کرے، دعاء کے مقبول ہونے کی اصل بنیادیں یہی ہیں۔

دعاء کا حکم

امام نوویؒ فرماتے ہیں: فقہاء ومحدثین اور جمہور علماء کا راجح مسلک یہی ہے کہ دعاء کرنا مستحب ہے، بسا اوقات دعاء واجب ہو جاتی ہے، مثلاً نماز میں سورۃ فاتحہ کے اندر وارد ہونے والی دعاء، نماز جنازہ میں دعاء، بعض فقہاء کے نزدیک جمعہ کے خطبہ کی دعاء بھی واجب ہے۔

دعاء کے فضائل

دعاء کے فضائل قرآن وحدیث میں بے شمار مقامات پر بیان کئے گئے ہیں، جن میں سے چند یہ ہیں:

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

”وَإِذَا سَأَلَكَ عِبَادِيْ عَنِّيْ فَإِنِّيْ قَرِيْبٌ أُجِيْبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ إِذَا دَعَانِ فَلْيَسْتَجِيْبُوْا لِيْ وَلْيُؤْمِنُوْا بِيْ لَعَلَّهُمْ يَرْشُدُوْنَ “(البقرۃ:186)

(اور اے نبی صلی اللہ علیہ وسلم! میرے بندے اگر تم سے میرے متعلق پوچھیں، تو انہیں بتا دو کہ میں ان سے قریب ہی ہوں۔ پکارنے والا جب مجھے پکارتا ہے، میں اس کی پکار سنتا اور جواب دیتا ہوں؛ لہذا انہیں چاہیے کہ میری دعوت پر لبیک کہیں اور مجھ پر ایمان لائیں، یہ بات تم انہیں سنا دو شاید کہ وہ راہِ راست پالیں)

امام زرکشی سے منقول ہے: اس آیت میں قریب ہونے کے معنی یہ ہیں کہ جب بندہ دعاء میں اخلاص پیدا کرتا ہے، اور اللہ کی معرفت میں ڈوب جاتا ہے، تو یہ ناممکن ہے کہ اس کے اور اس کے رب کے درمیان کوئی واسطہ رہ جائے، اور یہی قریب ہونا ہے، دوسری جگہ فرمایا: ”اُدْعُوْا رَبَّكُمْ تَضَرُّعًا وَخُفْيَةً إِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِيْنَ “(الاعراف:55)

(اپنے رب کو پکارو گڑگڑاتے ہوئے اور چپکے چپکے، یقیناً وہ حد سے گزرنے والوں کو پسند نہیں کرتا)

ایک جگہ ارشاد ہوا: ”وَقَالَ رَبُّكُمُ ادْعُوْنِيْ أَسْتَجِبْ لَكُمْ إِنَّ الَّذِيْنَ يَسْتَكْبِرُوْنَ عَنْ عِبَادَتِيْ سَيَدْخُلُوْنَ جَهَنَّمَ دَاخِرِيْنَ“ (غافر:60)

(تمہارا رب کہتا ہے مجھے پکارو، میں تمہاری دعائیں قبول کروں گا، جو لوگ گھمنڈ میں آ کر میری عبادت سے منہ موڑتے ہیں، ضرور وہ ذلیل وخوار ہو کر جہنم میں داخل ہوں گے)

حضورؐ نے فرمایا: ”بیشک دعاء عبادت ہی کا نام ہے“، پھر آپ نے مذکورہ آیت ”وَقَالَ رَبُّكُمُ ادْعُوْنِيْ أَسْتَجِبْ لَكُمْ إِنَّ الَّذِيْنَ يَسْتَكْبِرُوْنَ عَنْ عِبَادَتِيْ سَيَدْخُلُوْنَ جَهَنَّمَ دَاخِرِيْنَ“ (غافر:60) تلاوت فرمائی (ابو داؤد: 1481) ایک حدیث میں آپؐ نے فرمایا: ”دعاء عبادت کا مغز ہے“ (ترمذی:3698) دعاء کی اہمیت اور اللہ کے فضل کو یہ حدیث اور اجاگر کرتی ہے:

”اللہ تعالیٰ حیاء دار اور کریم ہے، اس کو اس بات سے حیاء آتی ہے کہ ایک شخص اس کی طرف دونوں ہاتھ اٹھائے، اور وہ انہیں خالی اور ناکام واپس کر دے“ (ترمذی:3904)

ایک حدیث میں ہے: ”اللہ تعالیٰ کے نزدیک دعاء سے زیادہ قابل احترام کوئی چیز نہیں“ (ترمذی:3696)

اس کے علاوہ اور بھی دعاء کے بہت سے فضائل ہیں۔

11.9.2 دعاء کا تعلق عقیدہ سے

دعاء ایمان، توحید، اللہ تعالیٰ کی معرفت اور دل کی زندگی میں اضافہ کرتی ہے، اور انسانی فطرت کو توانائی بخشتی ہے، چونکہ انسان ہر وقت کسی نہ کسی چیز کا محتاج ہوتا ہے، اور یہ بھی جانتا ہے کہ قادر مطلق کی مدد کے بغیر وہ اسے حاصل نہیں کر سکتا، پھر اس کا یہ ایمان کہ اللہ تعالیٰ ہی اس کی حاجت سے واقف اور اس کی حاجت روائی پر قادر ہے اور میں خود ایک عاجز بندہ ہوں، بندہ کا یہ اعتراف عقیدہ کی بنیاد ہے، دعاء اللہ تعالیٰ اور اس کے اسماء وصفات پر ایمان کی دلیل ہے، حضور اکرمؐ نے جن دعاؤں کی تعلیم دی ہے ان میں اللہ تعالیٰ کے اسماء حسنیٰ کے ذریعہ اللہ سے مانگنے کا خاص اہتمام کیا ہے؛ تاکہ دعاء کے ذریعہ اللہ تعالیٰ پر ایمان کو غذا ملتی رہے، امام زرکشی فرماتے ہیں: دعاء عبادت کا مغز اس لئے ہے کہ دعاء توحید کی دلیل ہے، اللہ سے وہی مانگتا ہے جو اللہ کو ایک مانتا ہے، اور جانتا ہے کہ اس کے علاوہ کوئی دینے والا نہیں، وہ اپنے رب کے وجود، اس کے جاننے، سننے اور قدرت رکھنے جیسی دیگر صفات پر یقین رکھتا ہے، لہٰذا دعاء کرنے والے کو چاہیے کہ دعاء کے وقت اللہ تعالیٰ کی ان صفات کا استحضار رکھے۔

علامہ ابن قیمؒ فرماتے ہیں: دعاء مانگنے والے کی ضرورت جب پوری ہوتی ہے تو اس کے اس علم میں اور اضافہ ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کائنات کے ذرہ ذرہ سے واقف ہے، اور وہ ہر وقت اپنے بندوں کی پکار اور فریاد سن رہا ہے، وہ ان پر مہربان ہے، اور ہر وقت ضرورت پوری کرنے کی قدرت رکھتا ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

(کون ہے جو بے قرار کی دعا سنتا ہے جبکہ وہ اسے پکارے اور کون اس کی تکلیف رفع کرتا ہے؟ اور کون ہے جو تمہیں زمین کا خلیفہ

بناتا ہے؟ کیا اللہ کے ساتھ کوئی اور خدا بھی یہ کام کرنے والا ہے؟ تم لوگ کم ہی سوچتے ہو)(النمل:62)

یہ توحید ربوبیت پر دلیل ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے افعال میں اکیلا ہے، اس کا کوئی شریک نہیں، دعاء قبول کرنے کی قدرت بھی اس کے علاوہ کسی اور کو نہیں، اس سے معلوم ہوا کہ اللہ کے علاوہ کسی اور سے دعاء کرنا اللہ کی اس قدرت کو اس کی طرف پھیرنا ہے اور یہی شرک ہے؛ چنانچہ یہ معلوم ہوا کہ دعاء صرف اللہ کا حق ہے۔

11.10 اکتسابی نتائج

اس اکائی میں آپ نے درج ذیل نکات سیکھے:

- حقوق اللہ میں سب سے پہلے توحید ہے جس کا لغوی معنی اللہ کو ایک ماننا ہے۔ توحید کی تین اقسام بیان کی گئی ہیں:
- (1) توحید ربوبیت جس کا مفہوم یہ ہے کہ بندہ یہ ایمان رکھے کہ اللہ ہی خالق ورازق ہے، کائنات کا ہر ذرہ اسی نے پیدا کیا اور وہی ہر چیز کی نگہداشت فرمارہاہے۔
- (2) توحید الوہیت جس کا مفہوم یہ ہے کہ عبادت صرف ایک اللہ کی ہو، صرف وہی عبادت کے لائق ہے، تمام انبیاء کرام نے اللہ کو رب ماننے کے ساتھ ساتھ اس کی عبادت کی بھی دعوت دی، جس طرح ربوبیت میں اس کا کوئی شریک نہیں، عبادت میں بھی اس کا کوئی شریک نہیں۔
- (3) توحید اسماء وصفات میں، جس کا مفہوم یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ پر اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ا کے بتائے ہوئے تمام اسماء وصفات کے ساتھ ایمان لانا بھی توحید کا حصہ ہے۔
- شرک سے بچنا ضروری ہے۔ شرک کی بھی کئی اقسام بیان کی گئی ہیں، جن میں سب سے پہلے شرک جلی یا شرک اکبر کی یہ تعریف کی گئی ہے کہ کسی کو اللہ کی ذات میں شریک کرنا مثلا خدا کو کسی سے یا کسی کو خدا سے قرار دینا، کسی کو اس کی ذات برادری سمجھنا، کسی کو اس کا باپ یا بیٹا کہنا شرک اکبر ہے۔ پھر شرک سے متعلق بعض اہم مسائل آتے ہیں مثلا علم غیب، غیر اللہ کی قسم کھانا اور شرک کے بعض دیگر ذرائع مثلا جادو، جنات وشیاطین اور ارواح خبیثہ اور دوسری قسم کی قوتوں کی غیبی قدرت وغیرہ اور اس کے بعد شرک خفی یا شرک اصغر کے بارے میں حدیث کے حوالہ سے یہ بھی بتایا گیا ہے کہ یہ چھپا ہوا شرک ہے اور شرک کے بارے میں قرآن کا یہ فیصلہ ہے کہ یہ ظلم عظیم ہے اور اللہ تعالیٰ اس کو کبھی معاف نہیں فرمائے گا۔
- اس طرح عبادت کی تعریف کرتے ہوئے اس کی تین اقسام (1) قلبی اعمال (2) تعبدی اعمال (3) اور دیگر اعمال کی وضاحت کی گئی ہے، اسلام میں عبادت کا دائرہ بہت وسیع ہے، زندگی کے عام اعمال اور خالص دنیوی کام بھی نیت کی وجہ سے عبادت بن جاتے ہیں، عبادت اپنی تمام قسموں کے ساتھ صرف اللہ کا حق ہے۔

11.11 کلیدی الفاظ

معبود برحق : وہ ذات جو حقیقت میں عبادت کے لائق ہے

صفات قدسیہ : پاک صفات

متصف : کوئی صفت رکھنے والا

تنزیہہ : عیب سے پاک کرنا

تمثیل : تشبیہ دینا، مشابہ قرار کرنا

تکییف : کیفیت بیان کرنا

تصرف : استعمال کرنا، صرف کرنا

جوہر : وہ چیز جو بذات خود قائم ہو، لب لباب، خلاصہ

کاہن : جنوں سے دریافت کر کے غیب کی خبریں بتانے والا

استمداد : امداد چاہنا، طلب کرنا

مکلف : ایسا عاقل بالغ شخص جو اس لائق ہو کہ اس پر شریعت کے احکام جاری ہو سکیں

اوامر ونواہی : اللہ تعالیٰ نے جن چیزوں کا حکم فرمایا ہے وہ اوامر اور جن سے منع فرمایا ہے وہ نواہی کہلاتے ہیں۔

براءت : نجات، چھٹکارا

الحاح : گڑگڑانا

قادر مطلق : پوری پوری قدرت رکھنے والا، خدائے تعالیٰ

11.12 نمونہ امتحانی سوالات

11.12.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات

1. "عبادت صرف اللہ کی ہو" یہ کس بات کا مفہوم ہے؟

(a). توحید (b). شرک (c). شرک جلی (d). سب غلط

2. وہ حقوق جو صرف اللہ کے لیے خاص ہیں اس کو کیا کہتے ہیں؟

(a). حقوق اللہ (b). حقوق العباد (c). حقوق الناس (d). سب صحیح

3. شرک کا مفہوم بتائیں؟

(a). اللہ کے ساتھ کسی کو شریک کرنا (b). اللہ کو ایک ماننا (c). خدا کی کبریائی بتانا (d). سب غلط

4. تعظیم کے معنی کیا ہے؟

(a). بزرگ و برتر (b). کم تر (c). شاذ و نادر (d). حقیر

5. دعا کے معنی بتائیں؟

(a). مانگنا، پکارنا (b). انکار کرنا (c). منع کرنا (d). سب صحیح

11.12.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات

1. حقوق اللہ سے کیا مراد ہے؟ بیان کیجیے۔
2. اسمائے حسنی کی فضیلت پر روشنی ڈالیے۔
3. عبادت بندوں پر اللہ تعالیٰ کا حق ہے، اس موضوع پر دلائل کی روشنی میں لکھیے۔
4. دعاء کے آداب کیا ہیں؟ مختصر نوٹ لکھیے۔
5. دعاء کے فضائل کیا ہیں اور اس کا عقیدہ سے کیا تعلق ہے وضاحت کیجیے۔

11.12.3 طویل جوابات کے حامل سوالات

1. توحید کی اقسام پر ایک تفصیلی مضمون لکھیے۔
2. عبادت کی اقسام پر وضاحتی نوٹ لکھیے۔
3. حرمات اللہ اور کتاب اللہ کی تعظیم پر تفصیل سے روشنی ڈالیے۔

11.13 تجویز کردہ اکتسابی مواد

1. شرح العقیدۃ الطحاویۃ : علامہ ابن العز حنفیؒ
2. تقویۃ الایمان (اردو) : مولانا شاہ اسماعیل شہیدؒ
3. کتاب التوحید (عربی) : شیخ محمد بن عبد الوہاب
4. سیرۃ النبی جلد چہارم (اردو) : علامہ سید سلیمان ندویؒ
5. حقیقت شرک (اردو) : مولانا امین احسن اصلاحی

اکائی 12: حقوق العباد (انسانی، والدین اور اولاد کے حقوق)

اکائی کے اجزا:

12.0 تمہید
12.1 مقاصد
12.2 حقوق العباد
12.3 انسانی حقوق
  12.3.1 زندگی گذارنے کا حق
  12.3.2 شخصی آزادی کا حق
  12.3.3 اچھا برتاؤ کرنا
  12.3.4 رحم اور مالی تعاون
12.4 والدین اور اولاد کے حقوق
  12.4.1 والدین کا احترام اور ان سے محبت
  12.4.2 والدین کی اطاعت
  12.4.3 والدین کے ساتھ حسن سلوک اور ان کی خدمت
  12.4.4 ماں کی خصوصی رعایت کی تاکید
  12.4.5 والدین کے لئے دعاء کا اہتمام
  12.4.6 اولاد کے حقوق
  12.4.7 رضاعت اور حضانت
  12.4.8 شفقت و محبت اور مساویانہ سلوک
  12.4.9 اولاد کا نفقہ

12.4.10 تعلیم وتربیت
12.4.11 بچوں کے لئے دعائیں
12.4.12 بچیوں کی خصوصی رعایت
12.5 اکتسابی نتائج
12.6 نمونہ امتحانی سوالات
12.6.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات
12.6.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات
12.6.3 طویل جوابات کے حامل سوالات
12.7 تجویز کردہ اکتسابی مواد

12.0 تمہید

اسلام میں انسانی زندگی کو دوخانوں میں تقسیم کر دیا گیا ہے، ایک فرائض، دوسرے حقوق، ہر شخص کو اس کی ذمہ داریاں یاد دلائی گئی ہیں اور ان کو انجام دینے کی تاکید کی گئی ہے، ساتھ ہی دوسروں پر اس کے کچھ حقوق بھی رکھے گیے ہیں، اور اسلام نے ایک ہی شخص کو کئی حیثیتوں سے حقوق دیے ہیں کبھی اس کے انسان ہونے کی حیثیت سے تو کبھی اس کے مسلمان ہونے کی حیثیت سے، کبھی بیٹے اور باپ کی حیثیت اور کبھی دوسرے رشتے کی حیثیت سے۔ غرض کہ اسلام نے انسانوں کو متنوع حقوق دیے ہیں، اور جن لوگوں کے ذمہ یہ حقوق رکھے ہیں ان کو ان کی آدائیگی کی پر زور تاکید کی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ معاشرہ کے ہر فرد جب اپنے فرائض کی ادائیگی میں سچا اور امانت دار ہوتا ہے تو دوسری جانب حقوق بھی ادا ہوتے جاتے ہیں۔ اور اس طرح معاشرہ میں صحیح توازن قائم ہوتا ہے اسلام میں حقوق کا دائرہ بہت وسیع ہے۔

12.1 مقاصد

اس اکائی کا مقصد یہ ہے کہ آپ اس بات سے واقف ہو سکیں کہ حقوق العباد کیا ہے؟ اسلام میں حقوق العباد کی کیا اہمیت ہے۔ اس کے ساتھ ہی انسانی حقوق کے بارے میں آگاہی حاصل ہو سکے۔ اس اکائی میں آپ یہ بھی جانیں گے کہ اولاد اور والدین کے حقوق، والدین کا احترام اور ان سے محبت، والدین کی اطاعت، ماں کی خصوصی رعایت کی تاکید، اولاد کے حقوق کیا ہیں۔

12.2 حقوق العباد

حقوق العباد سے مراد وہ حقوق ہیں جو ایک انسان پر اور بالخصوص ایک مسلمان پر اللہ کے بندوں اور اس کی دوسری مخلوقات کے لئے واجب ہیں، دنیا میں انسان ہر چیز سے فائدہ اٹھاتا ہے، اس کا لازمی تقاضا یہ ہے کہ وہ اس کا حق بھی ادا کرے، اس طرح اسے اپنے جیسے انسانوں، مسلمانوں اور پھر ان میں بھی والدین، اولاد، قریبی رشتہ داروں، پڑوسیوں اور خادموں کے حقوق ادا کرنا ضروری ہے۔ شوہر پر بیوی کے اور بیوی کے شوہر پر بھی کچھ حقوق ہیں، حقوق کا یہ دائرہ جانوروں تک پھیلا ہوا ہے، چونکہ انسان ان سے بھی فائدہ اٹھاتا ہے، غور کیا جائے تو اس کے ذمہ جمادات اور نباتات کے بھی کچھ حقوق ہیں کہ ان کو بے موقع صرف نہ کرے، انہیں حقوق کے مجموعہ کا نام حقوق العباد ہے، اسلام میں حقوق العباد کی اہمیت کو سمجھنے کے لئے اتنا کافی ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے حق کو توبہ کرنے سے معاف فرما دیتا ہے؛ لیکن بندوں کا حق خود ان بندوں کی معافی کے بغیر معاف نہیں فرماتا۔

12.3 انسانی حقوق

اسلام نے انسان کو عزت واحترام سے نوازا ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ”وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيْٓ اٰدَمَ “(بنی اسرائیل:70)(یہ تو ہماری عنایت ہے کہ ہم نے بنی آدم کو بزرگی دی) اور اس کو متعدد حقوق دیئے ہیں، جن میں سے چند حقوق یہ ہیں:

12.3.1 زندگی گذارنے کا حق

اسلام نے ایک انسان کے لئے جن حقوق کی ضمانت لی ہے ان میں سے سب سے پہلا حق زندگی گذارنے کا حق ہے، اس حق سے دوسرے حقوق شروع ہوتے ہیں، دوسرے حقوق انسان کو اسی وقت مل سکتے ہیں جب اسے سب سے پہلے یہ حق دے دیا جائے، اس حق کی حفاظت افراد، معاشرہ اور حکومت ہر ایک کے لئے لازم قرار دی گئی، اسی لئے ناحق کسی انسان کو قتل کرنے سے شریعت نے منع کر دیا، فرمایا گیا:

”وَلاَ تَقْتُلُوا النَّفْسَ الَّتِيْ حَرَّمَ اللّٰهُ إِلاَّ بِالْحَقِّ “(الأنعام:152)

(اور کسی جان کو جسے اللہ نے محترم ٹھہرایا ہے ہلاک نہ کرو مگر حق کے ساتھ)

اور اسی لئے اگر کوئی ناحق کسی کو قتل کر دے تو اس سے قصاص لینے کا حکم ہے(البقرۃ:178) چونکہ قاتل سے قصاص لینا کئی دیگر جانوں کو ہلاکت سے بچانا ہے، قرآن مجید نے اپنے حکیمانہ اسلوب میں اس طرف اشارہ کیا ہے:

”وَلَكُمْ فِيْ الْقِصَاصِ حَيَاةٌ يَاْ أُولِيْ الأَلْبَابِ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ“(البقرۃ:179)

(عقل وخرد رکھنے والو! تمہارے لیے قصاص میں زندگی ہے، امید ہے کہ تم اس قانون کی خلاف ورزی سے پرہیز کرو گے)

اسی غرض سے خودکشی کو حرام قرار دیا گیا، اسی انسانی جان کے احترام کے پیش نظر جنین کشی سے منع کیا گیا اور بچہ کی پیدائش کے

بعد بھی اسے قتل کرنے سے روکا گیا۔

12.3.2 شخصی آزادی کا حق

اسلام نے شخصی آزادی کو تسلیم کیا ہے، آزادی سے مراد یہ ہے کہ انسان کو عقل وارادہ کی قوت سے نوازا گیا ہے، وہ اپنی پسند وناپسند میں آزاد ہے، اس پر کسی خارجی دباؤ کو درست قرار نہیں دیا گیا، حتی کہ مذہب کے انتخاب میں بھی اس پر جبر واکراہ نہیں، وہ اپنی ملکیت میں تصرف کرنے کا بھرپور حق رکھتا ہے، البتہ ساتھ ساتھ خالق کے ساتھ وفاداری اور اس کے حدود کی پابندی کا حکم دے کر اس کی آزادی کے سامنے ایک ضروری حد قائم کی گئی ہے، یہ قانون اس کی آزادی کے حق کو منظم کرتا ہے اور انسانی معاشرہ کو سرکشی اور بغاوت سے بچاتا ہے۔ اسلام کی آمد سے قبل انسانی غلامی کے جو طریقے مختلف ملکوں میں رائج تھے ان کا تصور بھی ایک شریف شہری کے لئے ممکن نہیں، اسلام نے اس غلامی کے نظام کو کئی مرحلوں میں ختم کیا، پہلے غلاموں کے ساتھ حسن سلوک کی تعلیم دی، ان کو ان کے آقاؤں کا بھائی قرار دیا، پھر ان کے آزاد کرنے کو فضیلت کا کام بتایا، اس اسلامی تعلیم نے سینکڑوں غلاموں کو آزادی دلائی، کئی گناہوں کے کفارہ میں غلاموں کی آزادی کو بھی کفارہ کی ادائیگی کا ذریعہ بنادیا گیا، اس میں بڑی تعداد میں غلام آزاد ہوئے۔

12.3.3 اچھا برتاؤ کرنا

ایک مسلمان کے لئے ضروری ہے کہ وہ ہر انسان سے خواہ وہ بڑا یا چھوٹا، امیر ہو یا غریب، مسلمان ہو یا غیر مسلم یا اس کی کوئی اور حیثیت ہو اس سے اچھی طرح پیش آئے، اچھی بات اچھے انداز میں کہے، اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

"وَقُوْلُوْا لِلنَّاسِ حُسْنًا"(البقرۃ:83)(اور لوگوں سے اچھی بات کہو)۔

حضورؐ نے حضرت ابوذرؓ سے فرمایا کہ:

"جہاں بھی ہو اللہ سے ڈرتے رہو، برائی کے پیچھے بھلائی کرو تو وہ بھلائی برائی کو مٹادے گی، اور لوگوں کے ساتھ حسن اخلاق سے پیش آؤ"(ترمذی، باب ماجاء في معاشرۃ الناس، حدیث نمبر:1987)

ایک مسلمان کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ وہ ہر ایک کے ساتھ انصاف کا معاملہ رکھے، خواہ اس کا تعلق کسی قبیلہ، خاندان، نسل ونسب اور کسی بھی دین ومذہب سے ہو، قرآن مجید میں فرمایا گیا:

"وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰٓى اَلَّا تَعْدِلُوْا اِعْدِلُوْا هُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى"(المائدۃ:8)

(اور کسی قوم کی دشمنی تم کو اس پر آمادہ نہ کرے کہ تم انصاف نہ کرو، عدل کرو، یہ بات تقوی کے قریب ہے)۔

12.3.4 رحم اور مالی تعاون

اسلام کا پیغام لے کر حضرت محمدؐ کو دنیا میں بھیجا گیا، وہ صرف مسلمانوں کے نبی نہیں ہیں، پوری انسانیت کے نبی ہیں، ان کو سارے جہان کے حق میں رحمت بنا کر بھیجا گیا، رحمۃ للعالمینؐ نے خود اللہ کی مخلوق کے ساتھ رحم وکرم کا معاملہ فرمایا اور یہی تعلیم بھی دی، آپؐ نے

فرمایا:

”تم زمین والوں پر رحم کرو تو آسمان والا تم پر رحم فرمائے گا“ (ترمذی، باب ماجاء في رحمة المسلمين، حدیث نمبر: 1924)۔

اسلام میں زکوۃ کے علاوہ دوسرے عام صدقے غیر مسلموں کو دیئے جاسکتے ہیں، حضورؐ نے ایک یہودی خاندان کو صدقہ دیا، حضرت صفیہؓ نے اپنے دو یہودی رشتہ داروں کو 30 ہزار کی مالیت کا صدقہ دیا، قرآن مجید میں قیدیوں کو کھانا کھلانے والوں کی تعریف کی گئی ہے، اور ظاہر ہے کہ صحابہ ث کے قبضہ میں غیر مسلم ہی قید ہو کر آتے تھے، حضورؐ کے زمانہ میں حضرت عمرؓ نے اپنے مشرک بھائی کو تحفہ بھیجا ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ضرورت مند کی مدد کرنا انسانی فریضہ ہے، اور یہ مدد صرف مسلمانوں کے ساتھ خاص نہیں؛ بلکہ تمام انسانی برادری اپنی ضرورت کے وقت اس مدد کی مستحق ہے۔

حضور اکرمؐ نے فرمایا:

”تم میں سے کوئی اس وقت تک پورا مسلمان نہیں ہوگا جب تک وہ اور لوگوں کے لئے وہی پسند نہ کرے جو اپنے لئے پسند کرتا ہے اور جب تک وہ کسی آدمی سے صرف خدا کے لئے محبت نہ کرے“ (مسند أحمد: مسند أنس ص، حدیث نمبر: 13675)

یہ حدیث بھی عام ہے، اس میں ”الناس“ (لوگ) کا لفظ استعمال کیا گیا ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک مسلمان کو چاہئے کہ خیر خواہی کے جذبات پوری انسانی برادری کے لئے رکھے اور جو خود اپنے لئے پسند کرتا ہے وہی ان کے لئے بھی پسند کرے۔

12.4 والدین اور اولاد کے حقوق

والدین کی عزت، خدمت اور اطاعت اسلام میں ضروری قرار دی گئی ہے، توریت و انجیل کی تعلیمات میں بھی والدین کے ساتھ احترام کی تاکید کی گئی ہے، قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ کے بعد والدین کا درجہ انسانی رشتوں میں سب سے اہم قرار دیا گیا ہے، اور اللہ تعالیٰ کی عبادت کے ساتھ ساتھ ان کے ساتھ حسن سلوک کی تاکید کی گئی ہے۔

12.4.1 والدین کا احترام اور ان سے محبت

قرآن وحدیث میں والدین کی تعظیم کی خصوصی تعلیم دی گئی ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ”اور تیرے رب نے یہ فیصلہ کر دیا ہے کہ تم اس کے سوا کسی کی عبادت نہ کرنا اور ماں باپ کے ساتھ بھلائی کرنا، اگر ان میں سے ایک یا دونوں تمہارے سامنے بڑھاپے کو پہنچ جائیں تو ان کو اف تک نہ کہو اور نہ ان کو جھڑکو اور ان سے ادب سے بولو اور ان کے لئے اطاعت کا بازو محبت سے جھکاؤ اور کہو کہ اے میرے پروردگار! تو ان پر رحم فرما جس طرح انہوں نے بچپن میں مجھے پالا“ (بنی اسرائیل: 24)۔

حضورؐ نے فرمایا کہ ”ماں کے قدموں کے نیچے جنت ہے“ (مستدرک حاکم: کتاب الجهاد، حدیث نمبر: 2502)، آپؐ نے فرمایا: ”رب کی خوشنودی باپ کی خوشنودی میں ہے“ (ترمذی، باب ماجاء من الفضل في رضا الوالد، حدیث نمبر: 1899)، ایک مرتبہ آپؐ نے والدین کی عزت وعظمت کو ایک نہایت موثر واقعہ کی صورت میں بیان فرما کر اس کا صلہ بھی ذکر فرمایا؛ تاکہ اپنی امت کو تعلیم دیں کہ والدین

کا احترام کتنا اہم ہے اور کن مصیبتوں سے نجات کا راستہ ہموار کرتا ہے، آپؐ نے فرمایا:

”بنی اسرائیل میں یہ واقعہ پیش آیا کہ تین مسافر راستہ میں چل رہے تھے کہ تیز بارش ہونے لگی، تینوں نے ایک غار میں پناہ لی، اچانک ایک چٹان اوپر سے اس طرح گری کہ اس نے غار کا منہ بند کر دیا، انہوں نے اس بے قراری کے عالم میں پورے خشوع وخضوع کے ساتھ اللہ کے سامنے دعاء کے لئے ہاتھ اٹھائے، ہر ایک نے کہا: اس وقت ہم میں سے ہر ایک کو اپنی خالص نیکی کا واسطہ خدا کو دینا چاہئے، ایک نے کہا: اے للہ! تو جانتا ہے کہ میرے والدین بوڑھے تھے اور میرے چھوٹے چھوٹے بچے تھے، میں بکریاں چراتا تھا اور انہیں پر دار و مدار تھا، شام کو جب بکریاں لے کر گھر آتا تھا، تو دودھ دوہ کر پہلے اپنے والدین کی خدمت میں لاتا تھا، جب وہ پی چکتے تب اپنے بچوں کو پلاتا تھا، ایک دن کا واقعہ ہے کہ میں بکریاں چرانے کے لئے دور نکل گیا، میں دودھ لے کر ان کے سرہانے کھڑا ہوا، نہ ان کو جگاتا تھا کہ ان کی راحت میں خلل آجاتا اور نہ ہٹتا تھا کہ خدا جانے کس وقت ان کی آنکھیں کھلیں اور وہ دودھ مانگیں، بچے بھوک سے بلک رہے تھے؛ مگر مجھے گوارا نہ تھا کہ میرے والدین سے پہلے میرے بچے سیر ہوں، میں اس طرح پیالہ میں دودھ لئے رات بھر سرہانے کھڑا رہا، اور وہ آرام کرتے رہے، اے اللہ! اگر تجھے معلوم ہے کہ یہ کام میں نے تیری خوشنودی کے لئے کیا تو اس غار کے منہ سے چٹان کو ہٹا دے، یہ کہنا-تھا کہ چٹان خود بخود غار کے منہ سے تھوڑا سرک گئی، اس کے بعد باقی دو مسافروں کی باری آئی اور انہوں نے بھی اپنے نیک کاموں کو وسیلہ بنا کر دعاء کی اور غار کا منہ کھل گیا“(مسلم، باب قصۃ أصحاب الغار الثلاثۃ والتوسل بصالح الأعمال، حدیث نمبر: 2743)۔

یہ حدیث ایک طرف والدین کی خدمت کی فضیلت کو اجاگر کر رہی ہے تو دوسری طرف والدین کے احترام اور ان کی عظمت کا لحاظ رکھنے کی بھی تعلیم دے رہی ہے، اس شخص کا رات بھر پیالہ ہاتھ میں لے کر کھڑا رہنا، صرف اس خیال سے کہ ان کو جگانا ان کے آرام میں خلل کا باعث ہوگا اور سرہانے سے ہٹنا بر وقت ان کی خدمت میں رکاوٹ بنے گا، والدین کے احترام کی اعلی مثال پیش کر رہی ہے۔

12.4.2 والدین کی اطاعت

اولاد کے اوپر والدین کا دوسرا حق یہ ہے کہ ان کی اطاعت کریں اور ان کے حکموں کو مانیں، والدین کی اطاعت کے لئے عام طور سے احادیث میں ”بِرّ“ کا لفظ اور نافرمانی کے لئے ”عقوق“ کا لفظ استعمال ہوا ہے۔

اسلام میں والدین کی نافرمانی حرام قرار دی گئی ہے، حضورؐ نے فرمایا: ”اللہ تعالی نے بلاشبہ تم پر ماؤں کی نافرمانی حرام کر دی ہے“ (بخاری: 3677) اللہ تعالیٰ کی شریعت میں شرک سے بری کوئی چیز نہیں؛ لیکن ماں باپ اگر مشرک بھی ہوں تو ان کے ساتھ حسن سلوک کی تاکید کی گئی ہے، صرف شرک کرنے پر مجبور کریں تو ان کی بات ماننے سے منع کیا گیا ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے

”اور ہم نے انسان کو جتا دیا کہ ماں باپ کے ساتھ نیکی کر، اور اگر وہ تجھ کو مجبور کریں کہ خدا کے ساتھ اس کو شریک کر جس کا تجھ کو علم نہیں تو ان کا کہا نہ مان، تم سب کو میرے پاس لوٹ کر آنا ہے، تو میں تم کو تمہارے کرتوت سے آگاہ کروں گا“(العنکبوت: 8)

ایک دوسری جگہ فرمایا گیا:

”اگر وہ دونوں اس پر تجھ کو مجبور کریں کہ میرے ساتھ اس کو شریک کر جس کو تو نہیں جانتا تو ان کا یہ کہنا نہ مان اور دنیا میں ان کے ساتھ بھلائی کے ساتھ گذر کر“ (لقمان:15)

ان دونوں آیتوں میں والدین کے ادب، اور ان کی اطاعت اور ان کے ساتھ حسن سلوک کی تعلیم دی گئی ہے۔

حضرت ابو سعید خدریؓ کا بیان ہے کہ یمن کا ایک آدمی حضورؐ کی خدمت میں حاضر ہوا، حضورؐ نے اس سے پوچھا:

”یمن میں تمہارا کوئی ہے؟ اس نے کہا: جی ہاں میرے باپ ہیں، آپؐ نے پوچھا: انہوں نے تمہیں اجازت دے دی ہے؟ اس نے کہا: نہیں، تو آپؐ نے فرمایا: اچھا تو تم واپس جاؤ اور ماں باپ سے اجازت لو، اگر وہ اجازت دے دیں تو جہاد میں شرکت کرو، ورنہ ان کے ساتھ حسن سلوک کرتے رہو“ (ابوداؤد، باب في الرجل يغزو، حدیث نمبر:2530)۔

12.4.3 والدین کے ساتھ حسن سلوک اور ان کی خدمت

قرآن مجید میں تقریباً 12 آیتوں میں والدین کے ساتھ حسن سلوک کی تعلیم دی گئی ہے، سورہ بقرہ میں توریت کے حکم کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا گیا:

”یاد کرو، اسرائیل کی اولاد سے ہم نے پختہ عہد لیا تھا کہ اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہ کرنا، ماں باپ کے ساتھ نیک سلوک کرنا“ (البقرۃ:83)

نزولِ قرآن کے زمانہ میں بہت سے لوگوں نے اپنے رسم ورواج اور وہم وخیال کی بنیاد پر بہت سی چیزیں اپنے طور پر حلال یا حرام کرلی تھیں، اللہ تعالیٰ نے ان کو خطاب کرکے فرمایا کہ یہ کھانے پینے کی چیزیں حرام نہیں، آؤ ہم بتائیں کہ حقیقت میں حرام چیزیں کیا ہیں؟ خدا کے ساتھ شرک کرنا اور ماں باپ کے ساتھ نیکی سے پیش نہ آنا، ارشاد ہے:

”اے پیغمبر! آؤ میں تمہیں پڑھ کر سناؤں کہ تمہارے پروردگار نے تم پر کیا حرام کیا ہے، یہ کہ اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ بناؤ اور ماں باپ کے ساتھ نیکی کرنا“ (الأنعام:151)

یعنی نیکی نہ کرنا بھی حرام ہے۔

ایک مرتبہ حضورؐ مجلس میں تشریف فرما تھے، صحابہ کرام حاضر تھے، فرمایا:

”وہ ذلیل ہو، وہ ذلیل ہو، وہ ذلیل ہو، صحابہ ث نے پوچھا: کون یا رسول اللہ! ارشاد ہوا: وہ جس نے اپنے ماں باپ کو یا ان میں سے کسی ایک کو بڑھاپے کی حالت میں پایا اور پھر (ان کی خدمت کرکے) جنت نہ حاصل کرلی“ (مسلم، باب رغم أنف من أدرک أبویہ۔۔۔، حدیث نمبر:2551)

ایک اور مجلس میں صحابہ نے دریافت کیا کہ تمام کاموں میں اللہ تعالیٰ کو ہمارا کون سا کام زیادہ پسند آتا ہے؟ فرمایا:

”وقت پر نماز پڑھنا“ عرض کیا: پھر کون؟ فرمایا: ”ماں باپ کے ساتھ نیکی کرنا“، دریافت کیا، پھر کون؟ فرمایا: ”خدا کی راہ میں جہاد

کرنا"(بخاری، باب فضل الجہاد، حدیث نمبر:2782)

والدین کی مالی خدمت اور تعاون کی بھی قرآن مجید میں تاکید کی گئی ہے، فرمایا گیا:"فائدہ کی جو چیز تم خرچ کرو، وہ ماں باپ اور رشتہ داروں (وغیرہ) کے لئے ہے"(البقرۃ:215) یہاں سب سے پہلے والدین کا ذکر کیا گیا۔

والدین اگر ضرورت مند ہوں تو اولاد پر اپنی بیوی اور بچوں کے بعد ان کا نفقہ اٹھانا لازم ہے، ماں باپ کو یہ بھی حق ہے کہ اولاد کی اجازت کے بغیر ان کے مال میں سے خرچ کریں، شرط یہ ہے کہ اسراف نہ کریں، امام ابوحنیفہؒ، امام مالکؒ اور امام شافعیؒ کے نزدیک ضرورت کے بقدر لینا جائز ہے، امام احمدؒ کے نزدیک اولاد کے مال میں ضرورت کے بغیر بھی لینا جائز ہے۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ آپؐ نے فرمایا:"سب سے پاکیزہ کھانا وہ ہے جو آدمی کی اپنی کمائی کا ہو اور تمہاری اولاد بھی تمہاری کمائی ہے"(ابوداؤد، باب الرجل یأکل من مال ولدہ، حدیث نمبر:3530)۔

12.4.4 ماں کی خصوصی رعایت کی تاکید

شریعت میں ماں باپ دونوں کی خدمت واطاعت کا حکم دیا گیا؛ لیکن چونکہ ماں فطری طور پر زیادہ کمزور اور حساس ہوتی ہے، پھر اس کے احسانات اور قربانیاں بھی باپ کے مقابلے میں کہیں زیادہ ہیں؛ اس لئے شریعت میں ماں کا حق زیادہ بتایا گیا اور ماں کے ساتھ حسن سلوک کی خصوصی ترغیب دی گئی، قرآن مجید میں ارشاد ہے:

"اور ہم نے انسان کو ماں باپ کے ساتھ حسن سلوک کرنے کی تاکید کی، اس کی ماں تکلیف اٹھا اٹھا کر اس کو پیٹ میں لئے پھری اور تکلیف ہی سے جنا"(الأحقاف:15)

حضورؐ سے ایک شخص نے پوچھا: یارسول اللہ! میرے نیک سلوک کا سب سے زیادہ مستحق کون ہے؟ آپؐ نے فرمایا:"تیری ماں"، اس نے پوچھا: پھر کون؟ آپؐ نے فرمایا:"تیری ماں"، اس نے پوچھا: پھر کون؟ ارشاد فرمایا:"تیری ماں"، اس نے کہا: پھر کون؟ تو آپ نے فرمایا:"تیرا باپ"(الأدب المفرد: باب برالأمر، حدیث نمبر:۳)

اسلام نے رضاعی ماں کے ساتھ بھی حسن سلوک کا سبق سکھایا، حضرت ابوالفضل کہتے ہیں: میں نے جعرانہ کے مقام پر حضورؐ کو دیکھا کہ آپ گوشت تقسیم فرما رہے ہیں، اتنے میں ایک عورت آئیں اور آپ کے بالکل قریب پہنچ گئیں، آپ نے ان کے لئے اپنی چادر بچھادی، وہ اس پر بیٹھ گئی، میں نے لوگوں سے پوچھا: یہ کون صاحبہ ہیں؟ لوگوں نے بتایا یہ حضورؐ کی وہ ماں ہیں جنہوں نے آپ کو دودھ پلایا تھا۔ (ابوداؤد: باب فی بر الوالدین، حدیث نمبر:5744)۔

12.4.5 والدین کے لئے دعاء کا اہتمام

اولاد پر ماں باپ کا ایک حق یہ بھی ہے کہ ان کی زندگی میں بھی اور ان کی وفات کے بعد بھی ان کے لئے خصوصی دعاؤں کا اہتمام کریں، قرآن نے والدین کے ساتھ حسن سلوک کی تعلیم کے بعد یہ دعاء سکھائی ہے:

”وَقُلْ رَبِّ ارْحَمْهُمَا كَمَا رَبَّيَانِيْ صَغِيْرًا “(بنی اِسرائیل:24)

(اور کہو کہ اے میرے پروردگار توان پر رحم فرما جس طرح انہوں نے بچپن میں مجھے پالا)

حضورؐ نے فرمایا:

”جب کوئی آدمی مر جاتا ہے تو اس کے عمل کی مہلت ختم ہو جاتی ہے، صرف تین چیزیں ایسی ہیں جو مرنے کے بعد بھی فائدہ پہنچاتی رہتی ہیں، ایک صدقہ جاریہ، دوسرے علم جس سے فائدہ اٹھایا جائے، تیسرے وہ صالح اولاد جو اس کے لئے دعاء مغفرت کرتی رہے“(ابو داؤد: باب ماجاء فی الصدقة عن المیت، حدیث نمبر:2880)۔

ان کے علاوہ بھی بہت سے حقوق ہوسکتے ہیں مثلاً ان کی وفات کے بعد باپ کے دوستوں اور ماں کی سہیلیوں کے ساتھ بھی حسن سلوک کرتے رہنا وغیرہ۔

12.4.6 اولاد کے حقوق

اسلام نے جس طرح والدین کے حقوق اولاد پر رکھے ہیں، اولاد کے حقوق بھی والدین کے ذمہ رکھے ہیں، اسلام نے ماں باپ پر یہ ضروری قرار دیا ہے کہ وہ اپنے بچوں کے دنیا میں آنے سے پہلے سے ہی ان کی جانوں کا تحفظ کریں، اسی لئے اسلام نے جان بوجھ کر حمل کو ساقط کرنے سے منع کر دیا، لوگ افلاس کے خوف سے اولاد کو قتل کیا کرتے تھے، رب کریم نے اس سے منع کرتے ہوئے فرمایا:

”اپنی اولاد کو فقر وفاقہ کے خوف سے مار نہ ڈالو، ہم ہی ہیں جو ان کو اور تم کو دونوں کو روزی دیتے ہیں، ان کا مارڈالنا بلاشبہ بڑا گناہ ہے “(بنی اسرائیل:31)۔

ایک مرتبہ ایک صحابی نے حضورؐ اکرم سے دریافت کیا: یارسول اللہ! سب سے بڑا گناہ کیا ہے؟ فرمایا: ”شرک“، پوچھا: اس کے بعد؟ فرمایا: ”والدین کی نافرمانی“، پھر پوچھا: اس کے بعد؟ فرمایا: ”تم اپنی اولاد کو اس ڈر سے مارڈالو کہ وہ تمہارے ساتھ کھائے گی“(بخاری، باب ما قیل فی شہادة الزور، حدیث نمبر: 2653)؛ چنانچہ والدین پر اپنی اولاد کا سب سے پہلا حق یہ ہے کہ پیدا ہونے سے پہلے اور پیدا ہونے کے بعد کسی ذریعہ سے بھی ان کو ضائع نہ کریں۔

12.4.7 رضاعت اور حضانت

بچہ کی پیدائش کے بعد اس کی خوراک کا انتظام کرنا باپ کے ذمہ ہے، اور شیر خوارگی کے زمانہ میں دودھ ہی بچہ کی خوراک ہے، اس لئے ماں کی ذمہ داری ہے کہ اس کو دودھ پلائے اور اگر ماں کسی وجہ سے اپنے شوہر کے نکاح سے علاحدہ ہو چکی ہو تو باپ کی ذمہ داری ہے کہ رضاعت (دودھ پلانے) کی ذمہ داری ادا کرے؛ چنانچہ دودھ پلانے والی کی اجرت باپ برواجب کی گئی ہے، قرآن مجید میں فرمایا گیا:

”اور مائیں اپنے بچوں کو پورے دوبرس دودھ پلائیں، یہ مدت اس کے لئے جو چاہے کہ رضاعت کی مدت پوری کرے اور لڑکے والے (باپ) پر ان کی دودھ پلانے والی ماؤں کا کھانا اور کپڑا دستور کے مطابق واجب ہے“(البقرة:233)

بچے کی پرورش کرنے کو عربی میں حضانت کہتے ہیں، حضانت ماں باپ دونوں کا مشترکہ حق ہے، رضاعت بھی اصلاً حضانت ہی کا ایک حصہ ہے، فقہ کی اصطلاح میں حضانت کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ نابالغ لڑکے یا نابالغ لڑکی، یا کم عقل بالغ لڑکے اور لڑکی جن میں تمیز کی صلاحیت نہ ہو ان کی زندگی کے تقاضوں کی تکمیل کی جائے' اور یہ اس وقت تک جب تک کہ وہ خود سے اپنے کام انجام دینے کے لائق ہو جائیں۔

ماں کو لڑکوں کا حق پرورش اس وقت تک حاصل ہو گا جب تک خود ان میں کھانے پینے، استنجا کرنے اور کپڑے پہننے وغیرہ کی صلاحیت پیدا ہو جائے، احناف کے نزدیک اس کی مدت سات سال متعین کی گئی ہے، اس کے بعد چونکہ لڑکوں کو تہذیب و ثقافت اور آداب واخلاق کی ضرورت ہے؛ اس لئے بچے باپ کے حوالے کر دیئے جائیں گے، لڑکیاں ہوں تو بالغ ہونے کے بعد باپ کے حوالے کر دی جائیں گی، یہ مسئلہ اس صورت میں پیش آئے گا جب کہ ماں باپ علاحدہ ہو چکے ہوں، ورنہ مشترک طور پر پرورش کرنا دونوں کا حق ہے۔

12.4.8 شفقت ومحبت اور مساویانہ سلوک

والدین کے لئے ضروری ہے کہ وہ اپنے بچوں کے ساتھ شفقت و محبت اور نرمی کا معاملہ کریں اور اس کے اظہار کے طور پر اپنے چھوٹے بچوں پر شفقت کا ہاتھ پھیریں، ان کو گود میں لیں، ان کو پیار کریں اور ان کے ساتھ ان کی عمر کے اعتبار سے بہتر سلوک کریں۔ ایک مرتبہ اقرع بن حابس حضورؐ کے پاس آئے، حضورؐ اس وقت حضرت حسنؓ کو پیار کر رہے تھے، حضرت اقرع کو دیکھ کر تعجب ہوا اور بولے: یارسول اللہ! آپ بھی بچوں کو پیار کرتے ہیں؟ میرے تو دس بچے ہیں؛ لیکن میں نے تو کبھی کسی ایک کو بھی پیار نہیں کیا، حضورؐ نے ان کی طرف نظر اٹھائی اور فرمایا:

”اگر خدا نے تمہارے دل سے رحمت وشفقت کو نکال دیا ہے تو میں کیا کر سکتا ہوں“ (بخاری: باب رحمۃ الولد، حدیث نمبر: 5998)

اسی طرح اولاد سے ہمیشہ شفقت و محبت اور ان کو لینے دینے میں ایک جیسا سلوک کرنا چاہئے، اپنی زندگی میں اگر اولاد کو کچھ دینا ہو تو بیٹوں اور بیٹیوں، اسی طرح ان میں چھوٹے بڑے کا فرق کئے بغیر سب کو برابر دینا چاہئے، اگر کسی بچہ کی طرف طبعاً میلان ہو تو معاف ہے؛ لیکن سلوک وبرتاؤ اور لین دین میں ہمیشہ انصاف اور مساوات کا لحاظ رکھنا ضروری ہے، ایک مرتبہ حضرت نعمانؓ کے والد حضرت بشیرؓ اپنے بیٹے کو ساتھ لے کر حضورؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور کہا: یارسول اللہ! میرے پاس ایک غلام تھا، وہ میں نے اپنے اس بیٹے کو دے دیا ہے، حضورؐ نے پوچھا: ”کیا تم نے اپنے ہر لڑکے کو ایک ایک غلام دیا ہے“، بشیرؓ بولے: نہیں تو حضورؐ نے فرمایا: ”غلام کو تم واپس لے لو“، اور فرمایا:

”خدا سے ڈرو اور اپنی اولاد کے ساتھ مساوات اور برابری کا سلوک کرو“ (مسلم: باب کراہۃ تفضیل الولد، حدیث نمبر: 1623)

ایک روایت میں ہے کہ آپؐ نے فرمایا: ”تو پھر مجھے گناہ پر گواہ نہ بناؤ، میں ظلم کا گواہ نہ بنوں گا“ (مسلم، حدیث نمبر: 1623)

اور ایک روایت میں ہے کہ حضورؐ نے پوچھا: ”کیا تم یہ پسند کرتے ہو کہ سب لڑکے تمہارے ساتھ اچھا سلوک کریں؟“، حضرت بشیرؓ نے کہا: یارسول اللہ! کیوں نہیں! حضورؐ نے فرمایا: ”پھر ایسا کام مت کرو“ (مسلم، حدیث نمبر: 1623)

زندگی میں اولاد کے درمیان اشیاء کا تقسیم کرنا "ہبہ" یعنی ہدیہ ہے، اولاد کے درمیان چونکہ انصاف کا حکم ہے، اس لئے اس کا تقاضا تو یہی ہے کہ لڑکے اور لڑکیوں کو برابر برابر دیا جائے، اگر باپ کمی بیشی کرے گا تو اللہ تعالیٰ کے یہاں باز پرس ہوگی؛ لیکن اگر اس نے وراثت کے اصولوں پر تقسیم کیا، یعنی لڑکوں کو لڑکیوں کا دوگنا دیا، یا کمی بیشی کا کوئی دوسرا طریقہ استعمال کیا تو یہ تقسیم صحیح ہو جائے گی؛ چونکہ وہ اپنے مال کا مالک ہے اور اس میں اپنی مرضی کے مطابق تصرف کا حق رکھتا ہے ہاں اگر کسی بچہ یا بچی کو کسی معقول بنیاد پر زیادہ دیتا ہے، مثلاً وہ معاشی اعتبار سے زیادہ کمزور ہے، تو گناہ بھی نہیں۔

12.4.9 اولاد کا نفقہ

اولاد کا نفقہ باپ پر واجب ہے، قرآن مجید سے بھی یہی روشنی ملتی ہے، اس لئے بچے کے دودھ پینے کی اجرت باپ پر واجب قرار دی گئی ہے (الطلاق:16) بلکہ ان عورتوں کی کفالت بھی باپ کے ذمہ رکھی گئی ہے، جو اس کے بچے کی پرورش کرنے میں مشغول ہوں اور ان کو دودھ پلاتی ہوں (البقرۃ:233) یہ حدیث سے بھی ثابت ہے، حضرت ابوسفیانؓ اخراجات کی ادائیگی میں کسی قدر تنگی سے کام لیا کرتے تھے، ان کی بیوی حضرت ہندہ رضی اللہ عنہا نے آپ اسے اس تنگی کی شکایت کی اور دریافت کیا کہ میں شوہر کی اجازت کے بغیر ان کے مال میں سے خرچ کر سکتی ہوں؟ آپؐ نے فرمایا:

"اتنی مقدار لے سکتی ہو جو تمہارے اور تمہارے بچے کے لئے کفایت کر جائے" (بخاری: باب اِذالم ینفق الرجل، حدیث نمبر:3546)

باپ مالدار ہو اور بچے نابالغ ہوں تو ان کا نفقہ باپ پر واجب ہے، اور اگر باپ مالدار ہو اور اولاد بالغ ہوں اور وہ محتاج ہوں تو نکاح تک لڑکیوں کا نفقہ باپ کے ذمہ ہو گا، اسی طرح شادی شدہ لڑکیاں مطلقہ یا بیوہ ہو جائیں، تب بھی باپ ان کے نفقہ کا ذمہ دار ہو گا۔ لڑکے مفلوج، نابینا یا معذور ہونے کی وجہ سے کسب معاش کی صلاحیت نہ رکھتے ہوں یا ابھی (فرض کی مقدار) حصول تعلیم میں مشغول ہوں تو ان کا نفقہ بھی باپ کے ذمہ ہو گا۔ اگر باپ خود محتاج ہو اور نفقہ ادا کرنے کی پوزیشن میں نہ ہو، اور بچے بالغ اور مالدار ہوں یا خود کسب معاش کے لائق ہوں تو ان صورتوں میں باپ پر نفقہ کی ذمہ داری نہیں ہوگی؛ لیکن باپ محتاج ہو اور بچے بھی نابالغ یا بالغ محتاج ہوں اور کسب معاش کی صلاحیت نہ رکھتے ہوں تو باپ کی ذمہ داری ہوگی کہ کسب معاش کر کے ان کا خرچ اٹھائے۔

12.4.10 تعلیم وتربیت

والدین پر اولاد کا ایک بڑا حق یہ ہے کہ وہ ان کو اچھی تعلیم وتربیت سے آراستہ کریں؛ چونکہ اگر جسمانی نشو ونما بہتر ہو اور تربیت کے اعتبار سے انسان ناقص ہو تو وہ قابل تعریف نہیں، قرآن مجید میں فرمایا گیا: "اے ایمان والو! تم اپنے آپ کو اور اپنے اہل وعیال کو آگ سے بچاؤ" (تحریم:6) یہ آگ جہنم کی آگ ہے، مگر اس سے مقصود تمام برائیوں، بد اخلاقیوں اور بری عادتوں سے بچوں کی حفاظت ہے؛ چونکہ یہی چیزیں انسان کو جہنم سے قریب کرتی ہیں، اس طرح والدین پر اولاد کی اخلاقی تربیت، دین ودنیا کی نفع بخش تعلیم اور ان کو ہنر مند بنانے کا فرض عائد کیا گیا ہے۔

حضور ﷺ نے فرمایا:

”باپ اپنی اولاد کو جو کچھ دے سکتا ہے اس میں سب سے بہتر عطیہ اولاد کی اچھی تعلیم و تربیت ہے “(ترمذی حدیث نمبر: 1952)۔

12.4.11 بچوں کے لئے دعائیں

قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے ایسے لوگوں کی تعریف فرمائی ہے جو اپنے بچوں کے حق میں دعاء خیر کیا کرتے ہیں اور کہتے ہیں:

”رَبَّنَا هَبْ لَنَا مِنْ أَزْوَاجِنَا وَذُرِّيَّاتِنَا قُرَّةَ أَعْيُنٍ“(الفرقان:74)

(اے ہمارے پروردگار! ہم کو ہماری بیویوں اور ہماری اولاد کی طرف سے آنکھوں کی ٹھنڈک عنایت فرما)

صالح بچوں کے لئے ان کی حفاظت اور ان کی عافیت و سلامتی کے لئے دعاء کرنا بھی ان کا حق ہے، اور والد کی دعاء تو ان دعاؤں میں سے ایک ہے جن کی قبولیت میں کوئی شک نہیں، حضورؐ نے فرمایا:

”تین دعائیں بلاشبہ قبول ہوتی ہیں: والد کی دعاء، مسافر کی دعاء اور مظلوم کی دعاء“(ابوداؤد: باب الدعاء بظہر الغیب، حدیث نمبر: 1536)۔

12.4.12 بچیوں کی خصوصی رعایت

یوں تو بچے اور بچیوں دونوں سے یکساں محبت و شفقت کا برتاؤ کرنے کی تاکید کی گئی ہے؛ لیکن چونکہ حضور اکرمؐ کی بعثت سے پہلے بچیوں کو والدین عار اور شرم کا باعث سمجھتے تھے اور ان کی پیدائش کو سخت ناپسند کرتے تھے، اور یہ ناپسندیدگی اتنی بڑھی ہوئی تھی کہ وہ ان کو زندہ دفن کر دیتے تھے جیسا کہ قرآن مجید میں فرمایا گیا:

”اور جب ان میں سے کسی کو لڑکی کی خوش خبری دی جاتی ہے تو اس کا منہ کالا پڑ جاتا ہے اور غصہ کے گھونٹ پی کر رہ جاتا ہے، اس خوشخبری کے رنج سے وہ لوگوں سے منہ چھپاتا پھرتا ہے کہ آیا ذلت اٹھا کر اس کو اپنے پاس رہنے دے یا اس کو مٹی میں چھپا دے (زندہ دفن کر دے)“(النحل:59)

آج بھی سماج میں ایسے لوگ موجود ہیں۔

اسلام نے لڑکیوں کی اہمیت اس طرح بڑھا دی کہ پیغمبر اسلامؐ نے فرمایا:

”جس شخص نے تین لڑکیوں یا تین بہنوں کی سرپرستی کی، انہیں تعلیم و تہذیب سکھائی اور ان کے ساتھ رحم کا سلوک کیا، یہاں تک کہ خدا ان کو بے نیاز کر دے تو ایسے شخص کے لئے خدا نے جنت واجب فرما دی“، اس پر ایک صاحب نے دریافت کیا: اگر دو ہوں تو حضورؐ نے فرمایا: ”دو لڑکیوں کی پرورش کا بھی یہی صلہ ہے“، حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ اگر لوگ ایک کے بارے میں پوچھتے تو آپؐ ایک کی پرورش پر بھی یہی بشارت دیتے“(شرح السنۃ للبغوي: باب ثواب کافل الیتیم، حدیث نمبر: 3457)

اسی طرح ان کو حقیر نہ سمجھنے اور لڑکوں کی طرح ان سے سلوک کرنے پر یہ خوشخبری سنائی گئی:

”جس کے ہاں لڑکی پیدا ہوئی اور اس نے جاہلیت کے طریقہ پر اسے زندہ دفن نہیں کیا اور نہ اس کو حقیر جانا اور لڑکے کو اس کے مقابلہ میں ترجیح نہ دی اور زیادہ نہ سمجھا تو ایسے آدمی کو خدا جنت میں داخل کرے گا“ (ابوداؤد: باب فضل من عال یتیماً، حدیث نمبر: 5146)

12.5 اکتسابی نتائج

اس اکائی میں آپ نے درج ذیل نکات سیکھے:

- اسلام میں حقوق العباد کی اہمیت کو سمجھنے کے لئے اتنا کافی ہے کہ یہ حقوق بندوں کی معافی کے بغیر معاف نہیں ہوتے، اسلام نے ایک شخص کو اس کی مختلف حیثیتوں سے متعدد حقوق دیئے ہیں، انسان کے علاوہ جانوروں کے حقوق بھی متعین کئے ہیں، اسلام انسانی بنیاد پر ہر شخص کو زندگی گذارنے اور شخصی آزادی کو استعمال کرنے کا حق فراہم کرتا ہے؛ لیکن وہ اس کی آزادی کو اللہ کے حکموں کے تابع بناتا ہے اور اسی طرح وہ اس کو انسانوں کی غلامی سے نکال کر صرف ایک اللہ کی غلامی میں داخل کرتا ہے، اسلام انسانی بنیاد پر ہر ایک سے اچھا برتاؤ کرنے اور ہر ایک پر رحم کرنے کی تعلیم دیتا ہے، اسلام یہ درس دیتا ہے کہ ہر ایک کے لئے وہی پسند کیا جائے جو خود انسان اپنے لئے پسند کرتا ہے اور ضرورت کے وقت ہر ایک کی مدد کی جائے، اس میں مسلمانوں کی تخصیص نہیں؛ بلکہ اسلام کی یہ ہدایات سب کے حق میں ہیں۔
- اسلام نے والدین کے احترام، ان سے محبت، ان کی اطاعت، ان کے ساتھ حسن سلوک اور ان کی خدمت کا تاکیدی حکم دیا ہے، قرآن مجید میں تقریباً 12، آیتوں میں والدین کے ساتھ حسن سلوک کی تعلیم دی گئی ہے اور ان کے حکم پر اُف تک کہنے سے منع کیا گیا ہے، بوڑھے والدین کی خدمت کو حضورؐ نے جہاد سے افضل قرار دیا ہے، حسن سلوک کے ساتھ ساتھ والدین کے نفقہ کی ذمہ داری بھی اولاد پر رکھی گئی ہے، شریعت میں ماں باپ دونوں کی خدمت واطاعت کا حکم دیا گیا ہے؛ لیکن چوں کہ ماں فطری طور پر زیادہ کمزور اور حساس ہوتی ہے اور اس کی قربانیاں بھی زیادہ ہوتی ہیں؛ اس لئے شریعت میں ماں کا حق زیادہ بتایا گیا ہے، ماں باپ کا ایک حق یہ بھی ہے کہ ان کی زندگی میں بھی اور ان کی وفات کے بعد بھی ان کے حق میں دعائیں کی جائیں، اسی طرح والدین پر اولاد کے کچھ حقوق عائد کئے گئے ہیں، بطور خاص رضاعت اور حضانت کا حق، بچوں پر شفقت ومحبت اور ان کے ساتھ مساویانہ سلوک کا حق، ان کے نفقہ اور ان کی تعلیم وتربیت کا حق، ان سارے حقوق کی ادائیگی والدین پر واجب ہے، اولاد کا ایک حق یہ بھی ہے کہ والدین اور خصوصاً باپ اپنے بچوں کے لئے دعائیں کرتا رہے، بچیوں کی پرورش اور ان کی تعلیم وتربیت وغیرہ پر حضور اکرمؐ نے خصوصی اجر وثواب کی خوشخبری سنائی ہے۔

12.6 نمونہ امتحانی سوالات

12.6.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات

1. بچے کی پرورش کرنے کو عربی میں کیا کہتے ہیں؟

(a).حضانت (b).رضاعت (c).دونوں غلط (d).سب صحیح

2. نیک سلوک کا سب سے زیادہ حق دار کون ہے؟

(a).ماں (b).دادا (c).چچا (d).پڑوسی

3. اسلام نے انسان کے لیے جن حقوق کی ضمانت لی ہے اس میں پہلا حق کس کا ہے؟

(a).زندگی گزارنے کا حق (b).شخصی آزادی کا حق (c).رائے دہی کا حق (d).سب غلط

4. اسلام کے علاوہ دوسرے مذاہب میں والدین کے احترام کی تاکید کی گئی ہے۔

(a).ہاں (b).نہیں (c).دونوں صحیح (d).سب غلط

5. حدیث کی روشنی میں ماں کے قدموں کے نیچے کیا ہے؟

(a).جنت (b).جہنم (c).برزخ (d).دوزخ

6. قرآن مجید میں تقریباً کتنی آیتوں میں والدین کے ساتھ حسن سلوک کی تاکید کی گئی ہے؟

(a).12 (b).10 (c).19 (d).21

7. زندگی میں اولاد کے درمیان اشیاء کا تقسیم کرنا کیا ہے؟

(a).ہبہ (b).ہدیہ (c).عطیہ (d).سب صحیح

8. والدین کو اف تک نہ کہو اور نہ ان کو جھڑکو۔ کس سورہ میں حکم آیا ہے؟

(a).بنی اسرائیل (b).سورہ فاتحہ (c).سورہ ناس (d).سورہ اخلاص

9. اسلام نے رضاعی ماں کے ساتھ کیسا برتاو کرنے کا حکم دیا ہے؟

(a).حسن سلوک (b).خاطر میں نہ لانا (c).نیچی نظر سے دیکھنا (d).سب صحیح

12.6.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات

1. حقوق العباد سے آپ کیا سمجھتے ہیں؟ واضح کیجیے۔
2. اسلام میں شخصی آزادی کے تصور پر روشنی ڈالیے۔

3. اسلام میں ماں کے خصوصی مقام کو بیان کیجیے۔

4. اسلام میں زندگی گزارنے کے حق پر نوٹ لکھیے۔

5. رضاعت اور حضانت پر اپنی معلومات قلم بند کیجیے۔

12.6.3 طویل جوابات کے حامل سوالات

1. والدین کے ساتھ حسن سلوک اور ان کی خدمت کے بارے میں دلائل کے ساتھ لکھیے۔

2. اولاد پر شفقت اور ان کے ساتھ مساویانہ سلوک پر ایک نوٹ لکھیے۔

3. اولاد کے نفقہ اور ان کی تعلیم و تربیت پر روشنی ڈالیے۔

12.7 تجویز کردہ اکتسابی مواد

1. سیرۃ النبی اجلد ششم (اردو) : علامہ سید سلیمان ندویؒ
2. حقوق العباد (اردو) : عالم فقری
3. آداب زندگی (اردو) : مولانا یوسف اصلاحی
4. مجموعہ قوانین اسلامی (اردو) : مرتبہ: آل انڈیا مسلم پرسنل لاء بورڈ
5. قاموس الفقہ (اردو) : مولانا خالد سیف اللہ رحمانی

اکائی 13: حقوق العباد (ازدواج اور قرابت دار)

اکائی کے اجزا:

13.0 تمہید

13.1 مقاصد

13.2 ازدواجی کے حقوق

- 13.2.1 میاں بیوی کے مشترکہ حقوق
- 13.2.2 شوہر پر بیوی کے حقوق
- 13.2.3 بیوی پر شوہر کے حقوق

13.3 قرابت داروں کے حقوق

- 13.3.1 قرابت داروں سے مراد؟
- 13.3.2 صلہ رحمی اور اس کی فضیلت
- 13.3.3 حق وراثت
- 13.3.4 دیگر حقوق

13.4 اکتسابی نتائج

13.5 کلیدی الفاظ

13.6 نمونہ امتحانی سوالات

- 13.6.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات
- 13.6.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات
- 13.6.3 طویل جوابات کے حامل سوالات

13.7 تجویز کردہ اکتسابی مواد

13.0 تمہید

دین اسلام نے دو قسم کے حقوق بیان کیے ہیں۔ ایک ”حقوق اللہ“ جس کا تعلق براہِ راست اللہ تبارک و تعالیٰ سے ہے جن میں توحید، نماز، روزہ، زکوٰۃ، حج شامل ہیں جبکہ دوسرا ”حقوق العباد“ ہے جس کا تعلق براہِ راست خلق خدا سے ہے۔ حقوق العباد میں دنیا کے ہر مذہب، ہر ذات و نسل، ہر درجے اور ہر حیثیت کے انسانوں کے حقوق شامل ہیں۔ اس اکائی میں آپ ازدواجی کے حقوق کے بارے میں تفصیل سے جانیں گے۔

13.1 مقاصد

اس اکائی کا مقصد یہ ہے کہ آپ ازدواجی حقوق کے بارے میں واقفیت حاصل کر سکیں اور میاں بیوی کے مشترکہ حقوق، شوہر پر بیوی کے حقوق، بیوی پر شوہر کے حقوق اس کے علاوہ قرابت داروں کے حقوق کے بارے میں آگاہی حاصل کریں گے۔

13.2 ازدواجی کے حقوق

حقوق زوجین کی ادائیگی کے بارے میں اللہ تعالی کا ارشاد ہے:

”وَلَهُنَّ مِثْلُ الَّذِيْ عَلَيْهِنَّ بِالْمَعْرُوْفِ“(البقرۃ:228)

(اور جیسے عورتوں پر مردوں کے حقوق ہیں اسی طرح مردوں پر بھی عورتوں کے حقوق ہیں)

ان حقوق کی تین جہتیں ہو سکتی ہیں: 1. میاں بیوی کے مشترکہ حقوق 2. شوہر پر بیوی کے حقوق 3. بیوی پر شوہر کے حقوق

13.2.1 میاں بیوی کے مشترکہ حقوق

حسن معاشرت

بیوی پر شوہر کے ساتھ حسن سلوک اور اس کا احترام ضروری ہے، اسی طرح شوہر کے لیے بھی بیوی کے ساتھ اچھا برتاؤ کرنا اور اس کی دلجوئی ضروری ہے، قرآن مجید میں ہے:

”اور اس کی نشانیوں میں سے یہ ہے کہ اس نے تمہارے لیے تمہاری ہی جنس سے بیویاں بنائیں تا کہ تم ان کے پاس سکون حاصل کرو اور تمہارے درمیان محبت اور رحمت پیدا کر دی، یقیناً اس میں بہت سی نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لیے جو غور و فکر کرتے ہیں“(الروم: 21)

ظاہر ہے سکون و اطمینان اور محبت و الفت کا حصول ایک دوسرے کے احترام اور بہتر برتاؤ کے بغیر نہیں ہو سکتا، شوہر کو چونکہ ”قوامیت“ اور برتری حاصل ہے، اس بات کا زیادہ امکان ہوتا ہے کہ وہ اپنی بیوی کو اس برتری اور انانیت کے زور پر اپنے حسن سلوک سے محروم رکھے؛ اس لیے اس کو زیادہ اس کی تاکید کی گئی، فرمایا گیا:

”اور ان کے ساتھ اچھی طرح گذر بسر کرو، اگر وہ تم کو نہیں بھاتی ہیں تو ہو سکتا ہے تم کو ایک چیز ناپسند ہو اور اللہ نے اس میں بہت سی خوبیاں رکھی ہوں“ (النساء:19)

زوجین کے آپسی تعلقات کے لیے سورۂ بقرہ، سورۂ نساء اور سورۂ طلاق میں ”معروف“ کا لفظ تقریباً پندرہ مقامات پر استعمال ہوا ہے، معروف کے مختلف آیتوں میں مختلف معنی ہیں؛ لیکن بالعموم اس میں یہ بات شامل ہے کہ بغیر احسان جتائے ہوئے بخشش و کرم کا سلسلہ جاری رکھنا، میاں بیوی ایک دوسرے کے حق میں سراپا محبت اور رحمت بن کر رہیں، قول و فعل میں دونوں ایک دوسرے کے لیے پھول نچھاور کرنے والے ہوں، حتی کہ اگر کسی وجہ سے اس رشتہ کو ختم ہی کرنا پڑے تو شوہر کو یہ تعلیم دی گئی کہ اسلامی طریقہ پر حق طلاق کا استعمال کرتے ہوئے عدت کے بعد ”معروف“ کے ساتھ بیوی کو رخصت کرے:

”فَاَمۡسِكُوۡهُنَّ بِمَعۡرُوۡفٍ اَوۡ فَارِقُوۡهُنَّ بِمَعۡرُوۡفٍ“ (طلاق:2)

(تو بہتر طریقے پر ان کو رکھو یا بھلے طریقہ پر ان کو چھوڑ دو)

خوشگوار ازدواجی زندگی کے لئے یہ ضروری ہے کہ ایک غصہ ہو جائے تو دوسرا اس کو منانے کی کوشش کرے، حضرت ابوالدرداءؓ اپنی اہلیہ سے فرمایا کرتے تھے: ”جب تم مجھے غصہ میں دیکھو تو راضی کر لیا کرو، اور جب میں تمہیں غصہ میں دیکھوں تو راضی کر لوں، اس کے بغیر ہم دونوں ساتھ نہیں رہ سکتے“، حضرت عائشہ عام حالات میں ”ورب محمد“ (محمد کے رب کی قسم) کہتیں، کسی وجہ سے روٹھ جاتیں تو ”ورب ابراہیم“ (ابراہیم کے رب کی قسم) کہتیں، حضورؐ نے اس فرق کو محسوس کر لیا، اور فرمایا:

”میں جانتا ہوں تم کب مجھ سے خوش ہو، اور کب ناراض ہو“ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے اس کا اعتراف کیا، اور فرمایا:

”جی! بخدا رسول خدا! میں صرف آپ کا نام چھوڑ دیتی ہوں (بخاری: باب غیرۃ النساء ووجدہن، حدیث نمبر:5228)

اس واقعہ سے ہم اندازہ کر سکتے ہیں کہ حضور اکرمؐ نبوت کی ذمہ داریوں کے باوجود ازدواجی زندگی کو کس قدر خوشگوار رکھتے تھے، اور لاکھ مصیبت و غم ٹوٹ پڑے، باہر کے مسائل کو بہت کم گھر میں چھیڑتے تھے۔

حضور اکرمؐ کا معمول مبارک تو یہ تھا کہ وہ گھر کے کام میں بھی ہاتھ بٹاتے تھے:

”تم میں سے ایک عام آدمی کی طرح آپ اپنے گھر میں کام کیا کرتے تھے“ (مسند أحمد، حدیث نمبر: 25341)

آپؐ نے یہاں تک فرمایا:

”تم میں سب سے بہتر وہ ہے جو اپنے گھر والوں کے لیے بہتر ہو، اور میں اپنے گھر والوں کے لیے سب سے بہتر ہوں“ (ترمذی، باب فضل ازواج النبی، حدیث نمبر:4269)

ایک دوسرے کی خامیوں کو برداشت کرتے ہوئے زندگی کا یہ سفر طے کرنا ضروری ہے:

”وَلَا تَنۡسَوُا الۡفَضۡلَ بَيۡنَكُمۡ“ (البقرۃ:237) (اور ایک دوسرے کے ساتھ حسن سلوک کرنا نہ بھولو)

خوبیوں پر نظر رکھتے ہوئے خامیوں کو نظر انداز کرنا چاہیے، حضور اکرمؐ نے ارشاد فرمایا:

”کوئی مومن مرد کسی مومن عورت کو ناپسند نہ کرے، اگر اس کی ایک عادت نہ پسند ہو تو دوسری پسند بھی ہوگی“ (مسند احمد، حدیث نمبر: 8363)

زینت اختیار کرنا

عورت چونکہ مرکز جمال ہے، اور زینت اس کی چادر ہے، سنورنے کی خواہش اس کی فطرت میں رکھ دی گئی ہے، اسی لیے سونا چاندی جو اصلاً کرنسی کی بنیادیں ہیں، اور ان کو بازار میں گردش میں رہنا چاہئے، روک کر نہیں رکھنا چاہئے، لیکن عورت کی اسی فطری خواہش کی تسکین کے لیے اسے زیورات پہننے کی اجازت دی گئی، ہاں یہ ضرور حکم دیا گیا کہ اس کی نمائش نہ ہو، جن محرم مردوں کے سامنے اس زینت کو ظاہر کرنے کا حکم دیا گیا ہے ان میں سب سے پہلے شوہر کا ذکر ہے:

”وَلاَ یُبْدِیْنَ زِیْنَتَھُنَّ إِلاَّ لِبُعُوْلَتِھِنَّ أَو...“ (النور: 31)

”اور پنی زینت کو ظاہر نہ کریں مگر اپنے شوہروں کے لیے یا...“

حضرت سلمان فارسی ص نے جب حضرت ام درداء رضی اللہ عنہا کو زیب وزینت سے عاری دیکھا تو ان کی اس حالت پر حیرت کا اظہار کیا، اور جب معلوم ہوا کہ حضرت ابو درداءؓ کو اس سے دلچسپی نہیں تو ان کو نصیحت کی اور فرمایا: ”وَلأَہْلِکَ عَلَیْکَ حَقًّا“ (بخاری: باب من اقسم علی اخیہ لیفطر فی التطوع، حدیث نمبر: 1968)، (تمہاری بیوی کا بھی تم پر حق ہے) حضورؐ نے حضرت سلمانؓ کے اس مشورہ کو حق بجانب قرار دیا، اور یہ میاں بیوی دونوں کے لیے نصیحت تھی۔

جس طرح بیوی کا شوہر کے لیے سجنا سنورنا اس کا حق ہے اسی طرح شوہر کا بیوی کے لیے اچھی ہیئت میں رہنا اور مناسب لباس زیب تن کرنا بھی پسندیدہ ہے۔

حضور اکرمؐ جب گھر میں داخل ہوتے تھے تو مسواک فرمایا کرتے تھے (مسند احمد: 25553) اس میں عبادت کے ساتھ ساتھ یہ بھی پہلو ہے کہ گھر والوں کے درمیان آدمی تر وتازہ رہے، امام ابویوسف سے منقول ہے:

”جیسے مجھے پسند ہے کہ وہ (میری بیوی) میرے لیے زینت اختیار کرے اسے بھی پسند ہے کہ میں اس کے لیے زینت اختیار کروں“ (رد المحتار: 9/605)

عبادت اور دینی کاموں میں باہمی تعاون

اسی طرح میاں بیوی کو دینی کاموں میں ایک دوسرے کی مدد کرنی چاہئے اور اس کی ترغیب دینی چاہئے، حضورؐ نے فرمایا:

”اللہ تعالیٰ اس مرد پر رحم فرمائے جو رات میں اٹھ کر نماز پڑھتا ہو اور اپنی بیوی کو بھی اٹھاتا ہو، وہ بھی نماز پڑھتی ہو، اور اگر وہ اٹھنے سے انکار کرتی ہو تو اس کے چہرہ پر پانی کی چھینٹیں مارتا ہو، اور اللہ تعالیٰ اس عورت پر رحم فرمائے جو رات میں اٹھ کر نماز پڑھتی ہو اور اپنے شوہر

کو بھی اٹھاتی ہو، وہ بھی نماز پڑھتاہو، اور اگر وہ اٹھنے سے انکار کرتا ہو تو اس کے چہرہ پر پانی کی چھینٹیں مارتی ہو"(النسائی: باب الترغیب فی قیام اللیل، حدیث نمبر:1610)

میراث پانا

جس طرح بیوی کو اس کے انتقال کے بعد شوہر کے ترکہ میں حصہ ملتاہے، اور وہ اس طرح کہ شوہر کی اولاد نہ ہو تو نصف (1/2) حصہ اور اولاد ہو تو ایک چوتھائی (1/4) حصہ' اسی طرح شوہر کے لیے بھی بیوی کے ترکہ میں حصہ متعین ہے، اگر شوہر صاحب اولاد ہو تو بیوی کو اس کی چھوڑی ہوئی جائیداد کا آٹھواں (1/8) حصہ ملے گا اور لاولد ہو تو چوتھائی (1/4) حصہ ملے گا (النساء:12)۔

13.2.2 شوہر پر بیوی کے حقوق

مہر

مہر وہ مال ہے جو مرد پر عورت کے لیے عقد نکاح یا جنسی تعلق قائم ہونے کی وجہ سے واجب ہوتا ہے، مہر کی اہمیت اس بات سے معلوم ہوتی ہے کہ مہر کو قرآن میں "فریضہ" کے لفظ سے بھی ذکر کیا گیا ہے، مہر کا مقصد اس عقد کی اہمیت کو اجاگر کرنا اور عورت کا اعزاز واکرام ہے، اللہ تعالی کا ارشاد ہے:

"وَآتُوا النِّسَاءَ صَدُقَاتِهِنَّ نِحْلَةً"(النساء:4)

(اور بیویوں کو خوشدلی کے ساتھ ان کا مہر ادا کرو)

مرد کے لیے جائز نہیں کہ وہ عورت کی رضامندی اور خوشدلی کے بغیر مہر کا کچھ حصہ بھی رکھ لے، قرآن میں ہے:

"وَلاَ يَحِلُّ لَكُمْ أَنْ تَأْخُذُوا مِمَّا آتَيْتُمُوهُنَّ شَيْئًا"(البقرة:229)

(اور جو کچھ تم بیویوں کو دے چکے ہو ان میں سے کچھ بھی واپس لینا درست نہیں)

ہاں وہ دونوں اللہ کی حدوں کو قائم نہ رکھ سکیں، یعنی میاں بیوی کو جو احکام اللہ کی طرف سے ملے ہیں وہ ان پر قائم نہ رہ سکیں: "أَلاَّ يُقِيمَا حُدُودَ اللّٰهِ"(البقرة:229) اور عورت خلع لے لے، یا یہ کہ عورت خوشدلی سے معاف کردے، تو پھر مرد کے لئے مہر کا مال جائز ہو جاتا ہے:

"پھر اگر وہ خوش دلی سے اپنے مہر میں سے کچھ تمہارے لیے چھوڑ دیں تو اس کو ہنسی خوشی کھاؤ"(النساء:4)

اگرچہ نکاح کے عقد میں مہر کا ذکر کرنا ضروری نہیں، لیکن اس کی اہمیت اتنی زیادہ ہے کہ اس کے بغیر بھی مرد پر کسی نہ کسی صورت میں مہر واجب ہو جاتا ہے، جس کی تفصیلات فقہ کی کتابوں میں مل جائیں گی، نکاح مہر نہ دینے کی شرط پر ہو تو بھی مہر واجب ہو گا، جس نے نکاح کیا اور مہر ادا کرنے کا ارادہ نہیں تھا تو وہ زانی ہے۔(مجمع الزوائد: باب فیمن نوی أن لایؤدي صداق المرأة، حدیث نمبر:7505)۔

نفقہ رہائشی

نفقہ سے مراد یہ ہے کہ شوہر کھانے کپڑے وغیرہ کا انتظام کرے، نیز وہ رہائش کا انتظام کرے، بیوی کے کھانے پینے، رہائش اور کپڑے کے ساتھ ساتھ دوا وعلاج کی ذمہ داری بھی شوہر پر ہے، اگر عورت نکاح کے بعد خود کو مرد کے حوالہ کر دیتی ہے تو اس پر اس کا خرچ اٹھانا لازم ہے، اور اس کی حکمت یہ ہے کہ عورت نکاح کے بعد سے ہی خود کو شوہر کے گھر کا پابند بنالیتی ہے، وہ اس کی اجازت کے بغیر گھر سے نہیں نکلتی، عورت خود مالدار بھی ہو تو مرد پر اس کی ادائیگی لازم ہے، مرد کی اجازت سے یا اس کے ظلم سے تنگ آکر بیوی میکہ میں رہے تو بھی خرچ شوہر پر ہے (عالمگیری 1/545) خورد ونوش، رہائش، اور لباس وپوشاک میں بیوی کے اہل خاندان کے معیار کا لحاظ شوہر کی استطاعت کے ساتھ ضروری ہے، اگر بیوی کے گھر کا معیار اونچا ہو تو کم از کم درمیانی درجہ کے نفقہ کا انتظام شوہر پر لازم ہے (ہدایہ /2/417) اگر بیوی سسرال کے لوگوں کے ساتھ رہنے پر آمادہ نہ ہو تو اس کو علاحدہ مکان کے مطالبہ کا حق حاصل ہے، اور اگر ایسا کرنا مصلحت کے خلاف نہ ہو تو شوہر کے لیے اس کو پورا کرنا واجب ہے (ہدایہ 2/421) عدت طلاق میں بھی شوہر پر نفقہ واجب ہے۔

علاج کو اصلاً فقہاء نے نفقہ میں شامل نہیں کیا ہے، بلکہ عورت اگر خود مالدار ہو تو اسی پر ہے، اور اگر وہ غریب ہو تو اس کے گھر والوں پر، لیکن ایسا محسوس ہوتا ہے کہ علاج گذشتہ زمانہ میں بنیادی ضرورت میں شامل نہیں تھا، اس لیے کہ صحت اور توانائی کے لیے بالعموم لوگ اہتمام کرتے تھے، پرہیز سے کام لیتے تھے، غذاؤں میں مضر اثرات کی ملاوٹ نہ ہونے کی وجہ سے بیماریاں اس طرح وبا کی شکل میں عام بھی نہیں ہوئی تھیں، چنانچہ فقہاء نے اپنے زمانہ کی ضرورت کے مطابق اجتہاد کیا، آج دوا علاج نے غذا کی جگہ لے لی ہے، بلکہ بسا اوقات اس کی اہمیت اس بھی زیادہ بڑھ جاتی ہے، بعض مریض کھانے سے بڑھ کر دوا کے سہارے زندہ ہوتے ہیں، جب درد و مصیبت نے گھیر رکھا ہو، اور موت دروازہ پر دستک دے رہی ہو تو کھانا کیوں کر کھایا جائے، اس لیے اس دور کے زیادہ تر فقہاء علاج کو نفقہ میں شامل کرتے ہیں، اخلاقاً بھی یہ بات زیب نہیں دیتی کہ صحت کی حالت میں شوہر بیوی سے لطف اندوز ہو اور بیماری کی حالت میں اسے میکہ پہونچا کر اپنی عاجزی کا ثبوت دے (الفقہ الإسلامی وأدلتہ:10/110)۔

عدل

ایک سے زیادہ بیویاں ہوں تو کھانے پینے، لباس وپوشاک اور رات گذارنے کے اعتبار سے پوری طرح برابری برتنا ضروری ہے، حضورؐ نے ارشاد فرمایا:

”جس کی دو بیویاں ہوں اور ان میں سے کسی ایک کی طرف زیادہ مائل ہو تو قیامت کے دن اس حال میں آئے گا اس کا ایک پہلو جھکا ہوا ہو گا“ (أبوداود، باب القسم بین الزوجین، حدیث نمبر:2135)

ہاں کسی ایک کی طرف دل کا میلان اس کی کسی خوبی کی وجہ سے زیادہ ہو تو اس پر پکڑ نہیں؛ لیکن معاملات میں اس کا اظہار نہیں ہونا چاہئے، حضورؐ سفر پر بھی تشریف لے جاتے تو قرعہ اندازی فرماتے جس بیوی کے نام قرعہ نکلتا اسی کو ساتھ لے جاتے (مسند احمد، حدیث نمبر:

26314)، جس شخص کے اندر انصاف کی صلاحیت نہ ہو اسے پہلی بیوی کی موجودگی میں دوسری شادی کی اجازت نہیں (النساء:3)۔

13.2.3 بیوی پر شوہر کے حقوق

بیوی پر شوہر کے حقوق کی پاسداری اور ان کی رعایت کی اور زیادہ تاکید کی گئی ہے:

"وَلِلرِّجَالِ عَلَيْهِنَّ دَرَجَةٌ" (البقرة:228) (البتہ مردوں کو عورتوں پر ایک گونہ فضیلت حاصل ہے)

امام جصاص رازی لکھتے ہیں کہ اس آیت میں اللہ تعالی نے میاں بیوی دونوں کے حقوق بیان کئے ہیں؛ لیکن مرد کو ایک خصوصی حق دیا ہے جو عورت کو حاصل نہیں۔ (احکام القرآن، جصاص:2/68)۔ ابن عربی کہتے ہیں: اس میں اس بات کی وضاحت ہے کہ مرد عورت سے مرتبہ میں بڑھا ہوا اور نکاح کے حقوق میں عورت سے مقدم ہے (أحکام القرآن، ابن عربی:1/361)۔

بیوی پر شوہر کے چند حقوق درج ذیل ہیں:

شوہر کی اطاعت

مرد کو اللہ تعالی نے گھر کا ذمہ دار بنایا ہے، اور یہ صرف اس وجہ سے کہ فطری طور پر اس کو زیادہ قوی اور نگہداشت کی صلاحیت رکھنے والا بنایا گیا ہے، اور اس لیے کہ وہ مالی ذمہ داری اٹھاتا ہے، اللہ تعالی کا ارشاد ہے:

"اَلرِّجَالُ قَوَّامُوْنَ عَلَى النِّسَاءِ بِمَا فَضَّلَ اللّٰهُ بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ وَبِمَا أَنفَقُوْا مِنْ أَمْوَالِهِمْ" (النساء:34)

"مرد عورتوں پر نگراں ہیں، اس لیے کہ اللہ ہی نے بعض کو بعض پر فضیلت عطا فرمائی ہے، اور اس لیے کہ وہ اپنے مال خرچ کرتے ہیں"

حضرت علی بن ابی طلحہ حضرت ابن عباسؓ سے روایت کرتے ہیں کہ قوّام کے معنی یہ ہیں کہ مرد عورتوں کے امیر ہیں، چنانچہ بیوی کی ذمہ داری ہے کہ وہ ان تمام باتوں میں شوہر کی اطاعت کرے جن کا اللہ تعالی نے حکم فرمایا ہے، اور اس کی اطاعت یہ ہے کہ وہ اس کے لیے خیر خواہ اور اس کے مال کی محافظ بن کر رہے (ابن کثیر)، شوہر کا مرتبہ اس قدر بڑھا دیا گیا کہ آپؐ نے فرمایا کہ:

"میں اگر کسی کو کسی کے لیے سجدہ کرنے کا حکم دیتا تو بیوی کو حکم دیتا کہ وہ شوہر کو سجدہ کرے" (ترمذی: باب حق الزوج علی المرأة، حدیث نمبر:285)

بیوی شوہر کو خوش رکھ کر اس دنیا سے جائے تو حضور انے اس کے جنت میں داخل ہونے کی بشارت دی ہے۔ (ترمذی: باب حق الزوج علی المرأة، حدیث نمبر:286) یہ بھی ارشاد نبوی ہے کہ

"انسان کا سب سے بہترین خزانہ نیک بیوی ہے کہ شوہر جب اس کی طرف دیکھے تو اسے خوش کر دے، اور جب اسے حکم دے تو بات مانے، اور جب موجود نہ ہو تو اس کی حفاظت کرے" (أبو داؤد: باب فی حقوق المال، حدیث نمبر:1666)

ایک حدیث میں فرمایا گیا:

”عورت کے لیے اپنے شوہر کی موجودگی میں اس کی اجازت کے بغیر (نفلی) روزہ رکھنا، یا اس کی اجازت کے بغیر اس کے گھر میں کسی کو آنے دینا جائز نہیں، یعنی شوہر کے گھر بار، مال و دولت، اور اپنی عزت و آبرو کی حفاظت اس کا حق ہے“ (بخاری: باب لا تأذن المرأة في بیت زوجها، حدیث نمبر: 5195)

13.3 قرابت داروں کے حقوق

13.3.1 قرابت داروں سے مراد؟

عربی میں قرابت داروں یا رشتہ داروں کے لئے متعدد الفاظ استعمال ہوئے ہیں مثلاً: اقارب ، ذوی القربی ، ذوی الأرحام ، أولو الأرحام وغیرہ۔

اقارب میں درجہ بدرجہ ماں، باپ، بھائی بہن، بیٹے بیٹیاں اور ان سے جڑی ہوئی ساری رشتہ داریاں مثلاً دادا، دادی، نانا، نانی اور ان سے اوپر کے رشتہ دار، اسی طرح پوتے پوتیاں، نواسے نواسیاں اور ان سے چلنے والی نسل، اسی طرح چچا، پھوپھیاں، ماموں اور خالائیں اور ان سب کے بچے بچیاں سب شامل ہیں، خواہ ان میں کوئی قریب کا ہو کوئی دور کا، کوئی محرم ہو کوئی غیر محرم ہر ایک درجہ بدرجہ رشتہ داروں میں داخل ہیں؛ لیکن ظاہر ہے کہ والدین اور اولاد کو حقوق کے اعتبار سے اولیت حاصل ہے اور شریعت نے ان کو خصوصی درجہ عطا فرمایا ہے، اسی طرح زوجین کے تعلقات کی نوعیت بھی الگ ہے، اس لئے ان کو علاحدہ بیان کیا گیا، یہاں ان کے علاوہ مجموعی طور پر دیگر رشتہ داروں کے حقوق بیان کئے گئے ہیں۔

13.3.2 صلہ رحمی اور اس کی فضیلت

قرابت کے حقوق ادا کرنے کے لئے عربی زبان میں ”وَصْلُ الرَّحِمِ“ یا ”صلةُ الرّحم“ کہ تعبیر استعمال ہوئی، اردو میں اسی کے لئے ”صلہ رحمی“ کا مرکب لفظ مشہور ہے، ”رحم“ کی تشریح خود حضورؐ نے ان الفاظ میں فرمائی کہ ”رحم“ رحمن سے مشتق ہے، اس لئے محبت والے خدا نے رحم کو خطاب فرمایا:

”جس نے تجھ کو ملایا اس کو میں نے ملایا، جس نے تجھ کو کاٹا اس کو میں نے کاٹا“ (بخاری: باب من وصل وصله الله، حدیث نمبر: 5988)

اور اس سے اشارہ رحم مادر کی طرف ہے کہ وہیں سے انسان اس دنیا میں آتا ہے اور سارے انسان ایک ماں باپ سے پیدا ہوئے۔ اور ان میں جو آپس میں رشتہ دار ہیں ان کو اور قریبی واسطوں نے ایک دوسرے سے قریب کر دیا ہے، اس لئے اس رشتہ کا پاس ولحاظ ضروری ہے۔

صلہ رحمی کو اسلام میں بڑی اہمیت حاصل ہے، اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں فرمایا:

”وَأُولُو الْأَرْحَامِ بَعْضُهُمْ أَوْلَىٰ بِبَعْضٍ فِي كِتَابِ اللّٰهِ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ وَالْمُهَاجِرِينَ إِلَّا أَن تَفْعَلُوا إِلَىٰ أَوْلِيَائِكُم مَّعْرُوفًا كَانَ ذَٰلِكَ فِي الْكِتَابِ مَسْطُورًا“ (الأحزاب:6)

(مگر کتاب اللہ کی رو سے عام مومنین و مہاجرین کی بہ نسبت رشتہ دار ایک دوسرے کے زیادہ حقدار ہیں؛ البتہ اپنے رفیقوں کے ساتھ تم کوئی بھلائی (کرنا چاہو تو) کرسکتے ہو، یہ حکم کتاب الٰہی میں لکھا ہوا ہے)

اسی طرح اللہ تعالیٰ نے تقوی کی تلقین کے ساتھ ساتھ صلہ رحمی کا پاس ولحاظ رکھنے کی تلقین فرمائی:

”وَاتَّقُوا اللّٰهَ الَّذِي تَسَاءَلُونَ بِهِ وَالْأَرْحَامَ“ (النساء:1)

(اور جس خدا کا واسطہ دے کر تم ایک دوسرے سے درخواست کرتے ہو اس کا اور رشتہ داروں کا خیال رکھو)

یعنی اللہ تعالیٰ کی اطاعت کرو اور اس کی معصیت سے بچتے رہو اور رشتوں کو کاٹنے سے بچو، جب حضورؐ پر پہلی وحی نازل ہوئی اور اچانک اس خلاف عادت پیش آنے والے واقعہ سے آپ پر جو گھبراہٹ کی کیفیت تھی، اس پر تسلی دیتے ہوئے حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا تھا: اللہ تعالیٰ آپ کو ہرگز رسوا نہ کرے گا؛ چونکہ آپ صلہ رحمی کرتے ہیں (بخاری: باب ما ودعک ربک، حدیث نمبر: 4953) اس سے معلوم ہوتا ہے کہ صلہ رحمی فطرت کا تقاضہ ہے اور یہ انسانی ضرورت ہے اور اس کی اہمیت بغیر شرعی رہنمائی کے بھی انسان محسوس کرسکتا ہے، حضورؐ نے فرمایا:

”جو اللہ اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتا ہو اس کو چاہئے کہ صلہ رحمی کرے“ (بخاری: باب إکرام الضیف، حدیث نمبر: 6138)

اس حدیث میں حضورؐ نے صلہ رحمی کو ایمان کی علامت قرار دیا ہے، ایک دوسری حدیث میں آپؐ نے صلہ رحمی کو رزق میں برکت اور درازی عمر کا ذریعہ قرار دیا، فرمایا:

”جس کو یہ پسند ہو کہ اس کی روزی میں وسعت اور اس کی عمر میں برکت ہو تو اس کو چاہئے کہ صلہ رحمی کرے“ (بخاری: باب من أحب البسط في الرزق، حدیث نمبر: 2067)

احادیث میں یہ وضاحت بھی کردی گئی ہے کہ صلہ رحمی صرف یہ نہیں کہ صلہ رحمی کرنے والے رشتہ داروں کے ساتھ بدلہ کے طور پر حسن سلوک کیا جائے اور جو رشتہ داری کا حق ادا نہیں کرتے ان کا حق ادا نہ کیا جائے؛ بلکہ آپؐ نے فرمایا:

”بدلہ چکانے والا صلہ رحمی کرنے والا نہیں، صلہ رحمی کرنے والا وہ ہے کہ جب اس سے رشتہ داری توڑی جائے تب بھی وہ صلہ رحمی کرے“ (بخاری: باب لیس الواصل بالمکافئ، حدیث نمبر: 5991)

اس کے برخلاف شریعت میں قطع رحمی، یعنی رشتوں کو کاٹنے کی سخت مذمت کی گئی ہے، ابھی اوپر آپ نے پڑھا کہ اللہ تعالیٰ رحم کو مخاطب کرکے فرماتا ہے، جو تجھے کاٹے گا میں اسے کاٹوں گا اور جو اللہ سے کٹ جائے اسے پھر اور کس خیر کی امید ہوسکتی ہے، ایک حدیث میں حضورؐ نے فرمایا:

”بغاوت اور قطع رحمی سے بڑھ کر کوئی گناہ اس لائق نہیں کہ آخرت میں اس کی متعین سزاؤں کے علاوہ اس کو دنیا میں بھی فورا سزا دے دی جائے“

ایک حدیث میں ایسے شخص کی سزا یہ سنائی گئی ہے کہ

”بنی آدم کے اعمال ہر جمعرات یعنی جمعہ کی رات کو پیش ہوتے ہیں، چنانچہ قطع رحمی کرنے والے کا عمل قبول نہیں کیا جاتا“(مسند احمد، حدیث نمبر:10272)

ایک حدیث میں یہ بھی ہے کہ

”قطع رحمی کرنے والے جنت میں داخل نہ ہو گا“(بخاری: باب إثم القاطع، حدیث نمبر:5984)

صلہ رحمی یعنی قرابت داری کا حق ادا کرنے کی درج ذیل شکلیں ہو سکتی ہیں:

12.7.3 مالی تعاون

قرآن مجید میں سب سے زیادہ تاکید رشتے داروں پر خرچ کرنے کے سلسلے میں کی گئی ہے فرمایا گیا:

”آپ سے سوال کرتے ہیں کہ کیا خرچ کریں، فرمادیجئے کہ جو مال بھی خرچ کریں وہ والدین، رشتہ داروں، یتیموں اور غریبوں کے لئے“(البقرۃ:215)

ایک جگہ فرمایا گیا:”تو قرابتدار کو اس کا حق ادا کر“(الروم: 38) گویا یہ احسان نہیں؛ بلکہ اس کا حق ہے، ایک جگہ اللہ تعالیٰ نے عدل واحسان کے حکم کے بعد اپنا تیسرا خاص حکم بتایا کہ

”رشتہ داروں پر خرچ کرو، بے شک اللہ تعالیٰ عدل واحسان اور قرابت داروں کو دینے کا حکم دیتا ہے“(النحل:90)

ایک جگہ یہ ہدایت دی گئی کہ امیر رشتہ دار غریب رشتہ دار پر اپنی بخشش کا سلسلہ ختم نہ کرے اگرچہ اس سے کوئی قصور سرزد ہو گیا ہو، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

”اور تم میں سے مال ودولت میں وسعت والے لوگ یہ قسم نہ کھائیں کہ وہ رشتہ داروں اور مسکینوں اور اللہ کی راہ میں ہجرت کرنے والوں کو نہ دیں گے بلکہ معاف کر دیں اور درگذر کر دیں“(النور:122)

اس آیت میں مالی امداد کی ترغیب کے ساتھ ساتھ رشتہ داوں کے ساتھ عفوودرگذر کا معاملہ کرنے کی بھی تعلیم دی گئی ہے۔

مالی امداد میں ان کو تحفہ تحائف پیش کرنا، ضرورت پر ان کو قرض دینا، حتیٰ کہ ان کو صدقات اور زکوۃ دینا سب کچھ شامل ہے، زکوۃ دینے میں بھی غریب مستحق زکوۃ رشتہ داروں کو دوسرے پر مقدم رکھنا چاہیے، حضورؐ نے فرمایا:

”مسکین پر صدقہ کرنا ایک اجر کا سبب ہے اور رشتہ داروں کو صدقہ دینا دوہرے اجر کا سبب ہوتا ہے، ایک صدقہ کا ثواب اور دوسرے صلہ رحمی کا“(مسند أحمد، حدیث نمبر:16226)

فقہاء نے ان رشتہ داروں میں ترتیب یہ بیان کی ہے کہ بھائی ‘ بہن ‘ پھر ان کی اولاد پھر چچا اور پھوپھی ‘ پھر ماموں اور خالہ زکوہ کے زیاہ حقدار ہیں ‘ اس کے بعد رشتہ داروں کا حق ہے۔

13.3.3 حق وراثت

مشرکین عرب کا طریقہ یہ تھا کہ جب کوئی مر جاتا تو اس کی بڑی اولاد کو اس کا مال مل جاتا، چھوٹی اولاد محروم کر دی جاتی، اسی طرح عورتوں کا وراثت میں کوئی حصہ مقرر نہ تھا، اسلام نے اس طریقہ کو انصاف کے خلاف قرار دیا، اور قرآن مجید میں یہ حکم نازل ہوا:

”اس مال میں سے مردوں کا حصہ ہے جو والدین اور رشتہ دار چھوڑ کر فوت ہو جائیں، اور اسی طرح عورتوں کا حصہ ہے جو ان کے والدین اور رشتہ دار چھوڑ جائیں، تھوڑا ہو یا زیادہ، یہ حصہ مقرر ہے“ (النساء:7)

دوسرے حقوق کی طرح وراثت کے معاملہ میں بھی درجہ بندی کی گئی ہے اور یہ اصول رکھا گیا ہے کہ قریبی رشتہ دار کی موجودگی میں دور کے رشتہ داروں کو وراثت میں حصہ نہیں مل پائے گا، اور اس کی تفصیل اس طرح ہے کہ سب سے پہلے ان رشتہ داروں کو وراثت میں حصہ دیا جاتا ہے جن کے متعینہ حصے قرآن مجید، حدیث رسول یا اجماع امت سے ثابت ہیں اور ان کو ”اصحاب فروض“ کہتے ہیں، ان میں چار مرد: (1) باپ (2) دادا اور پر تک (3) شوہر (4) اخیافی بھائی ہیں، اور آٹھ عورتیں: (1) اخیافی بہن (2) بیوی (3) بیٹی (4) پوتی (5) حقیقی بہن (6) علاتی بہن (7) ماں (7) دادی، نانی شامل ہیں، ان کے بعد ان رشتہ داروں کی باری آتی ہے جن کو قرآن وحدیث میں ترکہ کا مستحق تو قرار دیا گیا ہے لیکن ان کے حصے متعین نہیں کئے گئے ہیں اور جن کو ”عصبات“ کہتے ہیں، بلکہ اصحاب فروض کے معین حصے دینے کے بعد جو کچھ بچتا ہے اس کے وہ مستحق ہوتے ہیں، اور اصحاب فروض کی غیر موجودگی میں پورے ترکہ کے وارث قرار پاتے ہیں، ان کی بھی تین قسمیں ہیں (1) عصبہ بنفسہ (2) عصبہ بغیرہ (3) عصبہ مع غیرہ۔

(1) عصبہ بنفسہ سے مراد وہ مرد ہے جس کی میت سے قرابت میں عورت واسطہ نہ ہو، پھر اس عصبہ بنفسہ کے چار درجات ہیں:۔

(الف) میت کی اولاد ذکور یعنی بیٹا، پوتا، پرپوتا، نیچے تک

(ب) میت کے باپ، دادا، پردادا، اوپر تک

(ج) میت کے باپ کی اولاد ذکور یعنی بھائی، بھائی کا بیٹا، پوتا، نیچے تک

(د) میت کے دادا (اوپر تک) کی اولاد ذکور جیسے چچا اور اس کی اولاد (نیچے تک) یا اسی طرح میت کے باپ کا چچا اور اس چچا کی اولاد ذکور، یا میت کے دادا کا چچا اور اس چچا کی اولاد ذکور۔

(2) عصبہ بغیرہ سے مراد نصف اور دو تہائی پانے والی وہ چار اصحاب فروض عورتیں ہیں جو اپنے اپنے بھائیوں کے ساتھ عصبہ ہو کر بھائی کا نصف پاتی ہیں، یعنی بیٹی، پوتی، حقیقی بہن، علاتی بہن۔

(3) عصبہ مع غیرہ سے مراد میت کی حقیقی یا علاتی بہنیں ہیں جو میت کی بیٹی، پوتی کے ساتھ عصبہ ہو جاتی ہیں، مذکورہ بالا تینوں

قسموں کے عصبات میں سے قریب تر عصبہ کی موجودگی میں دور کا عصبہ اور دوہرے رشتہ والے عصبہ کی موجودگی میں اکہرے رشتہ کا عصبہ محروم ہو جائے گا۔

اس کے بعد ذوی الارحام کی باری آتی ہے، یہ وہ لوگ ہیں جو نہ تو اصحاب فروض میں ہیں نہ عصبہ میں، عصبات کی طرح ذوی الارحام کے بھی ترتیب وار چار درجات ہیں:

(1) میت کے وہ فروع جو اصحاب فروض یا عصبہ نہ ہوں جیسے نواسہ و نواسی، بیٹے و پوتے کے نواسے و نواسی

(2) میت کے وہ اصول (باپ دادا اوپر تک) جو اصحاب فروض یا عصبہ نہ ہوں مثلاً نانا، پرنانا، میت کی ماں کا نانا، دادا اور دادی، نانی۔

(3) میت کے بھائی بہن کی وہ اولاد جو اصحاب فروض یا عصبہ نہ ہوں مثلا بھانجہ، بھانجی، بھتیجی اور پھر ان کی اولاد، اسی طرح اخیافی بھائی بہن کی اولاد

(4) میت کے دادا، دادی، نانا، نانی کی وہ اولاد جو ذوی الفروض اور عصبہ نہ ہوں مثلاً پھوپھی، خالہ، ماموں، اخیافی چچا اور ان کی اولاد۔

عصبات کی طرح ذوی الارحام میں بھی اوپر کے درجہ کے ذوی الارحام کی موجودگی میں نیچے درجہ کے ذوی الارحام محروم ہوں گے۔

آپ اس تھوڑی سی تفصیل سے یہ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ اسلامی شریعت میں کتنی وضاحت کے ساتھ وراثت کا قانون ذکر کیا گیا ہے، اس سے ہمیں رشتہ داروں کی اہمیت بھی معلوم ہوتی ہے کہ مرنے کے بعد بھی میت کے مال میں ان کا حصہ متعین ہے، اسی طرح رشتہ داروں کے درمیان مراتب کا فرق بھی معلوم ہوتا ہے۔

13.3.4 دیگر حقوق

صلہ رحمی کا مطلب ہی یہی ہے کہ رشتہ داروں کو اپنے حسن سلوک، اچھے اخلاق، مالی تعاون وغیرہ میں خصوصی طور پر شامل رکھا جائے، بلکہ ان کو دوسروں پر مقدم رکھا جائے، علماء نے بعض اہم حقوق کی وضاحت بھی کی ہے: ابن ابی حمزہ کہتے ہیں: صلہ رحمی ضرورت کے وقت مال سے بھی ہو سکتی ہے، مصیبت کے وقت میں ہر قسم کی مدد سے بھی ہو سکتی ہے، اور عام حالات میں رشتہ داروں سے خندہ پیشانی سے ملنا اور ان کے لئے دعائے خیر کرنا بھی صلہ رحمی میں داخل ہے، امام قرطبی فرماتے ہیں: آپسی محبت، رواداری، خیر خواہی عدل وانصاف، رشتہ داروں سے متعلق واجب اور مستحب فرائض کی ادائیگی، ان پر خرچ کرنا، ان کی خبر گیری رکھنا، اور ان کی غلطیوں کو معاف کرنا، یہ ساری چیزیں صلہ رحمی کے لئے ضروری ہیں، اس کے علاوہ بھی بعض اور حقوق اس میں آتے ہیں، مثلاً گاہے گاہے ان سے ملاقات کا اہتمام، ایک ہی جگہ رہتے ہوں تو سلام میں پہل، محبت کا اظہار، ان کی ضیافت، ان کی دعوت قبول کرنا، ان کے آپسی تنازعات کو حل کرنے کی کوشش، اور ان سب سے بڑھ کر ان کو بھلائی کا حکم دینا اور برائی سے روکنا؛ اسی لئے حضورؐ کو سب سے پہلے اپنے رشتہ داروں کو ڈرانے کا حکم دیا

گیا(الشعراء:214)اور اس پر عمل کرتے ہوئے حضورؐ نے اپنے قریب ترین رشتہ داروں سے ہر ایک کا نام لے لے کر کہہ دیا کہ اپنے آپ کو جہنم کی آگ سے بچالو، اور یہ بھی بتادیا کہ اگر تم نے اپنی اصلاح نہ کی تو میں تمہارے کسی کام نہ آؤں گا۔

خلاصہ یہ کہ رشتہ داروں تک ہر خیر کے پہنچانے اور برائیوں سے ان کو دور رکھنے کی حتی الامکان کوشش سے صلہ رحمی کا حق ادا کیا جاسکتا ہے۔

13.4 اکتسابی نتائج

اس اکائی میں آپ نے درج ذیل نکات سیکھے:

- زوجین کے حقوق کی تین جہتیں ہیں: (1) مشترکہ حقوق: جن میں حسن معاشرت، زینت اختیار کرنا، عبادت اور دینی کاموں میں تعاون باہمی، حق مباشرت اور میراث پانا داخل ہیں۔ (2) شوہر پر بیوی کے حقوق: جن میں مہر، نفقہ ورہائش اور عدل وغیرہ شامل ہیں۔ (3) بیوی پر شوہر کے حقوق: جن میں شوہر کی اطاعت اور گھر بار اور عزت وآبرو کی حفاظت داخل ہے۔
- اسلام نے رشتہ داروں کے ساتھ حسن سلوک کا بار بار حکم دیا گیا ہے، حضورا نے فرمایا: جو اللہ اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتا ہو اس کو چاہئے کہ صلہ رحمی کرے، قرآن مجید نے رشتہ داروں کے مالی تعاون کی بڑی تاکید کی ہے، رشتہ داروں کو وراثت میں بھی حق دیا گیا ہے؛ البتہ اصول یہ ہے کہ قریبی رشتہ دار کی موجودگی میں دور کے رشتہ داروں کو وراثت میں حصہ نہیں ملتا، خندہ پیشانی کے ساتھ رشتہ داروں سے ملنا اور ان کے لئے دعاء خیر کرنا بھی صلہ رحمی میں داخل ہے۔

13.5 کلیدی الفاظ

ازدواجی : نکاح سے متعلق۔

قرابت دار : رشتہ دار۔

متنوع : قسم قسم کا۔

توازن : دو چیزوں کا باہم ہم وزن ہونا۔

ضمانت لینا : ذمہ داری لینا۔

قصاص : خون کا عوض خون۔

جنین کُشی : پیٹ کے بچہ کو مار ڈالنا۔

جبر واکراہ : زور وزبردستی۔

کفارہ : شریعت میں گناہ یا خطا کا مقررہ عوض۔

کسب معاش : مال کمانا۔

شیر خوارگی : دودھ پینے کی عمر۔

ہبہ : ہدیہ، عطا، بخشش۔

ذی حیات : جاندار۔

13.6 نمونہ امتحانی سوالات

13.6.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات

1. اگر شوہر صاحب اولاد ہو تو بیوی کو اس کی چھوڑی ہوئی جائیداد کا کتنا حصہ ملے گا؟

(a). آٹھواں (b). چوتھائی (c). نصف (d). کچھ بھی نہیں

2. مرد پر عورت کے لیے عقد نکاح ہونے کی صورت میں کیا واجب ہوتا ہے؟

(a). مہر (b). گھر (c). گاڑی (d). سبھی

3. متعینہ حصے جو قرآن، حدیث اور اجماع امت سے ثابت ہیں ان کو کیا کہا جاتا ہے؟

(a). اصحاب فروض (b). عصبات (c). دونوں صحیح

4. قرآن وحدیث میں ترکہ کا مستحق تو قرار دیا گیا ہے لیکن ان کے حصے متعین نہیں ہیں ان کو کیا کہا جاتا ہے؟

(a). عصبات (b). اصحاب فروض (c). دونوں غلط

5. عربی میں قرابت داروں کے لیے کون سا لفظ استعمال ہوتا ہے؟

(a). اقارب (b). ذوی الارحام (c). اولوالارحام (d). سب صحیح

13.6.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات

1. میاں بیوی کے باہمی حسن معاشرت پر روشنی ڈالیے۔
2. دیگر حقوق پر اپنی معلومات قلم بند کیجیے۔
3. صلہ رحمی کی فضیلت پر روشنی ڈالیے۔
4. شوہر پر بیوں کے حقوق کا جائزہ لیجیے۔
5. بیوی پر شوہر کے حقوق کو بیان کیجیے۔

13.6.3 طویل جوابات کے حامل سوالات

1. شوہر پر بیوی کے کیا حقوق ہیں؟ وضاحت سے لکھیے۔
2. قرابت داروں کے حقوق کا جائزہ لیجیے۔
3. رشتہ داروں کے حق وراثت کو وضاحت کے ساتھ بیان کیجیے۔

13.7 تجویز کردہ اکتسابی مواد

---

1. سیرۃ النبی اجلد ششم (اردو) : علامہ سید سلیمان ندویؒ
2. حقوق العباد (اردو) : عالم فقری
3. آداب زندگی (اردو) : مولانا یوسف اصلاحی
4. مجموعہ قوانین اسلامی (اردو) : مرتبہ: آل انڈیا مسلم پرسنل لاء بورڈ
5. قاموس الفقہ (اردو) : مولانا خالد سیف اللہ رحمانی

اکائی 14: حقوق العباد (پڑوسیوں اور جانوروں کے حقوق)

اکائی کے اجزا:

- 14.0 تمہید
- 14.1 مقاصد
- 14.2 پڑوسیوں کے حقوق
  - 14.2.1 پڑوسی کون ہے؟
  - 14.2.2 پڑوسیوں کا مقام اور ان کے ساتھ حسن سلوک
  - 14.2.3 پڑوسیوں کی عزت و ناموس کی حفاظت
  - 14.2.4 حق شُفعہ
  - 14.2.5 پڑوسی کے ساتھ حسن سلوک اچھائی کا معیار
- 14.3 جانوروں کے حقوق
  - 14.3.1 جانور اسلام کی نظر میں
  - 14.3.2 جانوروں کا نفقہ
  - 14.3.3 جانوروں کے آرام کا خیال
  - 14.3.4 جانوروں کو اذیت دینے کی ممانعت
  - 14.3.5 ذبح کے وقت آسانی برتنے کی ہدایت
- 14.4 کلیدی الفاظ
- 14.5 اکتسابی نتائج
- 14.6 نمونہ امتحانی سوالات
  - 14.6.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات

14.6.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات
14.6.3 طویل جوابات کے حامل سوالات
14.7 تجویز کردہ اکتسابی مواد

14.0 تمہید

اسلام نے پڑوسیوں کا بڑی اہمیت دی ہے، انسانی آغاز تہذیب ہی سے مل جل کر آبادیوں کی صورت میں رہنے کا عادی ہے۔ اس لیے گاؤں ہو یا شہر، گلی اور محلوں میں ایک دوسرے کے پاس رہنے والے کو ہمسایہ کہا جاتا ہے۔ اسلام نے یہ تعلیمات دی ہے کہ وہ جہاں بھی رہیں ایک دوسرے کے ساتھ بھلائی سے رہیں، خوشی و غم میں اپنے پاس رہنے والوں کا خیال کریں۔ اسلام نے ہمسایہ کے حقوق کو ادا کرنے کی بڑی تاکید کی ہے کیوں کہ پاس رہنے والوں میں جتنی محبت اور موانست رہے گی زندگی اتنی ہی خوشگوار رہے گی۔ اسی طرح سے اللہ نے بے شمار قسم کے جانور، درندے اور پرندے پیدا کیے ہیں۔ ان میں سے کچھ چرند اور پرند وہ ہیں جن سے انسان لطف اندوز ہوتا ہے اور ان کا انسانی سہولتوں میں بڑا عمل دخل ہے۔ ایسے جانوروں کو پالتو جانور کہا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ وہ جانور جو انسان کے دشمن ہیں اور انہیں درندے سے موسوم کیا جاتا ہے۔ ایسے جانور جو انسانوں کے لیے نفع بخش ہیں ان کو اسلام نے کچھ حقوق دیے ہیں تا کہ جانور کو تکلیف نہ پہنچ سکے۔

14.1 مقاصد

اس اکائی کا مقصد یہ ہے کہ آپ یہ جان سکیں کہ پڑوسیوں کے حقوق، حق شفعہ، جانوروں کے حقوق، جانوروں کے آرام کا خیال اور ان کو اذیت دینے کی ممانعت کے بارے میں آگاہی حاصل کر سکیں۔

14.2 پڑوسیوں کے حقوق

14.2.1 پڑوسی کون ہے؟

قرآن مجید میں فرمایا گیا:

”اور اللہ کی عبادت کرو، اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہراؤ، ماں باپ، رشتہ داروں، یتیموں، مسکینوں، قرابت داروں ہمسایہ، اجنبی ہمسایہ، پاس اٹھنے بیٹھنے والے مسافر اور غلام باندیوں کے ساتھ بہتر سلوک کرو“ (النساء:36)

اس آیت میں قرآن مجید نے تین قسمیں ذکر کی ہیں: .1 ”جارذی القربیٰ“ .2 ”جارالجنب“ .3 ”صاحب بالجنب“

”جارذی القربیٰ“ سے یا تو وہ پڑوسی مراد ہے جو مکان سے متصل ہو، اور اس کے مقابلہ ”جارالجنب“ سے وہ پڑوسی مراد ہے جو کچھ

فاصلے پر رہتا ہو، یا "جار ذی القربیٰ" سے ایسا پڑوسی مراد ہے جو رشتہ دار بھی ہو اور "جار الجنب" سے وہ پڑوسی جو پڑوس میں تو ہو رشتہ دار نہ ہو، "صاحب الجنب" یعنی وہ لوگ جو وقتی طور پر ساتھ رہتے ہوں، جیسے ایک سفر کے مسافر، ایک ہی تعلیمی ادارہ کے طلبا، ایک ہی کارخانہ کے ملازم، ایک ہی دفتر میں کام کرنے والے، ایک ہی کاروبار میں شراکت رکھنے والے لوگ وغیرہ۔

اسلام نے پڑوسیوں کے سلسلہ میں مسلم غیر مسلم، رشتہ داروں اور غیر رشتہ دار میں کوئی فرق نہیں رکھا، ہر ایک کے ساتھ یکساں سلوک کرنے کا حکم دیا ہے، ہاں اگر پڑوسیوں کی ایک دوسرے اعتبار سے درجہ بندی کی جائے تو اس طرح بھی ہو سکتی ہے کہ ایک پڑوسی صرف پڑوسی ہوتا ہے دوسرا پڑوسی پڑوسی ہونے کے ساتھ ساتھ مسلمان بھی ہوتا ہے، تیسرا پڑوسی پڑوسی اور مسلمان ہونے کے ساتھ ساتھ رشتہ دار بھی ہوتا ہے تو ظاہر ہے کہ جو حیثیت اس تیسرے کی ہوگی دوسرے کی نہیں اور جو دوسرے کی ہوگی وہ پہلے کی نہیں۔

امام بخاریؒ نے حضرت حسن بصریؒ سے نقل کیا ہے کہ:

"ان سے پڑوسی کے بارے میں پوچھا گیا کہ وہ کون لوگ ہیں؟ انہوں نے فرمایا: "چالیس گھر آگے، چالیس گھر پیچھے، چالیس گھر دائیں طرف اور چالیس گھر بائیں طرف" (الأدب المفرد: باب الأدنی فالأدنی من الجیران، حدیث نمبر: 159)

14.2.2 پڑوسیوں کا مقام اور ان کے ساتھ حسن سلوک

حضورؐ نے پڑوسیوں سے محبت اور ان کے اکرام کو ایمان کی علامت قرار دیا، ایک حدیث میں آپؐ نے فرمایا:

"جو شخص اللہ اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتا ہو وہ اپنے پڑوسی کو ایذا نہ دے" (بخاری: باب من کان یؤمن باللہ والیوم الآخر فلا یؤذ جارہ، حدیث نمبر: 6018)

ایک دوسری حدیث میں آپؐ نے اس کو اللہ سے قربت کا ذریعہ قرار دیا، فرمایا:

"اللہ کے نزدیک ساتھیوں میں بہتر وہ ہے جو اپنے ساتھی کے لئے بہتر ہو اور پڑوسیوں میں بہتر وہ ہے جو اپنے پڑوسی کے لئے بہتر ہو" (ترمذی: باب ماجاء فی حق الجوار، حدیث نمبر: 1944)

ایک حدیث میں آپؐ نے پڑوسیوں کو رشتہ داروں کے قریب قریب حسن سلوک اور حقوق کا مستحق قرار دیتے ہوئے فرمایا:

"مجھے جبرئیلؑ پڑوسی کے حقوق کے بارے میں تاکید کرتے رہے، یہاں تک کہ میں نے گمان کیا کہ وہ اسے وراثت میں شریک کر دیں گے" (بخاری: باب الوصاۃ بالجار، حدیث نمبر: 6015)

اس حدیث میں حضورؐ نے اس طرف اشارہ فرمایا کہ حضرت جبرئیلؑ اللہ کی طرف سے پڑوسیوں کے ساتھ حسن سلوک کے سلسلہ میں اس قدر تاکید فرماتے رہے کہ اب مجھے گمان ہو چلا تھا کہ کہیں ان کو رشتہ داروں کی طرح ترکہ کا وارث قرار دے دیا جائے گا، اگرچہ ایسا نہ ہوا، لیکن اس سے پڑوسیوں کی غیر معمولی اہمیت معلوم ہوتی ہے۔

پڑوسیوں کو اپنی زبان اور ہاتھ سے تکلیف نہ پہونچانا، ان کی خبر گیری کرنا، ان کی امداد کرنا، آڑے وقت ان کا ساتھ دینا، ان کو

تحائف پیش کرنا یہ ساری چیزیں پڑوسیوں کے ساتھ حسن سلوک میں داخل ہیں، سب سے زیادہ ضروری تو یہ ہے کہ ایک شخص اپنے پڑوسی کو اپنی شرارتوں سے محفوظ رکھے، حضورا نے فرمایا:

”خدا کی قسم! وہ مومن نہ ہوگا، خدا کی قسم وہ مومن نہ ہوگا، خدا کی قسم وہ مومن نہ ہوگا“، صحابہ ث نے پوچھا: کون یا رسول اللہ؟ آپ انے فرمایا: ”جس کا پڑوسی اس کی شرارتوں سے محفوظ نہیں“ (مسند أحمد، حدیث نمبر: 7878)

دوسرے یہ کہ اپنے پڑوسی کی ضروریات کا خیال رکھے، حضورؐ نے فرمایا:

”وہ شخص مؤمن نہیں جو خود پیٹ بھر کر کھائے اور اس کا پڑوسی بھوکا رہے“ (الأدب المفرد: باب لا یشبع دون جارہ، حدیث نمبر: 112)

حضورؐ نے حضرت ابوذر غفاریؓ کو نصیحت کرتے ہوئے فرمایا:

”اے ابوذر! جب شوربا پکایا کرو تو پانی بڑھا دو، اور اس سے اپنے پڑوسیوں کی کو بھی بھیجو“ (مسلم: باب الوصیة بالجار، حدیث نمبر: 205)

عام طور پر کھانے پینے کی چیزیں عورتیں ہی بھیجتی ہیں، اس لئے عورتوں سے فرمایا:

”اے مسلمان عورتو! تم میں کوئی پڑوسن اپنی پڑوسن کے لئے کسی چیز کو حقیر نہ سمجھے، اگرچہ بکری کی کُھر ہی کیوں نہ ہو“ (بخاری: کتاب الھبۃ وفضلھا، حدیث نمبر: 2566)

آپؐ نے تحفہ بھیجنے والی اور قبول کرنے والی دونوں عورتوں کے لئے نصیحت فرمائی کہ دونوں معمولی تحفہ کو حقیر نہ سمجھیں بلکہ بھیجنے والے کے جذبات کا احترام کرتے ہوئے قبول کرلیں۔

اگر تمام پڑوسیوں کے ساتھ ممکن نہ ہو تو کم از کم جن کا دروازہ سب سے قریب ہو اس کے ساتھ احسان کرنا چاہیے 'حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے ایک مرتبہ دریافت کیا:

”یا رسول اللہ! میرے دو پڑوسی ہیں تو میں ان میں سے کس کے پاس بھیجوں؟ فرمایا: ”جس کے گھر کا دروازہ تمہارے گھر سے زیادہ قریب ہو“ (بخاري: باب أي الجوار أقرب، حدیث نمبر: 2259)

اس طرح اگر دو گھروں کی درمیانی دیوار ایک ہو اور پڑوسی اس کا ایسا استعمال کرے کہ دوسرے پڑوسی کا معمولی نقصان ہو رہا ہو تو اسے برداشت کرنے کی تلقین کی گئی، ایک حدیث میں آپؐ نے فرمایا:

”کوئی شخص اپنے پڑوسی کو دیوار میں لکڑی گاڑنے سے منع نہ کرے“ (مسلم: باب غرز الخشب في جدار الجار، حدیث نمبر: 1609)

پڑوسی اگر غیر مسلم بھی ہو تو وہ ایک مسلمان کے حسن سلوک کا مستحق ہے:

”حضرت عبد اللہ بن عمروؓ نے ایک مرتبہ ایک بکری ذبح کی ان کے پڑوس میں ایک یہودی بھی رہتا تھا، انہوں نے گھر کے لوگوں

سے دریافت کیا کہ تم نے میرے یہودی پڑوسی کو بھی بھیجا؛ کیوں کہ میں نے رسول اللہ کو فرماتے ہوئے سنا ہے کہ مجھے جبرئیلؑ ہمسایہ کے ساتھ نیکی کرنے کی اتنی تاکید کرتے رہے کہ میں سمجھا کہ وہ اس کو پڑوسی کے ترکہ کا حقدار بنادیں گے“ [ابوداؤد: باب في حق الجوار، حدیث نمبر:5152]

پڑوسیوں کی نگہداشت اور ان کا خیال رکھنے کی اہمیت اس وقت اور زیادہ بڑھ جاتی ہے جب ان کے یہاں کوئی حادثہ پیش آیا ہو، جب حضورؐ کے چچازاد بھائی حضرت جعفر بن ابی طالبؓ کی شہادت ہوئی تو آپ نے فرمایا:

”جعفر کے گھر والوں کے لئے کھانا پکاؤ؛ چونکہ ان کے ساتھ ایسا واقعہ پیش آیا ہے کہ آج وہ کچھ کام نہیں کرسکے“ (ترمذی: باب ما جاء في الطعام یضع لاہل البیت، حدیث نمبر:998)

اسی لئے رشتہ داروں اور پڑوسیوں کو یہ ترغیب دی گئی ہے کہ وہ میت کے گھر والوں کے لئے کم از کم ایک دن ایک رات ان کے لئے کھانا پکائیں، اور اس کو مستحب کہا گیا ہے۔

14.2.3 پڑوسیوں کی عزت وناموس کی حفاظت

ایک پڑوسی دوسرے پڑوسی سے دن رات کی قربت کی وجہ سے خیر کی زیادہ امید رکھتا ہے، اور اپنے مال اور عزت کے سلسلے میں وہ اس پر اعتماد بھی کرتا ہے، اس لئے اگر اس کی جانب سے کوئی تکلیف دہ بات پیش آئے تو حضورؐ نے اسے دس برائیوں سے بڑھ کر قرار دیا ہے، آپؐ نے فرمایا:

”زنا حرام ہے، اللہ اور اس کے رسول نے اس کو حرام کہا ہے؛ لیکن دس بدکاریوں سے بڑھ کر بدکاری یہ ہے کہ کوئی اپنے پڑوسی کی بیوی سے بدکاری کرے، چوری حرام، اور اللہ اور اس کے رسول نے اس کو حرام کیا ہے، لیکن دس گھروں میں چوری کرنے سے بڑھ کر یہ ہے کہ کوئی اپنے پڑوسی کے گھر سے کچھ چرائے“ (الأدب المفرد: باب حق الجوار، حدیث نمبر:103)

14.2.4 حق شُفعہ

اگر کوئی شخص اپنا مکان یا اپنی زمین بیچتا ہے تو اسلامی ادب یہ ہے کہ سب سے پہلے اپنے اس ساتھی سے پوچھ لے جو اس مکان یا زمین میں اس کا شریک ہے، اگر کوئی شخص نہ ہو تو اس شخص سے معلوم کرے جو اس گھر یا مکان کے فوائد اور حقوق مثلاً راستہ، نالی وغیرہ میں اس کا شریک ہو، اور اگر ایسا بھی کوئی شخص نہ ہو تو اپنے پڑوسی سے معلوم کرلے، حضورؐ نے فرمایا:

”جس کے پاس کوئی زمین یا باغ ہو اسے اس وقت تک نہ بیچے جب تک اس کو اپنے شریک کے سامنے پیش نہ کرے“ (مسند أحمد، حدیث نمبر:14292)

اگر وہ کسی اور کو فروخت کرتا ہے تو ان تینوں حضرات میں سے ترتیب وار ایک کے بعد ایک کو حق ملتا ہے کہ جیسے ہی گھر یا زمین کی فروختگی کا اسے علم ہو وہ گھر بیچنے والے کے خلاف آواز اٹھائے اور قانونی چارہ جوئی کرے کہ میں اس فروخت شدہ جائیداد کو خریدنا چاہتا ہوں،

یہ حق شفعہ ہے، پڑوسی بھی ان میں سے ایک ہے، اس سے بھی پڑوسی کی اہمیت معلوم ہوتی ہے۔

14.2.5 پڑوسی کے ساتھ حسن سلوک اچھائی کا معیار

انسان کے اچھا ہونے کا معیار یہ ہے کہ اس کو اچھا کہے وہ شخص جو اس سے سب سے زیادہ قریب ہو، پڑوسی بھی قریب رہنے والوں میں ایک ہے:

”ایک دن صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے پوچھا کہ یارسول اللہ! ہمیں کیسے معلوم ہو کہ ہم اچھا کر رہے ہیں یا برا؟ فرمایا: ”جب اپنے پڑوسی کو تم اپنے بارے میں اچھا کہتے سنو تو تم سمجھو کہ اچھا کر رہے ہو اور جب برا کہتے ہوئے سنو تو تم سمجھو کہ برا کر رہے ہو“ (ابن ماجہ: باب الثناء الحسن، حدیث نمبر: 4228)

دو عورتیں تھیں جن میں سے ایک رات بھر نمازیں پڑھا کرتی تھی اور دن کو روزہ رکھتی، صدقہ و خیرات بھی کرتی؛ مگر زبان کی تیز تھی، زبان سے پڑوسیوں کو ستاتی تھی، لوگوں نے اس کا حال آپؐ سے پوچھا: آپؐ نے فرمایا:

”اس میں کوئی نیکی نہیں، اس کو جہنم ملے گی، پھر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے دوسری عورت کا حال سنایا جو صرف نماز پڑھ لیتی اور معمولی صدقہ دے دیتی، مگر کسی کو ستاتی نہ تھی، آپ نے فرمایا: ”عورت جنتی ہوگی“ (الأدب المفرد: باب لایؤذي جارہ، حدیث نمبر: 119)

14.3 جانوروں کے حقوق

14.3.1 جانور اسلام کی نظر میں

جانور اللہ کی نشانیوں میں سے ایک حیرت انگیز نشانی ہے، قرآن وحدیث میں جانور اور اس کے حقوق کے بارے میں بے شمار تعلیمات دی گئی ہیں، قرآن کریم کی بہت سی سورتوں کے نام مختلف جانوروں کے ناموں پر رکھے گئے ہیں، مثلا: سورہ بقرہ (گائے، بیل)، سورہ انعام (پالتو جانور)، سورہ نحل (شہد کی مکھی)، سورہ نمل (چیونٹی)، سورہ عنکبوت (جلاکی مکڑی)، سورہ فیل (ہاتھی)۔

اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں بڑے خوبصورت انداز میں جانوروں کے مقصد تخلیق کو بیان فرمایا ہے:

”وَالأَنْعَامَ خَلَقَهَا لَكُمْ فِيهَا دِفْءٌ وَمَنَافِعُ وَمِنْهَا تَأْكُلُونَ، وَلَكُمْ فِيهَا جَمَالٌ حِينَ تُرِيحُونَ وَحِينَ تَسْرَحُونَ، وَتَحْمِلُ أَثْقَالَكُمْ إِلَى بَلَدٍ لَّمْ تَكُونُواْ بَالِغِيهِ إِلاَّ بِشِقِّ الأَنفُسِ إِنَّ رَبَّكُمْ لَرَؤُوفٌ رَّحِيمٌ، وَالْخَيْلَ وَالْبِغَالَ وَالْحَمِيرَ لِتَرْكَبُوهَا وَزِينَةً وَيَخْلُقُ مَا لاَ تَعْلَمُونَ“ (النحل: 5-8)

(اس نے جانور پیدا کیے جن میں تمہارے لیے پوشاک بھی ہے اور خوراک بھی، اور طرح طرح کے دوسرے فائدے بھی، وہ تمہارے لیے بوجھ ڈھو کر ایسے ایسے مقامات تک لے جاتے ہیں جہاں تم سخت جانفشانی کے بغیر نہیں پہنچ سکتے، حقیقت یہ ہے کہ تمہارا رب بڑا ہی شفیق اور مہربان ہے، اس نے گھوڑے اور خچر اور گدھے پیدا کیے تا کہ تم ان پر سوار ہو اور وہ تمہاری زندگی کی رونق بنیں، وہ اور بہت سی

چیزیں تمہارے فائدے کے لیے پیدا کرتا ہے جن کا تمہیں علم تک نہیں ہے)

احادیث میں بھی بعض جانوروں کی غیر معمولی افادیت اور ان کی قابل تعریف عادتوں کی بنیاد پر ان کا خاص ذکر آیا ہے، مثلا: گھوڑوں کے بارے میں آپؐ نے فرمایا:

”گھوڑوں کی پیشانی سے قیامت تک کے لئے خیر کو وابستہ کر دیا گیا ہے“(بخاری: باب الخیل معقود بنواصیہا الخیر، حدیث نمبر: 2849)

بعض روایتوں میں اونٹ اور بکری کا اضافہ ہے اور وہ اس طرح کہ اونٹ اپنے مالک کے لئے باعثِ عزت ہے اور بکری برکت ہے۔ (الجامع الصغیر: باب الإبل عزلأہلہا، حدیث نمبر:4526)

ایک روایت میں مرغ کی تعریف کی گئی، آپؐ نے فرمایا:

”مرغ کو برا مت کہو؛ چونکہ وہ نماز کے لئے بیدار کرتا ہے“(ابو داؤد: باب ماجاء في الدیک والبہائم، حدیث نمبر: 5101)

اللہ تعالیٰ نے پرندوں کے بارے میں اپنی قدرت کا اظہار اس طرح فرمایا ہے:

”أَوَلَمْ يَرَوْا إِلَى الطَّيْرِ فَوْقَهُمْ صَافَّاتٍ وَيَقْبِضْنَ مَا يُمْسِكُهُنَّ إِلَّا الرَّحْمَنُ إِنَّهُ بِكُلِّ شَيْءٍ بَصِيرٌ“

(کیا یہ لوگ اپنے اوپر اڑنے والے پرندوں کو پر پھیلائے اور سکیڑتے نہیں دیکھتے؟ رحمن کے سوا کوئی نہیں جو انہیں تھامے ہوئے ہو، وہی ہر چیز کا نگہبان ہے“(الملک:19)

اوران جانوروں کی حیثیت اس طرح بھی بڑھادی کہ یہ اللہ کو سجدہ کرتے ہیں(الحج:18)، انسانوں کی طرح ان کی بھی امت ہے (الانعام:38)ان کا رزق بھی اللہ نے اپنے ذمہ لیا ہے۔ (العنکبوت:60)لیکن ان کو سلیقہ سکھایا کہ اللہ پر توکل کرتے ہیں اور اس کے بعد اسباب اختیار کرتے ہیں، حضورؐ نے فرمایا:

”اگر تم اللہ پر توکل کرنے لگو تو اللہ تعالیٰ تم کو اس طرح رزق دے جیسے پرندوں کو رزق دیتا ہے، صبح خالی پیٹ نکلتے ہیں اور شام میں سیر ہو کر (اپنے گھونسلوں میں) واپس آتے ہیں“(ابن ماجہ: باب التوکل والیقین، حدیث نمبر:4164)

چونکہ انسان کے سامنے جانور بے بس ہیں اس لئے یہ اندیشہ تھا کہ وہ ان پر ظلم کرے، اور ظلم کرنے والے کرتے بھی ہیں؛ اس لئے حضورؐ نے ان کے کچھ حقوق بیان فرمائے ہیں، ان میں چند درج ذیل ہیں:

14.3.2 جانوروں کا نفقہ

جو شخص پالتو جانور رکھتا ہو اس کی خوراک کا انتظام کرنا، اس پر واجب ہے، حضرت سہل بن حنظلہؓ کا بیان ہے کہ رسول اللہؐ ایک اونٹ کے پاس سے گذرے جس کی کمر اس کے پیٹ سے لگی ہوئی تھی، آپ انے فرمایا:

”ان بے زبان مویشیوں کے بارے میں اللہ سے ڈرو، اچھی حالت میں ان پر سواری کرو اور اچھی حالت میں ان کو کھاؤ“(اَبو داؤد:

باب مایؤمر بہ من القیام علی الدواب، حدیث نمبر:2548)

ایک روایت میں ہے کہ:

”ایک مرتبہ آپؐ ایک انصاری کے باغ میں گئے، اس میں ایک اونٹ تھا جو آپؐ کو دیکھ کر بلبلایا اور اس کی دونوں آنکھوں سے آنسو بہنے لگے، آپؐ اس کے پاس گئے اور اس کی کنپٹی پر ہاتھ پھیرا اور فرمایا:”یہ کس کا اونٹ ہے؟“ ایک انصاری نوجوان نے آکر کہا: یہ میرا ہے یارسول اللہؐ! آپؐ فرمایا:”اس جانور کے بارے میں جس کا خدا نے تم کو مالک بنایا ہے، خدا سے نہیں ڈرتے، اس نے مجھ سے شکایت کی کہ تم اس کو بھوکا رکھتے ہو اور اس سے مسلسل کام لیتے ہو“(ابوداؤد، حدیث نمبر:2549)

رسول اللہؐ نے ایک عورت کے بارے میں فرمایا:

”اس پر صرف اس لئے عذاب ہوا کہ اس نے ایک بلی کو باندھ دیا اور وہ بندھی بندھی بھوک سے مر گئی، وہ عورت نہ تو اس کو غذا دیتی تھی اور نہ اس کو چھوڑتی تھی کہ وہ خود زمینی کیڑوں سے اپنی غذا حاصل کرتی“(بخاری: باب مایقول بعد التکبیر، حدیث نمبر:745)

اس کے برخلاف حضورؐ نے ایک شخص کے ایک کتے کو پانی پلانے کے عمل کو اس کے لئے ذریعۂ نجات بتایا ہے۔

صحابہؓ نے دریافت کیا:

”کیا جانوروں کے ساتھ سلوک کرنے میں بھی ثواب ملتا ہے، آپؐ نے فرمایا:”ہر ذی حیات اور تر جگر رکھنے والے جانور (کی تکلیف دور کرنے میں) ثواب ہے“(بخاری: باب الآبار علی الطریق، حدیث نمبر:2466)

14.3.3 جانوروں کے آرام کا خیال

جانوروں کا ایک حق یہ ہے کہ ان سے کام لینے یا ان کی سواری کرنے کے بعد ان کو آرام کا وقت دیا جائے؛ چنانچہ حضورؐ نے ارشاد فرمایا:

”جب تم لوگ سرسبزی اور شادابی کے زمانہ میں سفر کرو تو اونٹوں کو زمین کی سرسبزی سے فائدہ پہنچاؤ اور جب قحط کے زمانہ میں سفر کرو تو اس کو تیزی کے ساتھ چلاؤ“(مسلم: باب مراعاۃ مصلحۃ الدواب، حدیث نمبر:178)

تاکہ قحط کی وجہ سے اس کو گھاس یا چارہ کی جو تکلیف راستہ میں ہوئی ہے، وہ اس سے جلد نجات پائے۔

14.3.4 جانوروں کو اذیت دینے کی ممانعت

جاہلیت میں ایک طریقہ یہ تھا کہ جانور کو کسی چیز سے باندھ کر اس پر نشانہ لگاتے تھے، حضورؐ نے اس قسم کے جانوروں کے گوشت کو ناجائز قرار دیا، اور عام حکم دیا کہ کسی ذی روح کو اس طرح نشانہ نہ بنایا جائے۔(ترمذی: باب ماجاء في کراہیۃ أکل المصبورۃ، حدیث نمبر: 1475) اس سے بے رحمانہ طریقہ یہ تھا کہ جب آپؐ مدینہ منورہ تشریف لائے تو لوگ اونٹ کے کوہان اور دنبہ کے دم کی چکتی کاٹ کر کھاتے تھے، رسول اللہؐ نے فرمایا:

”زندہ جانور سے جو حصہ کاٹ لیا جائے وہ مردار ہے، اسے نہ کھاؤ“ (ترمذی: باب ما جاء في قطع من الحي فهو ميت، حدیث نمبر: 1480)

جانوروں کو آپس میں لڑانے سے بھی آپ نے منع فرمایا:

”حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ رسول اللہؐ نے مویشیوں کو آپس میں لڑانے سے منع فرمایا ہے“ (ترمذی: باب ما جاء في كراهية التحريش، حدیث نمبر: 1708)

اسی طرح جانوروں کے منہ پر مارنے یا اس پر داغ دینے کی ممانعت فرمائی اور ایسا کرنے والے کو ملعون قرار دیا۔ (ابو داؤد: باب النهي عن الوسم في الوجه، حدیث نمبر: 2564)

14.3.5 ذبح کے وقت آسانی برتنے کی ہدایت

اسلام میں بلا ضرورت کسی جانور کو قتل کرنے سے سختی سے روکا گیا ہے (مستدرک حاکم) لیکن جن جانوروں کے شکار یا ذبح کی اجازت دی گئی ان کے شکار یا ذبح کرنے میں بھی ہر طرح کی نرمی برتنے کا حکم دیا گیا ہے، ایک حدیث میں آپؐ نے فرمایا:

”اللہ تعالیٰ نے ہر چیز پر احسان کرنا فرض کیا ہے، اس لئے جب کسی چیز کو جان سے ختم کرنا ہو تو اسے اچھے طریقے سے ختم کرو اور جب ذبح کرو تو اچھے طریقہ سے ذبح کرو اور تم اپنی چھری کو اچھی طرح تیز کر لیا کرو اور ذبیحہ کو آرام دیا کرو“ (مسلم: باب الأمر بإحسان الذبح، حدیث نمبر: 1955)

یہی وجہ ہے کہ اسلام میں جانوروں کو دانت سے کاٹ کر یا ناخن سے خراش دے کر ذبح کرنے سے منع کیا گیا؛ (نسائی: باب النهي عن الذبح بالظفر، حدیث نمبر: 4403) کیونکہ اس سے جانوروں کو تکلیف ہوگی۔

کسی جانور کو جلانے سے بھی آپؐ نے منع فرمایا، ایک مرتبہ چیونٹیوں کی ایک جگہ پر آپؐ کی نظر پڑی جس کو بعض لوگوں نے جلا دیا تھا، فرمایا:

”اس کو کس نے جلایا ہے؟ آپؐ کے ساتھیوں نے کہا: ہم نے، فرمایا: ”آگ کے ذریعہ عذاب دینے کا حق صرف آگ کے رب یعنی اللہ تعالیٰ کو ہی ہے“ (ابو داؤد: باب في كراهية حرق العدو بالنار، حدیث نمبر: 2673)

14.4 کلیدی الفاظ

اجنبی	:	جس سے جان پہچان نہ ہو، بیگانہ، ناواقف
متصل	:	ملا ہوا، نزدیک، پاس، قریب، برابر، ملنے والا
ذی حیات	:	جاندار

پوشاک : لباس، پہننے کے کپڑے

14.5 اکتسابی نتائج

اس اکائی میں آپ نے درج ذیل نکات سیکھے:

- اسلام نے پڑوسیوں کے کچھ حقوق رکھے ہیں، حضرت جبرئیلؑ پیغمبر اسلام کو پڑوسیوں کے ساتھ حسن سلوک کی خصوصی تاکید فرماتے تھے؛ حتی کہ ان کو گمان ہو چلا تھا کہ کہیں پڑوسیوں کو وراثت میں بھی حصہ نہ دے دیا جائے، پڑوسیوں کی عزت وناموس کی حفاظت کو بڑی اہمیت کے ساتھ بیان کیا گیا ہے، اس کو حق شفعہ بھی دیا گیا ہے، اور پڑوسی کے ساتھ حسن سلوک کو اچھائی کا معیار قرار دیا گیا۔
- جانور اللہ کی نشانیوں میں سے ایک حیرت انگیز نشانی ہے، قرآن وحدیث میں جانور اور اس کے حقوق کے بارے میں بے شمار تعلیمات دی گئی ہیں، قرآن کریم کی بہت سی سورتوں کے نام مختلف جانوروں کے ناموں پر رکھے گئے ہیں، مثلاً: سورہ بقرہ (گائے، بیل)، سورہ انعام (پالتو جانور)، سورہ نحل (شہد کی مکھی)، سورہ نمل (چیونٹی)، سورہ عنکبوت (جلا کی مکڑی)، سورہ فیل (ہاتھی)۔
- اسلام میں نہ صرف انسانوں کے بلکہ جانوروں کے حقوق بھی بیان کئے گئے ہیں، جن میں اہم ترین حقوق یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو جس مصرف کے لئے بنایا ہے، ان کو اسی میں استعمال کیا جائے، ان کے کھانے پینے اور ان کے آرام کا خیال رکھا جائے، ان کو اذیت دینے اور خاص طور سے آگ کے ذریعہ سے سزا دینے پر سخت وعید آئی ہے اور ان کے ذبح میں بھی آسانی برتنے کی ہدایت دی گئی ہے۔

14.6 نمونہ امتحانی سوالات

14.6.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات

1. مکان سے متصل پڑوسی کو کیا کہتے ہیں؟

(a). جارذی القربیٰ (b). جار الجنب (c). جارذی القربیٰ (d). سب صحیح

2. جار الجنب سے مراد کون پڑوسی ہے؟

(a). مکان سے متصل (b). کچھ فاصلے پر (c). رشتہ دار پڑوسی (d). سب غلط

3. ایسا پڑوسی جو رشتہ دار بھی ہو اسے کیا کہتے ہیں؟

(a). جارذی القربیٰ (b). جار الجنب (c). جارذی القربیٰ (d). سب صحیح

4. پڑوسی کس کو کہتے ہیں؟

(a). چالیس گھر آگے (b). چالیس پیچھے (c). چالیس گھر دائیں طرف (d). سب صحیح

5. پڑوسیوں کے ساتھ حسن سلوک میں کیا داخل ہیں؟

(a). خبر گیری کرنا (b). امداد کرنا (c). زبان سے تکلیف نہ پہونچانا (d). سب صحیح

6. جانور کے نام پر سورت کا نام بتائیں؟

(a). نمل (b). یوسف (c). آل عمران (d). سب صحیح

7. قرآن کی کون سی سورت جانوروں کے نام پر ہیں؟

(a). بقرہ (b). انعام (c). فیل (d). سب صحیح

8. آپؐ نے فرمایا: ”زندہ جانور سے جو حصہ کاٹ لیا جائے وہ مردار ہے اسے نہ کھاؤ“؟

(a). صحیح (b). غلط

9. آپؐ نے مویشیوں کو آپس میں لڑانے سے منع فرمایا ہے۔

(a). ہاں (b). نہیں

10. جانوروں کے منہ پر مارنے یا اس پر داغ دینے کی ممانعت فرمائی؟

(a). ہاں (b). نہیں

14.6.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات

1. پڑوسی کون ہے اس پر روشنی ڈالیے۔
2. جانوروں کے نفقہ پر مضمون لکھیے۔
3. جانوروں کو اذیت دینے کی ممانعت پر روشنی ڈالیے۔
4. جانور ذبح کرتے وقت آسانی برتنے کی ہدایات بیان کیجیے۔
5. پڑوسی کا مقام واضح کیجیے۔

14.6.3 طویل جوابات کے حامل سوالات

1. پڑوسیوں کا مقام اور ان کے ساتھ حسن سلوک کی اہمیت و فضیلت بیان کیجیے۔
2. جانوروں کے حقوق تفصیل سے بیان کیجیے۔
3. حقہ شفعہ پر اپنی معلومات قلم بند کیجیے۔

14.7 تجویز کردہ اکتسابی مواد

4. سیرۃ النبی اجلد ششم (اردو) : علامہ سید سلیمان ندویؒ
5. .حقوق العباد (اردو) : عالم فقری
6. .آداب زندگی (اردو) : مولانا یوسف اصلاحی
7. مجموعہ قوانین اسلامی (اردو) مرتبہ : آل انڈیا مسلم پرسنل لاء بورڈ
8. قاموس الفقہ (اردو) : مولانا خالد سیف اللہ رحمانی

اکائی 15: آداب زندگی (حصہ اول)

اکائی کے اجزا:

15.0 تمہید

15.1 مقاصد

15.2 اخلاق

- 15.2.1 اخلاق کا مفہوم
- 15.2.2 اخلاق کی اہمیت
- 15.2.3 اسلامی اخلاق کی خصوصیات

15.3 باہمی تعاون

- 15.3.1 باہمی تعاون کا مفہوم
- 15.3.2 باہمی تعاون کا بنیادی اصول اور اس کی وسعت
- 15.3.3 انسانی بنیاد پر تعاون
- 15.3.4 ایمانی بنیاد پر تعاون
- 15.3.5 خانگی بنیاد پر تعاون

15.4 اکتسابی نتائج

15.5 کلیدی الفاظ

15.6 نمونہ امتحانی سوالات

- 15.6.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات
- 15.6.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات
- 15.6.3 طویل جوابات کے حامل سوالات

15.7 تجویز کردہ اکتسابی مواد

15.0 تمہید

اسلام نے انسانوں کو زندگی گذارنے کا ایک جامع اور مکمل دستور عطا کیا ہے، ہر شخص کو اپنی ذات کے ساتھ بھی انصاف کرنے کی تعلیم دی ہے اور معاشرہ کے دیگر افراد کے ساتھ بھی، اور اس کو ہر طرح کے انفرادی اور اجتماعی ظلم سے روک دیا ہے اور کامیاب زندگی گذارنے کے لئے اس کو کچھ آداب بتائے ہیں، ان میں اہم ترین آداب حسن اخلاق، باہمی تعاون، سچائی، امانت، نصح و خیر و خواہی اور خدمت خلق ہیں، اخلاق سے خوشی و مسرت اور امن و امان کی فضا ہموار ہوتی ہے، باہمی تعاون سے زندگی کے مسائل آسانی سے حل ہوتے ہیں۔

15.1 مقاصد

اس اکائی کے پڑھنے کے بعد آپ اس لائق ہو جائیں گے کہ اخلاق کا مفہوم، اس کی اقسام، اخلاق کی اہمیت اور اسلام میں اخلاق کی خصوصیات پر روشنی ڈال سکیں، اسی طرح اس اکائی میں آپ کو باہمی تعاون کے مفہوم، اس کے فوائد، اور اس کی بنیاد سے واقف کرایا جائے گا۔

15.2 اخلاق

15.2.1 اخلاق کا مفہوم

اخلاق عربی زبان کا لفظ ہے، یہ خُلُق کی جمع ہیں، جس کے معنی عادت اور فطرت کے ہوتے ہیں، اہل علم کے مطابق اخلاق انسان کی باطنی صورت کو کہتے ہیں، چونکہ انسان کی دو صورتیں ہیں، ایک ظاہری صورت اور اس سے مراد وہ شکل ہے جس پر اللہ تعالیٰ نے انسان کو پیدا فرمایا ہے، ظاہری شکل و صورت اچھی بھی ہو سکتی ہے بُری بھی، اسی طرح ایک باطنی صورت ہے، اور اس سے مراد نفس کی وہ حالت ہے جس سے بلا تکلف اچھے اور بُرے افعال صادر ہوتے ہیں، امام راغب اصفہانی نے لکھا ہے: خَلق ظاہری صورت کو کہتے ہیں جس کو قوت بصارت سے پرکھا جاتا ہے، اور خُلق باطنی صورت کو کہتے ہیں جس کو جاننے کے لئے قوت بصیرت کی ضرورت ہے۔

انسان کے اندر خیر و شر دونوں طرح کی صلاحیتیں رکھی گئی ہیں، اس سے ظاہر ہونے والے اخلاق بھی دونوں طرح کے ہوتے ہیں، اگر یہ اخلاق اچھے ہوں تو ان کو "اخلاق حسنہ" یا "فضائل" کہتے ہیں اور اگر بُرے ہوں تو "اخلاق سیئہ" یا "رذائل" کہتے ہیں، پھر یہ فضائل یا رذائل کسی کے اندر فطری طور پر ہوتے ہیں جیسا کہ حضورؐ نے حضرت اشج بن قیسؓ سے فرمایا:

"تمہارے اندر دو عادتیں ایسی ہیں جو اللہ کو پسند ہیں: بردباری اور صبر و انتظار"، انہوں نے کہا: یا رسول اللہؐ! کیا یہ دونوں اخلاق میں نے اپنے اندر پیدا کئے ہیں یا اللہ تعالیٰ نے ان کو میری فطرت میں رکھ دیا ہے؟ آپ نے فرمایا: "بلکہ یہ دونوں اخلاق اللہ تعالیٰ نے تمہارے

اندر فطری طور پر رکھے ہیں"، وہ بول اٹھے: ساری تعریفیں اس اللہ کے لئے جس نے میرے اندر فطری طور پر دو ایسے اخلاق رکھ دیئے جو اللہ اور اس کے رسول کو پسند ہیں" (أبو داؤد، باب في قبلة الرجل، حدیث نمبر:5225)

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اخلاق فطری بھی ہوتے ہیں، اور انہیں محنت اور توجہ سے انسان اپنے اندر پیدا بھی کرتا ہے۔

اسلام کی اخلاقی تعلیم کا ایک امتیاز یہ ہے کہ اس نے صرف فضائل کو اختیار کرنے کی تعلیم نہیں دی بلکہ رذائل سے اجتناب کی بھی تاکید کی ہے۔

15.2.2 اخلاق کی اہمیت

اسلام میں حسن اخلاق کو ایمان کے مکمل ہونے کا معیار قرار دیا گیا ہے، گویا یہی وہ پھل ہے جس سے ایمان کے درخت کی پہچان ہوتی ہے، آپؐ نے فرمایا:

"مسلمانوں میں کامل ایمان اس کا ہے جس کے اخلاق سب سے اچھے ہیں" (ترمذی، باب ما جاء في حق المرأة على زوجها، حدیث نمبر: 1162)

قرآن مجید میں کامیاب ایمان والوں کی جو صفات ذکر کی گئیں ہیں، ان میں بھی اخلاق کی بعض قسموں کو خصوصیت سے ذکر کیا گیا ہے، ان کے علاوہ کثرت سے ایسی حدیثیں ہیں جن میں حضورؐ نے یہ ارشاد فرمایا ہے کہ فلاں فلاں اوصاف واخلاق ایمان کی خصوصیات میں سے ہے، مثلاً آپؐ نے فرمایا:

"ایمان کی ستر سے کچھ اوپر شاخیں ہیں، جن میں سے ایک حیا ہے" (بخاری: باب أمور الإيمان، حدیث نمبر:9)

ایک حدیث میں فرمایا:

"جس میں تین باتیں ہوں اُس نے ایمان کا مزہ پایا! جس کو خدا اور اس کے رسول سے محبت ہو، جو دوسرے سے صرف خدا کے لئے محبت کرے، اور جس کو ایمان کے بعد پھر کفر میں مبتلا ہو جانے سے اتنا ہی دکھ ہو جتنا آگ میں ڈالے جانے سے" (بخاري: باب حلاوة الإيمان، حدیث نمبر:16)

ایک شخص نے پوچھا یا رسول اللہ! کونسا اسلام سب سے بہتر ہے؟ فرمایا:

"(بھوکوں کو) کھانا کھلانا، اور جانے انجانے ہر ایک کو سلام کرنا" (بخاري: باب إطعام من الإسلام، حدیث نمبر:12)

ایک حدیث میں فرمایا:

"مسلمان وہ ہے جس کے ہاتھ اور زبان سے مسلمان سلامت رہے، اور مومن وہ ہے جس پر لوگ اتنا بھروسہ کریں کہ اپنی جان و مال اس کی امانت میں دے دیں" (ترمذي: باب ما جاء في أن المسلم من سلم المسلمون من لسانه ويده، حدیث نمبر:2627)

یہ اور اس طرح کی بے شمار حدیثیں ہیں جو بتاتی ہیں کہ اخلاق کا ایمان سے راست تعلق ہے، اسی لئے آپؐ نے فرمایا:

”بے ایمان (منافق) کی پہچان تین ہے، بولے تو جھوٹ بولے، وعدہ کرے تو وعدہ خلافی کرے، اس کو امانت سپرد کی جائے تو خیانت کرے“ (بخاري: باب علامة المنافق، حدیث نمبر: 33)

اسلام میں نماز اور روزہ کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا، لیکن اچھے اخلاق کو بھی کبھی نماز پڑھنے والوں اور روزہ رکھنے والوں کا درجہ حاصل ہو جاتا ہے، حضورؐ نے فرمایا:

”انسان حسن اخلاق سے اس شخص کا درجہ پاسکتا ہے جو دن بھر روزہ رکھے اور رات بھر عبادت کرے“ (أبو داؤد: باب في حسن الخلق، حدیث نمبر: 4798)

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلام میں اخلاق بھی عبادت ہے، اسلام میں اخلاق ہی وہ معیار ہے جس سے باہم انسانوں میں درجہ اور رتبہ کا فرق نمایاں ہوتا ہے، رسول اللہؐ نے فرمایا:

”تم میں سے اچھا وہ ہے جس کے اخلاق سب سے اچھے ہوں“ (بخاری: باب صفة النبي ا، حدیث نمبر: 3559)

ایک حدیث میں آپؐ نے یہاں تک فرمایا:

”(قیامت کی) ترازو میں حسن اخلاق سے زیادہ بھاری کوئی چیز نہ ہوگی“ (أبو داؤد، باب في حسن الخلق، حدیث نمبر: 4799)

ایک حدیث میں ہے:

”اللہ کے بندوں میں اللہ کا سب سے پیارا وہ ہے جس کے اخلاق سب سے اچھے ہوں“ (معجم کبیر للطبرانی، باب ما جاء في التداوی، حدیث نمبر: 471)

اس سے معلوم ہوا کہ حسن اخلاق خدا کی محبت کا ذریعہ ہے، اور درحقیقت رسول کی محبت کا ذریعہ بھی یہی ہے، فرمایا:

”تم میں میرے سب سے محبوب اور آخرت میں مجھ سے سب سے نزدیک وہ ہیں جو تم میں سب سے اچھے اخلاق والے ہیں اور مجھے ناپسند اور آخرت میں مجھ سے دور وہ ہوں گے جو تم میں بکواس کرنے والے، بدگو اور منکر بد اخلاق (ہیں)“

اسلام نے اخلاق حسنہ کا اس سے بھی ایک اور بلند تصور پیش کیا ہے اور وہ یہ کہ اخلاق حسنہ دراصل اللہ تعالی کی صفات کا سایہ ہیں، اور اس کی کامل صفات کے ادنی مظاہر ہیں، آپؐ نے فرمایا:

”حسن اخلاق اللہ تعالیٰ کا خلق عظیم ہے“ (المعجم الأوسط للطبرانی، حدیث نمبر: 8344)

15.2.3 اسلامی اخلاق کی خصوصیات

اسلام کی اخلاقی تعلیمات کا مطالعہ بتاتا ہے کہ ان کے بعض پہلو وہ ہیں جن کی طرف کسی آسمانی شریعت میں یا کسی قانون میں رہنمائی نہیں کی گئی، اسلام نے جس طرح عقائد اور عبادات کی چھوٹی بڑی تفصیل بیان کی ہے، اخلاق کے سلسلہ میں بھی اس کی تعلیمات جامع اور مکمل ہیں، اور ان کی بہت سی خصوصیات ہیں جن میں چند درج ذیل ہیں:

1. اسلامی اخلاق کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اس کا سرچشمہ وحی الٰہی ہے، انسانی زندگی کا سب سے بلند مقصد اللہ تعالیٰ کو راضی کرنا ہے، اور جب ان اخلاقی تعلیمات کی تاکید اللہ اور اس کے رسولؐ کی طرف سے ہے تو گویا اللہ اور اس کے رسولؐ کی مراد اور ان کا منشا یہی ہے، انسان اگر ان کو عمل میں لے آئے تو اللہ کی خوشنودی کا حاصل ہونا یقینی ہو جاتا ہے، اور اس طرح یہ اخلاقی قدریں ہر شخص کے لئے قابل عمل ہوتی ہیں، اس کا تعلق کسی زمانہ اور کسی علاقہ سے بھی ہو، چونکہ یہ رہنمائی اس ذات کی طرف سے ہے جس نے خود انسان کو پیدا کیا، اور پیدا کرنے والے سے بڑھ کر مخلوق کی ضرورتوں، تقاضوں، اور نفسیات سے کوئی واقف نہیں ہو سکتا۔
2. اسلامی اخلاق کی حیثیت صرف نظریہ کی نہیں، سراپا عمل کی ہے، انسانی زندگی کو اس سے آراستہ کرنا اس کا سب سے بڑا مقصد ہے۔
3. اسلامی اخلاق کی تعلیمات میں انسان کو اس کی ذمہ داریوں کا احساس دلایا گیا ہے۔
4. اسلامی اخلاق کا تعلق صرف ظاہر سے نہیں؛ بلکہ اس میں نیت اور مقصد کو خصوصی اہمیت دی گئی ہے۔
5. اسلامی اخلاق کا تعلق زندگی کے تمام شعبوں سے ہے، عقیدہ سے اس کا تعلق اس طرح ہے کہ تمام اعمال عقیدہ کی ہی میزان پر تولے جاتے ہیں؛ اس لئے ایک مسلمان کا عقیدہ بھی اسے اچھے اخلاق کو اختیار کرنے اور برے اخلاق سے خود کو بچانے کی ترغیب دیتا ہے، اخلاق کا تعلق شریعت سے بھی ہے، اور شریعت احکام کے مجموعہ کو کہتے ہیں، معاملات، معاشرتی زندگی اور پرسنل لا کے احکام بھی اخلاق سے مربوط ہیں، اور اسلام ان شعبوں میں قانون سے زیادہ اخلاقی تعلیمات سے کام لیتا ہے۔
6. اسلامی اخلاق میں زندگی کے ہر شعبہ کی چھوٹی چھوٹی چیزوں کو شامل کر لیا گیا ہے، صرف اصولی ہدایات دینے پر اکتفا نہیں کیا گیا، سچ کی تعریف کے ساتھ ساتھ جھوٹ کی مذمت بھی کی گئی ہے، ایک کے فوائد تو دوسرے کے نقصانات بھی گنائے گئے ہیں، سخاوت کی ترغیب دی گئی تو بخل سے نفرت بھی دلائی گئی ہے، وعدوں کے پاس ولحاظ کا حکم دیا گیا تو وعدہ خلافی پر نکیر بھی کی گئی ہے، صرف یہ نہیں کہا گیا کہ نیکی کرو، اور نہ یہ کہ سب کے ساتھ نیکی کرو، بلکہ وضاحت کے ساتھ اس طرح رہنمائی کی گئی کہ والدین، رشتہ داروں، پڑوسیوں، مسافروں، مانگنے والوں، غریبوں، یتیموں، غلاموں اور قیدیوں سب کے ساتھ نیکی کرو، صرف قرآن مجید کا ذکر کیا جائے تو ان کی پندرہ سو سے زیادہ آیتیں اخلاقی تعلیمات پر مشتمل ہیں، یعنی ایک چوتھائی قرآن اخلاقیات سے تعلق رکھتا ہے، احادیث اس کے علاوہ ہیں، احادیث کے مختلف ابواب اور عنوانات دیکھے جائیں تو اندازہ ہوتا ہے کہ انسان کی اخلاقی حالات کا کوئی ایسا جزء نہ ہوگا جو داعی اسلام کی تلقین میں نہ آیا ہو، علامہ سید سلیمان ندویؒ نے صرف قرآن مجید کی اخلاقی تعلیمات کی فہرست میں سوا سو سے زائد اخلاقی تعلیمات کا ذکر کیا ہے اور صرف بخاری، ترمذی ابوداؤد سے ایک سو چالیس سے بھی زائد اخلاقی تعلیمات کو شمار کروایا ہے۔
7. ایسے اخلاق بھی بیان کئے گئے ہیں جن سے خود انسان کا اپنا ذاتی فائدہ ہے، جیسے مصیبتوں میں صبر، کاموں میں غور وفکر کی عادت،

کاموں کو اچھی طرح انجام دینا، کسی کام کو جلدی نہ کرنا وغیرہ اور ان اخلاق کی فہرست تو بہت طویل ہے جن کا فائدہ دوسروں کو پہونچتا ہے، اور حقوق العباد ادا ہوتے ہیں۔

8. اسلامی اخلاق عالمی نوعیت کے ہیں، یہ مسلمان اور غیر مسلم، عرب و عجم سب کے لئے ہیں، سودی معاملات مسلم و غیر مسلم سب کے ساتھ حرام، چوری، زنا اور ان جیسی برائیوں کا بھی یہی حال ہے، عدل مسلمان و غیر مسلم سب کے ساتھ واجب، ظلم مسلمان و غیر مسلم سب پر منع، اس طرح اسلامی اخلاق قبائلی، قومی اور مذہبی عصبیت سے پاک ہیں۔

9. اسلامی اخلاق کی ایک بڑی خصوصیت اس کا توازن اور اعتدال ہے، وہ افراط و تفریط سے پاک ہے، اس میں جسم کی بھی رعایت ہے، روح کا بھی خیال، اس میں دنیا اور آخرت دونوں کے تقاضوں کا لحاظ ہے، اچھے اخلاق حقوق اور فرائض کے درمیان تقسیم ہیں۔

اس کے علاوہ دیگر خصوصیات بھی ہیں جیسے فطرت انسانی کا لحاظ، افراد کے درمیان پائے جانے والے مزاج و مذاق اور صلاحیتوں کی رعایت کے اعتبار سے اخلاقی حکم، اسی طرح اخلاقیات کا مصلحتوں کے مطابق ہونا اور عام طور سے اخلاقی تعلیمات کے ساتھ ان کے فوائد کو بیان کرنے کا اہتمام وغیرہ۔

15.3 باہمی تعاون

15.3.1 باہمی تعاون کا مفہوم

تعاون عربی کے لفظ "عون" سے بنا ہے، جس کے معنی مددگار کے ہیں، اس سے اعانت مدد کرنے کے معنی میں ہے، اور اسی سے تعاون ہے جس کے معنی ایک دوسرے کی مدد کرنا ہے، شریعت میں بھی تعاون کے معنی یہی ہیں؛ لیکن شرط یہ ہے کہ یہ تعاون حق کے معاملہ میں ہو اور اللہ کی رضا کے لئے ہو، باطل کے معاملہ میں تعاون ظلم ہے، اس طرح اسلام میں تعاون کی اصطلاحی تعریف یہ ہو سکتی ہے کہ کار خیر، اللہ کی اطاعت اور گناہوں سے اجتناب میں ایک دوسرے کی مدد کرنا۔

15.3.2 باہمی تعاون کا بنیادی اصول اور اس کی وسعت

اسلام نے مختلف بنیادوں پر باہمی تعاون کی ترغیب دی ہے اور اس سلسلہ میں ایک اصول متعین کر دیا ہے، قرآن مجید کی آیت ہے:

"وَتَعَاوَنُوْا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوٰی وَلَا تَعَاوَنُوْا عَلَى الْإِثْمِ وَالْعُدْوَان" (المائدۃ:2)

(جو کام نیکی اور خدا ترسی کے ہیں ان میں سب سے تعاون کرو اور جو گناہ اور زیادتی کے کام ہیں ان میں کسی سے تعاون نہ کرو)۔

یہ آیت واضح کرتی ہے کہ باہمی تعاون اللہ کا حکم ہے اور اس کی دو بنیادیں ہیں، ایک "برّ" اور دوسری "تقویٰ"، برّ کے معنی نیکی، بھلائی اور ہر ایسا کام جس سے اللہ کے بندوں کو فائدہ پہنچتا ہو، ایک حدیث میں ہے:

”برّ خوش خلقی کا نام ہے“ (مسلم: باب تفسیر البر والإثم، حدیث نمبر: 2553)

اور تقویٰ کے معنی ہیں ایسا کام جس سے اللہ کی خوشنودی اور رضا حاصل ہوتی ہو، اگرچہ راست طور پر اس کا تعلق حقوق العباد سے نہ ہو، اس حکم سے یہ بات خود بخود سمجھ میں آرہی تھی کہ ایسے کاموں میں تعاون اسلام کے منشأ کے خلاف ہے، جن سے اللہ کے بندوں کو نقصان پہنچتا ہو اور وہ اللہ کو ناپسند ہو؛ لیکن تاکید اور مزید وضاحت کے لئے اللہ تعالیٰ نے یہ بھی فرمادیا کہ گناہ اور ظلم کے معاملہ میں کسی کا تعاون کرنا درست نہیں، گناہ کے لئے ”الإثم“ کا لفظ استعمال ہوا ہے جس کی تعریف حدیث میں یہ کی گئی ہے کہ:

”گناہ وہ ہے جو تمہارے دل میں کھٹکے اور تم یہ ناپسند کرو کہ لوگ تمہارے اس کام سے واقف ہوں“ (مسلم، حدیث نمبر: 2553)

اور ”عُدْوَان“ کے معنی دوسروں کی حق تلفی اور ظلم کے ہیں، جس طرح پہلے دونوں کاموں کا کرنا قابل تعریف ہے، ان میں دوسروں کا تعاون بھی شریعت کا حکم ہے، اس کے برخلاف دوسرے دونوں کاموں کا کرنا بھی ممنوع ہے، اور ان میں دوسروں کا تعاون بھی ناپسندیدہ اور قابل گرفت ہے، پہلی وحی کے بعد حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا نے جب آپؐ کو تسلی دی تھی اور یہ کہا تھا کہ اللہ تعالیٰ آپ کو ہرگز رسوا نہیں کرے گا اور اس کے بعد اس کی وجہ بیان کرتے ہوئے آپؐ کے چند اوصاف ذکر کئے تھے، تو ان میں ایک وصف یہ بھی ذکر کیا تھا کہ آپؐ حق کے معاملہ میں دوسروں کی مدد کرتے ہیں (بخاری: باب أول مابدئ بہ رسول اللہ، حدیث نمبر: 6982) اس سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ تعاون کی اصل بنیاد نیکی، بھلائی اور حق وصداقت ہے۔

اس آیت نے باہمی تعاون کا ایک وسیع تصور پیش کیا ہے، اگر خیر کا کوئی کام ہو تو خواہ وہ کام سماجی ہو یا معاشی، مذہبی ہو یا سیاسی، مسلمانوں کے تعاون کا مستحق ہے، تعاون کی ضرورت مسلمانوں کو ہو یا عام انسانوں کو، اپنوں کو ہو یا بیگانوں کو، تعاون کی ضرورت کسی انفرادی کام میں ہو یا اجتماعی کام میں۔

تعاون کے سلسلے میں یہ اصول بھی ذہن نشیں رہنا چاہئے کہ شریعت میں جو حکم اصل کام کا ہے وہی اس میں تعاون کا ہے، اگر وہ کام واجب ہے تو اس میں تعاون بھی واجب ہوگا اور اگر وہ کام مستحب ہے تو تعاون بھی مستحب ہوگا، حضورؐ نے فرمایا:

”خیر کی رہنمائی کرنے والا اس کارِ خیر کو انجام دینے والے کی طرح ہے“ (ابوداؤد: باب في الدال علی الخیر، حدیث نمبر: 5129)

15.3.3 انسانی بنیاد پر تعاون

تعاون کی سب سے بڑی بنیاد انسانیت ہے، ظلم کسی پر بھی ہو وہ ہمارے تعاون کا مستحق ہے، حضورؐ نے فرمایا:

”اپنے بھائی کی مدد کرو وہ ظالم ہو یا مظلوم“ صحابہؓ نے عرض کیا: اگر مظلوم ہو تو اس کی مدد کریں گے، ظالم کی مدد کیسے کریں؟ آپؐ نے فرمایا: ”ظلم سے اس کا ہاتھ روک دو، یہی اس کی مدد ہے“ (بخاري: باب أعن أخاک ظالمًا أو مظلوما، حدیث نمبر: 2443)

نبوت سے پہلے حجاز کے علاقہ میں کوئی باضابطہ حکومت نہ تھی؛ البتہ مختلف قبیلوں کے مخصوص طریقوں اور متعینہ دستور کے مطابق تحفظ ہوا کرتا تھا اور لوگوں کے باہمی تعلقات قائم رہتے تھے، اسی زمانہ میں مکہ میں ایک واقعہ پیش آیا کہ مکہ کے ایک شخص نے ایک

بیرونی شخص کا حق ادا کرنے سے انکار کر دیا، چونکہ اس کا تعلق مکہ سے نہیں تھا اور مکہ میں اس کے قبیلہ کے افراد بھی نہ تھے؛ اس لئے ممکن نہ تھا کہ وہ طاقت کے زور پر اپنا حق حاصل کر سکے، اس اجنبی شخص نے صحن کعبہ میں مکہ کے لوگوں کے سامنے اپنے اوپر ہونے والے ظلم کا ذکر کیا اور ان کے ضمیر سے انصاف مانگا، اس موقع سے کچھ لوگ اس کی مدد کے لئے کھڑے ہو گئے، اور عبد اللہ بن جدعان کے مکان پر اس کی نشست ہوئی، اس میں آپ ؐ نے بھی شرکت کی اور اس طرح "حلف الفضول" نامی ایک معاہدہ ہوا جس کا مقصد انصاف کو قائم کرنا، ظلم کو روکنا اور ظالم کے خلاف مزاحمت کرنا تھا، یہ واقعہ نبوت سے پہلے کا تھا؛ لیکن رسول اللہ ؐ کو یہ کام اس قدر پسند آیا تھا کہ آپ ؐ نے فرمایا: "اگر مجھے آج بھی اس کی طرف بلایا گیا تو میں اس پر لبیک کہوں گا" (البدایۃ والنہایۃ: 2؍291) یہ واقعہ مظلوم کی مدد کے لئے بھی دلیل فراہم کرتا ہے اور حضورؐ خواہش کہ اگر اب بھی مجھے کسی ایسے معاہدہ کے لئے بلایا جائے تو میں اسے قبول کروں گا، اس بات کی دلیل ہے کہ انصاف پسند حکمرانوں کے ساتھ سیاسی تعاون بھی درست ہے، اگرچہ وہ مسلمان نہ ہوں، قرآن مجید میں متعدد مقامات پر "منکر" کو روکنے کا حکم دیا گیا، منکر میں تمام برائیاں شامل ہیں، اور یقینا ظلم بھی اس میں داخل ہے اور ظلم کسی پر بھی ہو اسے روکنا اسلام کا حکم ہے، یہاں تک کہ انسانوں کے علاوہ اللہ کی دوسری مخلوقات پر بھی ظلم ہو تو وہ ممنوع ہے، اس کا روکنا اور روکنے میں تعاون کرنا ضروری ہے۔

اسی طرح انسانی بنیاد پر معاشی اور مالی تعاون بھی درست ہے، نبوت کے بعد بھی رسول اللہ ؐ نے ابوسفیان اور جبیر بن مطعم کے ساتھ مضاربت (شرکتی کے ساتھ تجارتی معاملہ) کی ہے، مکہ میں شدید قحط پڑا، لوگ مردار وغیرہ کھانے پر مجبور ہو گئے، یہ زمانہ مسلمانوں اور مشرکین مکہ کے درمیان شدید اختلاف کا تھا، اس کے باوجود آپ ؐ نے مکہ میں قحط زدہ مشرکین کے لئے پانچ سو دینار بھیجے، اور یہ رقم آپ نے سرداران قریش ابوسفیان اور صفوان بن امیہ کو بھیجی جو مسلمانوں کی مخالفت میں پیش پیش تھے اور مشرکین کی قیادت کر رہے تھے۔

حضرت عمرؓ نے ایک بوڑھے کو دیکھا کہ وہ بھیک مانگ رہا ہے، جب حضرت عمرؓ نے اس کی وجہ معلوم کی تو اس نے کہا کہ وہ جزیہ ادا کرتا ہے، حضرت عمرؓ نے بیت المال سے اس کا وظیفہ مقرر فرمایا اور کہا کہ ہم نے تمہاری جوانی کو کھایا اور اب پھر ہم تم سے جزیہ وصول کریں، یہ انصاف کی بات نہیں۔

ام المؤمنین حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا نے اپنے یہودی رشتہ داروں کو تیس ہزار درہم تقسیم فرمائے، حضرت عبد اللہ بن عمرؓ کے گھر میں بکری ذبح ہوئی، انہوں نے پڑوسیوں کو بھیجنے کی ہدایت فرمائی، واپسی پر دریافت فرمایا کہ کیا یہودی پڑوسی کو بھی اس میں سے بھیجا گیا ہے، جب جواب: نہیں، ملا تو خاص طور پر ان کو بکرے کا گوشت بھیجا، حضرت عمرؓ نے اپنے ایک مشرک بھائی کو تحفہ بھیجا۔

چنانچہ فقہاء کا اس پر بھی قریب قریب اتفاق ہے کہ نفلی صدقات غیر مسلموں کو دیا جا سکتا ہے۔

باہمی تعاون میں تعاون حاصل کرنا بھی شامل ہے، علم جیسی مقدس شے میں اسلام نے کسی تعصب سے کام نہیں لیا اور علم وحکمت کو مومن کی متاع گمشدہ قرار دیا (ترمذی: باب ماجاء في فضل النفقة علی العبادة، حدیث نمبر: 2687) چنانچہ جنگ بدر کے قیدیوں میں جو پڑھنے لکھنے سے واقف تھے، آپ ؐ نے ان کا فدیہ یہی مقرر کیا تھا کہ وہ دس مسلمان بچوں کو لکھنا پڑھنا سکھا دیں، حضورؐ نے ہجرت کے سفر میں ایک مشرک عبد اللہ بن اریقط کو اپنا رہبر بنایا اور اس سے تعاون حاصل کیا، اس سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ حق وانصاف کے کاموں میں انسانیت کی

بنیاد پر تعاون حاصل کرنا درست ہے، حضورؐ نے عام حکم فرمایا:

”جس کے پاس زائد سواری ہو تو وہ اس کو دیدے جس کے پاس کوئی سواری نہ ہو اور جس کے پاس زائد توشہ سفر ہو وہ اس کو دیدے جس کے پاس توشہ نہ ہو“(ابو داوٗد، باب في حقوق المال، حدیث نمبر:1663)

یہ حکم بھی عام ہے، اسی طرح والدین، قرابت داروں، پڑوسیوں، یتیموں، مسکینوں اور ضرورت مندوں وغیرہ کی مدد کا حکم عام ہے، خواہ وہ مسلمان ہو یا غیر مسلم۔

15.3.4 ایمانی بنیاد پر تعاون

قرآن کریم میں ایمان والوں کو بھائی بھائی قرار دیا گیا ہے (الحجرات:10) اور حضورؐ نے ایمان والوں کے اتحاد و تعاون کی مثال ایک جسم سے دی ہے کہ اگر اس کے کسی عضو میں بھی کوئی درد ہو تو پورا جسم بے خوابی اور بخار سے تڑپ اٹھے (بخاري: باب رحمة الناس والبهائم، حدیث نمبر:6011) ایک اور حدیث میں آپ نے یہاں تک فرمایا:

”مومن مومن کے لئے ایک عمارت کی طرح ہے، اس کا ایک حصہ دوسرے حصہ کو مضبوط کرتا ہے“(بخاري: باب تشبیک الأصابع في المسجد وغیرہ، حدیث نمبر:481)

ایک حدیث میں آپؐ نے فرمایا:

”مسلمان مسلمان کا بھائی ہے، اس پر ظلم نہ کرے اور اس کو بے سہارا نہ چھوڑے، جو اپنے بھائی کی ضرورت پوری کرے گا اللہ تعالیٰ اس کی ضرورت پوری فرمائے گا، کسی مسلمان کی کسی مصیبت کو دور کرے گا اللہ تعالیٰ اس کے عوض قیامت کے دن کی مصیبتوں میں سے کسی مصیبت کو دور فرمادے گا، اور جو کسی مسلمان کے عیب پوشی کرے گا اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اس کی ستر پوشی فرمائیں گے“(بخاري: باب لا یظلم المسلم المسلم، حدیث نمبر:2442)

ان احادیث میں خصوصیت کے ساتھ مسلمانوں سے تعاون کا حکم دیا گیا ہے۔

صحابہؓ حصول علم میں بھی ایک دوسرے کا تعاون کیا کرتے تھے، حضرت عمرؓ فرماتے ہیں کہ ”میں نے اپنے ایک انصاری پڑوسی سے یہ طئے کر لیا تھا کہ ہم دونوں باری باری مجلس رسول میں حاضر ہوا کریں گے، چنانچہ ایک دن وہ جاتا، ایک دن میں جاتا، جب میں جاتا تو آکر اس دن کی باتیں اس کو بتاتا، اور جب وہ جاتا تو وہ مجھے اس دن کی باتوں سے آگاہ کرتا“(بخاری: باب التناوب في العلم، حدیث نمبر:87) حضورؐ نے افضل ترین کاموں کا ذکر فرمایا تو اس میں ایک کام یہ بھی ذکر فرمایا کہ ”تم کسی ہنر مند کی مدد کر دو، یا بے ہنر کا کام کر دو“(مسلم: باب بیان کون الایمان، حدیث نمبر:84)

وقف اور زکوۃ کا اجتماعی نظام مسلمانوں کے باہمی تعاون کی ہی علامت ہے، مسلمانوں کے باہمی اجتماعی تعاون کا ایک نمونہ اسلام کا شورائی نظام بھی ہے۔

15.3.5 خانگی بنیاد پر تعاون

اسلام نے عام انسانوں اور عام مسلمانوں کے مقابلہ میں رشتہ داروں اور بالخصوص اپنے اہل خانہ کو خصوصی حقوق دینے کی تاکید کی ہے، اس کا تقاضا یہ ہے کہ ان کو تعاون میں بھی مقدم رکھا جائے، یہ تعاون جسمانی بھی ہو سکتا ہے اور مالی بھی، حضورؐ نے اشعری لوگوں کی تعریف فرمائی کہ

”جب کسی غزوہ میں ان کا زاد سفر ختم ہو جاتا ہے، یا مدینہ میں ان کا کھانا کم پڑ جاتا ہے تو جو کچھ ان کے پاس ہوتا ہے، اس کو ایک کپڑے میں جمع کرتے ہیں اور ایک برتن سے برابر سرابر اسے آپس میں تقسیم کر-تے ہیں“، آپؐ نے فرمایا: ”وہ مجھ سے ہیں میں ان سے ہوں“ (بخاری: باب الشرکۃ في الطعام، حدیث نمبر: 2486)

قرآن مجید میں جگہ جگہ والدین اور رشتہ داروں کے خصوصی حقوق بیان کئے گئے ہیں، ان سے معلوم ہوتا ہے کہ رشتہ داروں کو تعاون میں فوقیت دینا چاہئے، حضورؐ اپنے گھر کے کاموں میں ہاتھ بٹاتے تھے، غلام بھی گھر میں رہتے ہیں، حضورؐ نے ان کے بارے میں بھی ہدایت فرمائی کہ:

”ان کو زیادہ کام نہ دیا جائے، اور اگر تم ان کو زیادہ کاموں کا مکلف بناؤ تو ان کا تعاون کرو“ (مسلم: باب إطعام المملوک مما یأکل)

اسلام میں نفقہ اور وراثت وغیرہ کا نظام کا بھی اسی خانگی تعاون کا حصہ ہے۔

15.4 اکتسابی نتائج

اس اکائی میں آپ نے درج ذیل نکات سیکھے:

- اخلاق ایک باطنی صورت ہے، اور اس سے مراد نفس کی وہ حالت ہے، جس سے بلا تکلف اچھے اور بُرے اعمال صادر ہوتے ہیں، اگر اخلاق اچھے ہوں تو ان کو ”اخلاق حسنہ“ یا ”فضائل‘ کہتے ہیں اور بُرے ہوں تو ”اخلاق سیئہ“ یا ”رذائل“ کہتے ہیں، اس دنیا کو حسن اخلاق کی ضرورت ہے؛ چوں کہ دنیا کی ہر خوشی اور امن و امان اسی اخلاق کی بدولت ہے، اسلام نے اخلاق کے شعبہ میں جامع اور مکمل رہنمائی کی ہے، اسلام میں حسن اخلاق کو ایمان کے مکمل ہونے کا معیار قرار دیا گیا ہے، اس کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اس کا سرچشمہ وحی الٰہی ہے، اسلامی اخلاق کی حیثیت نظریہ اور فلسفہ کی نہیں، سراپا عمل کی ہے، اور اخلاقی تعلیمات میں انسان کو اس کی ذمہ داریوں کا احساس دلایا گیا ہے۔
- اسلام میں باہمی تعاون کی بنیاد ”برّ و تقویٰ“ ہے، ایسے کاموں میں تعاون سے منع کیا گیا ہے جن کا تعلق گناہ اور ظلم سے ہے، باہمی تعاون ایک معاشرتی ضرورت ہے، تعاون کچھ انسانی بنیادوں پر ہوگا، کبھی ایمانی بنیادوں پر اور کبھی خانگی اور خاندانی بنیادوں پر۔

15.5 کلیدی الفاظ

صادر ہونا : نکلنا، ظاہر ہونا۔

آلودگی : ناپاکی، گندگی، گنہگاری۔

وحدہ لاشریک لہ : وہ تنہا ہے، اس کا کوئی شریک نہیں۔

سرچشمہ : سونا، پانی کے نکلنے کی جگہ، مجازاً کسی بھی چیز کے نکلنے کی جگہ کو کہتے ہیں۔

منشأ : ارادہ، مقصد

نظریہ : تھیوری، اصول۔

میزان : ترازو

اخلاقیات : تعلیم وتربیت کا وہ حصہ جس کے ذریعہ اخلاق کی تعلیم دی جاتی ہے۔

افراط وتفریط : کمی بیشی، غیر معتدل حالت۔

15.6 نمونہ امتحانی سوالات

15.6.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات

1. اخلاق کس زبان کا لفظ ہے؟

(a). عربی (b). فارسی (c). انگریزی (d). یونانی

2. اخلاق حسنہ کو کیا کہتے ہیں؟

(a). فضائل (b). رذائل (c). اخلاق سیئہ (d). بری صفات

3. رذائل کس کو کہتے ہیں؟

(a). اخلاق سیئہ (b). فضائل (c). اخلاق حسنہ (d). خوبیاں

4. آپؐ نے فرمایا کہ مسلمان وہ ہے جس کے ہاتھ اور ۔۔ سلامت رہے؟

(a). زبان (b). جائداد (c). مکان (d). سب غلط

5. تعاون کے معنی بتائیں؟

(a). مددگار (b). ظلم (c). ناانصافی (d). سب صحیح

6. عدوان کے معنی بتائیں؟

(a). حق تلفی (b). مددگار (c). حمایتی (d). معاون

7. حلف الفضول نامی معاہدے کو قائم کرنے کا مقصد کیا تھا؟

(a). انصاف (b). ظلم (c). ناانصافی (d). حق تلفی

8. حلف الفضول نامی معاہدہ کس کے گھر پر قائم ہوا تھا؟

(a). عبداللہ بن جدعان (b). حضرت عثمانؓ (c). حضرت عمرؓ (d). حضرت علیؓ

9. ہجرت کے سفر میں آپ ﷺ نے کس کو اپنا رہبر بنایا؟

(a). عبداللہ بن اریقط (b). جبیر بن مطعم (c). سراقہ بن جعشم (d). سب صحیح

10. جنگ بدر کے قیدیوں میں جو پڑھنا جانتے تھے ان کا فدیہ کتنے بچوں کو لکھنا پڑھنا سکھانا طے پایا؟

(a). دس (b). چالیس (c). پانچ (d). پانچ

15.6.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات

1. اخلاق کے مفہوم کو بیان کیجیے۔
2. اسلامی اخلاق کی اہمیت پر روشنی ڈالیے۔
3. باہمی تعاون کا مفہوم بیان کیجیے۔
4. ایمانی بنیاد پر تعاون کی اہمیت بیان کیجیے۔
5. خانگی بنیاد پر تعاون کی شکلوں کا جائزہ لیجیے۔

15.6.3 طویل جوابات کے حامل سوالات

1. اسلامی اخلاق کی خصوصیات کا تفصیلی جائزہ لیجیے۔
2. انسانی بنیاد پر تعاون کو بیان کیجیے۔
3. باہمی تعاون کے بنیادی اصول اور اس کی وسعت پر روشنی ڈالیے۔

15.7 تجویز کردہ اکتسابی مواد

1. سیرۃ النبی جلد ششم (اردو) : علامہ سید سلیمان ندوی
2. دین رحمت (اردو) : مولانا شاہ معین الدین ندوی
3. اسلام میں خدمت خلق کا تصور : مولانا سید جلال الدین عمری
4. .4امانت کا قرآنی تصور : مولانا سید سلمان الحسینی ندوی

اکائی 16:   آداب زندگی (حصہ دوم)

اکائی کے اجزا:

16.0 تمہید
16.1 مقاصد
16.2 سچائی اور امانت کا وسیع تصور
  16.2.1 اسلام میں سچائی کا تصور
  16.2.2 زبان کی سچائی
  16.2.3 دل کی سچائی
  16.2.4 عمل کی سچائی
  16.2.5 اسلام میں امانت کا وسیع تصور
  16.2.6 امانت کی مختلف شکلیں
16.3 نصح و خیر خواہی
16.4 خدمت خلق
  16.4.1 خدمت خلق کی اہمیت
  16.4.2 فرد کی خدمت
  16.4.3 عوامی خدمات
16.5 اکتسابی نتائج
16.6 کلیدی الفاظ
16.7 نمونہ امتحانی سوالات
  16.7.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات

16.7.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات
16.7.3 طویل جوابات کے حامل سوالات
16.8 تجویز کردہ اکتسابی مواد

16.0 تمہید

اسلام نے انسانوں کو زندگی گذارنے کا ایک جامع اور مکمل دستور عطا کیا ہے، زندگی سے بھرپور فائدہ اٹھانا، خاطر خواہ لطف اندوز ہونا اور فی الواقع کامیاب زندگی گزارنا یقینا آپ کا حق ہے، لیکن یہ اسی وقت ہی ممکن ہو سکتا ہے جب آپ زندگی گزارنے کا سلیقہ جانتے ہوں، کامیاب زندگی کے اصول وآداب سے واقف ہوں، اور نہ صرف واقف ہوں بلکہ عملاً ان سے اپنی زندگی کو آراستہ و شائستہ بنانے کی کوشش میں پیہم سرگرم بھی ہوں۔ سچائی اور امانت سے انسانی زندگی دھوکہ اور فریب سے محفوظ رہتی ہے، نصح و خیر خواہی کے جذبات سے خالق اور مخلوق دونوں کے حق میں وفاداری ظاہر ہوتی ہے اور ایک خیر خواہ انسان ہو سکتا ہے کسی کو کوئی مادی فائدہ نہ پہنچا سکے؛ لیکن اپنے جذبۂ خیر خواہی سے ہمیشہ دوسروں کے بارے میں نیک تمنائیں رکھتا ہے اور اپنے ضرر سے ہر ایک کو محفوظ رکھتا ہے، خدمت خلق ایک شخص کے بندہ ہونے کی پہچان بھی ہے اور مخلوق خدا سے محبت کی دلیل بھی، یہ خیر خواہی کا اعلیٰ درجہ ہے، جس میں خیر خواہی کسی مفید عمل کی شکل میں سامنے آتی ہے، اگر ہر شخص میں فرد اور سماج کی خدمت کا جذبہ پیدا ہو جائے تو کمزوری یا عدم استطاعت کی وجہ سے کسی کا کام نہ رکے اور ایک معتدل معاشرہ وجود میں آئے

16.1 مقاصد

اس اکائی کا مقصد یہ ہے کہ آپ یہ جان سکیں کہ اسلام میں سچائی کی تین قسمیں ہیں: زبان کی سچائی، دل کی سچائی اور عمل کی سچائی، اور امانت کا تصور بھی اسلام میں خاصا وسیع ہے اور اس کی مختلف شکلیں ہیں، آپ کو یہ بھی معلوم ہو گا کہ اسلام میں نصح و خیر خواہی اور خدمت خلق کی کیا اہمیت اور اس کے کتنے فوائد اور فضائل ہیں۔

16.2 سچائی اور امانت کا وسیع تصور

16.2.1 اسلام میں سچائی کا تصور

عرف عام میں سچائی کے معنی سچ بولنے کے ہیں؛ لیکن اسلام نے اس کا بہت وسیع تصور دیا ہے اور اس طرح اس میں صرف قول کی سچائی نہیں، عمل کی سچائی بھی داخل ہو گئی ہے، امام غزالیؒ نے اپنی کتاب احیاء العلوم میں اس کی چند قسمیں کی ہیں اور قرآن و حدیث سے ہر ایک کے معنی بتائے ہیں، بات میں سچائی، ارادہ اور نیت میں سچائی، عزم میں سچائی، عزم کو پورا کرنے میں سچائی، عمل میں سچائی اور دین داری

کے مقامات و مراتب میں سچائی؛ لیکن علامہ سید سلیمان ندوی نے ان قسموں کو تین میں سمیٹ دیا ہے، زبان کی سچائی، دل کی سچائی اور عمل کی سچائی، ان تینوں قسموں کے مطالعہ سے اس موضوع کو اچھی طرح سمجھا جا سکتا ہے۔

16.2.2 زبان کی سچائی

زبان کی سچائی کا مطلب یہ ہے کہ جو بولا جائے سچ بولا جائے، یہ سچائی کی عام اور مشہور قسم ہے، جس کی پابندی ہر مسلمان پر فرض ہے، وعدہ کو پورا کرنا اور قول و قرار کو نبھانا بھی اس میں داخل ہے، اور یہ ایمان اور اسلام کی بڑی نشانی ہے، اس کے بر خلاف ہر قسم کا جھوٹ دل کے نفاق کو بتاتا ہے، سورۂ احزاب کی ایک آیت میں ہے:

''لِيَجْزِىَ اللّٰهُ الصّٰدِقِيْنَ بِصِدْقِهِمْ وَيُعَذِّبَ الْمُنٰفِقِيْنَ اِنْ شَآءَ اَوْ يَتُوْبَ عَلَيْهِمْ ''(الأحزاب:24)

(تاکہ اللہ سچوں کو ان کی سچائی کا عوض دے اور منافقوں کو چاہے تو سزا دے اور چاہے تو ان کی توبہ قبول کر لے)

اس آیت میں صادق (سچے) کا مقابل منافق کو قرار دیا گیا ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ سچائی ایمان کی اور جھوٹ نفاق کی علامت ہے، اس حقیقت کو حضورؐ نے مختلف پیرایہ میں بیان فرمایا، ایک روایت میں ہے کہ:

''ایک شخص نے رسول اللہؐ سے پوچھا کہ کیا مسلمان بزدل ہو سکتا ہے ؟ فرمایا: ''ہو سکتا ہے''، پھر پوچھا: کیا بخیل ہو سکتا ہے ؟ جواب دیا: ''ہو سکتا ہے''، پھر دریافت کیا: کیا جھوٹا ہو سکتا ہے ؟ فرمایا: ''نہیں'' (موطا مالک: باب ما جاء فی الصدق والکذب، حدیث نمبر: 3630)

کئی صحابہ کہتے ہیں کہ رسول اللہؐ نے فرمایا:

''مومن ہر خصلت پر پیدا ہو سکتا ہے؛ لیکن خیانت کاری اور جھوٹ پر نہیں'' (بیہقی: باب من کان منکشف الکذب، حدیث نمبر: 20827)

مطلب یہ ہے کہ مومن میں خیانت کاری اور جھوٹ کی صفت نہیں ہو سکتی ہے کہ یہ ایمان کے تقاضے کے بالکل خلاف ہے، چنانچہ ایک جگہ یہ فرمایا:

''کسی بندہ کا ایمان مکمل نہیں ہو سکتا جب تک کہ وہ جھوٹ کو ہر طرح نہ چھوڑ دے، یہاں تک کہ مذاق میں بھی'' (مسند احمد، حدیث نمبر: 8630)

حضرت عبد اللہ بن عمرؓ فرماتے ہیں کہ حضورؐ نے فرمایا:

''جس میں چار باتیں ہوں وہ پکا منافق ہے اور جس میں ان میں سے ایک بات ہو تو اس میں نفاق کی ایک نشانی پائی جاتی ہے، جب تک وہ اس کو چھوڑ نہ دے، جب امانت اس کے سپرد کی جائے تو خیانت کرے، جب بات کرے تو جھوٹ بولے، جب کوئی وعدہ کرے تو پورا نہ کرے اور جھگڑا کرے تو حق کے خلاف بات کہے'' (بخاری: باب علامۃ المنافق، حدیث نمبر: 34)

ان روایتوں سے یہ پوری طرح واضح ہو جاتا ہے کہ سچ سے ایمان کی اور جھوٹ سے نفاق کی پرورش ہوتی ہے، حضورؐ نے فرمایا:

”سچ بولنا نیکی کا راستہ بتاتا ہے اور نیکی جنت کی طرف لے جاتی ہے اور آدمی سچ بولتا ہے، اور سچ بولتے بولتے وہ اللہ کے نزدیک صدیق لکھ دیا جاتا ہے، اور جھوٹ بدکاری کا راستہ بتاتا ہے اور آدمی جھوٹ بولتا جاتا ہے یہاں تک کہ جھوٹ بولتے بولتے وہ اللہ کے یہاں جھوٹا لکھ دیا جاتا ہے“ (مسلم: باب قبح الکذب وحسن الصدق، حدیث نمبر: 2607)

16.2.3 دل کی سچائی

سچ کی دوسری قسم دل سے تعلق رکھتی ہے، اور اس حیثیت سے وہ اخلاص کے ہم معنی ہو جاتی ہے، اور اس حالت میں بعض موقعوں پر زبان سے سچ کا اظہار بھی اس لئے جھوٹ ہو سکتا ہے کہ وہ دل کی تہہ سے نہیں نکلا، منافق رسول اللہؐ کی خدمت میں آکر آپ کی رسالت کا زبانی اقرار کرتے تھے اور آپ کی رسالت ایک بالکل سچی بات تھی؛ لیکن چونکہ یہ اقرار ان کے ضمیر کے خلاف تھا، اس لئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ”اور اللہ گواہ ہے کہ یہ منافق جھوٹے ہیں“ (المنافقون: 1) یعنی اپنی گواہی میں جھوٹے ہیں، زبان سے تو کہتے ہیں: ہم اقرار کرتے ہیں کہ آپ خدا کے رسول ہیں، لیکن ان کا یہ اقرار اور ان کی یہ گواہی ان کے دل کا اقرار اور گواہی نہیں، ان کے دل میں کچھ ہے اور زبان پر کچھ اور ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ سچائی اس کا نام ہے کہ زبان سے دل کی صحیح ترجمانی کی جائے، اگر ایسا نہ ہو تو اس کا نام نفاق ہے، اسی طرح اگر کسی عمل کی دل میں کوئی اور غرض ہو اور ظاہر کچھ اور کیا جائے تو وہ بھی جھوٹ ہے، ایک حدیث میں ہے:

”قیامت کے دن اللہ کے سامنے تین شخص: ایک عالم، ایک شہید اور ایک دولت مند پیش ہوں گے، اور علم والا اپنے علم، شہید اپنی جاں بازی اور دولتمند اپنی دولت کے کارنامے بیان کرے گا؛ لیکن ان کارناموں کو سن کر اللہ تعالیٰ فرمائے گا: ”تم جھوٹ کہتے ہو، اور فرشتے بھی یہی کہیں گے“ (مسلم: باب من قاتل للریاء والسمعۃ، حدیث نمبر: 1905)

یہ کارنامے اگرچہ غلط طور پر بیان نہیں کئے گئے تھے؛ لیکن چونکہ ان میں اخلاص نہ تھا اور وہ محض شہرت حاصل کرنے کی غرض سے کئے گئے تھے، اس لئے اللہ تعالیٰ نے ان کو جھوٹ کہا کہ ان کے کارناموں کا حقیقی مقصد خدا کی خوشنودی نہ تھی؛ بلکہ دنیا کی شہرت اور ناموری تھا جس کا اللہ کے یہاں کوئی معاوضہ نہیں۔

16.2.4 عمل کی سچائی

عمل کی سچائی یہ ہے کہ جو نیک عمل ہو وہ ضمیر کے مطابق ہو، اسے اس طرح بھی کہہ سکتے ہیں کہ ظاہری اعمال باطنی اوصاف کے مطابق ہوں، مثلاً ایک شخص نماز میں خشوع خضوع کا اظہار کرتا ہے اور اس کا مقصد صرف نمائش ہے تو یہ شخص ظاہر ہے کہ کھلا ہوا ریاکار اور جھوٹا ہے؛ لیکن ایک عملی جھوٹ اس سے بڑھ کر باریک ہے، اور وہ یہ کہ ایک شخص نمائش کے لئے ایسا نہیں کرتا؛ لیکن ظاہری طور پر اس کی نماز سے جو خشوع خضوع ظاہر ہوتا ہے، اس کے باطن میں وہ خشوع خضوع نہیں ہے؛ اس لئے اس کے ظاہری اعمال اس کے باطن کی صحیح ترجمانی نہیں کرتے، اس بنا پر وہ بھی اپنے ان اعمال میں سچا نہیں، اس لئے زبان کی سچائی اور دل کی سچائی کے ساتھ عمل کی سچائی بھی ضروری ہے، اس لئے جن مسلمانوں نے ایمان کے بعد خدا کی راہ میں جان ومال سے جہاد کیا وہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک سچے ٹھہرے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

"مسلمان تو وہی ہیں جو اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لائے، پھر (کسی طرح کا) شک نہیں کیا اور اللہ کے راستہ میں اپنی جان ومال سے جہاد کیا، یہی سچے لوگ ہیں" (الحجرات:15)

یہ سچے اس لئے ٹھہرے کہ ان کا یہ عمل ان کی دلی کیفیت کا سچا ترجمان ہے، زبان اور دل سے جس ایمان کا اقرار کیا تھا عمل سے اس کی تصدیق کر دی، پھر اس عمل کی سچائی کے کئی مرتبے ہیں، ایک یہ بھی کہ جو ارادہ کیا جائے اس میں کمزوری یا پس وپیش نہ ہو، اس مرتبہ سے بڑھ کر عمل کی سچائی کا مرتبہ یہ ہے کہ جو قول وقرار کیا جائے اور جس قول وقرار کے کرنے کا سچا وپکا عزم کیا جائے اس کو اس وقت پر پورا کر کے دکھایا جائے، حضرت انس بن نضر رضی اللہ عنہ کو غزوہ بدر میں شرکت کا موقع نہیں ملا تھا، اس کی تلافی کے لئے انہوں نے یہ کہا کہ اب اگر مجھ کو کسی غزوہ میں شرکت کا موقع ملا تو اپنی جانبازی کے جوہر دکھاؤں گا، چنانچہ اس کے بعد غزوہ اُحد میں شریک ہوئے اور نیزے، تلوار اور تیر کے تقریباً اسی زخم کھا کر شہادت حاصل کی، وعدہ کو پورا کرنے کی یہ بہترین مثال تھی، اس لئے اللہ تعالیٰ نے ان کی شان میں فرمایا:

"مسلمانوں میں کچھ لوگ ایسے ہیں کہ اللہ کے ساتھ انہوں نے جو عہد کیا تھا اس میں سچے اترے" (الأحزاب:19)

اور عمل کی سچائی کی سب سے اعلیٰ مثال یہ ہے کہ انسان کے ظاہر وباطن یعنی اس کی زبان کا ہر حرف، دل کا ہر ارادہ، اس کا ہر عمل حق اور سچ میں بالکل ڈھل جائے، قرآن نے ایسے ہی لوگوں کو صدیق کہا ہے، فرمایا گیا:

"اور جو اللہ اور اس کے رسولوں پر ایمان لائے وہی صدیق ہیں" (الحدید:19)

اس سے مراد ایمان کامل اور اس کے مطابق عمل صالح کا اہتمام ہے۔

اس تفصیل سے اندازہ ہوگا کہ اسلامی تعلیم نے سچائی کی تلقین کس وسعت اور گہرائی کے ساتھ کی ہے اور جو مسلمان ان سارے معنوں میں سچا ہوتا ہے وہی کامل مومن ہوتا ہے۔

16.2.5 اسلام میں امانت کا وسیع تصور

عرف عام میں کسی کے پاس کوئی چیز حفاظت کے لئے رکھی جائے اور وہ اپنے سامان کی طرح اس کی حفاظت کرے اور اسی طرح اس کو واپس کر دے تو اس کو امانت کہتے ہیں، اسلامی تصور کے مطابق یہ امانت کی ایک قسم ہے، اس کے علاوہ امانت کے دائرہ میں اور بھی چیزیں آتی ہیں مثلاً کسی کا کسی پر کوئی حق ہو اور وہ اسے وقت پر ادا کرے یہ بھی امانت ہے، کسی کے راز کو چھپانا بھی امانت ہے، مجلس کی بات کو مجلس تک محدود رکھنا بھی امانت ہے، کسی کو مشورہ دینا اور اس کے نجی مقصد کو لوگوں میں عام نہ کرنا بھی امانت ہے، کوئی کسی کام پر ملازم ہے تو نوکری کے شرائط کے مطابق اپنی ذمہ داری کو محسوس کرتے ہوئے اس کو انجام دینا بھی امانت ہے، اور امانت کے تعلق سے قرآن کا حکم یہ ہے:

"بے شک تم کو اللہ حکم دیتا ہے کہ امانتوں کو ان کے مالکوں کے حوالہ کردو۔" (النساء:58)

اسی لئے مفسرین کے نزدیک اس کی وسعت میں وہ امانت الٰہی بھی داخل ہے جس کا نام تکلیف شرعی ہے، (الأحزاب:) اور وہ

امانت بھی داخل ہے جس کا نام عدل وانصاف ہے، اور جو حاکموں کو اپنی رعایا کے حقوق ادا کرنے پر مجبور کرتا ہے، اور وہ تمام امانتیں بھی داخل ہیں جن کو ان کے مالکوں کے سپرد کرنا ضروری ہے۔

ابولبقاء کفوی نے لکھا ہے کہ ”ہر وہ چیز جو اللہ تعالیٰ نے لوگوں پر فرض کی ہے وہ امانت ہے، جیسے نماز، زکوۃ، قرض کی ادائیگی، اور ان میں سب سے زیادہ تاکیدی حکم ودیعت کا ہے یعنی وہ چیز جو بطور امانت کسی کے پاس رکھی جائے، اور رازوں کو چھپانا بھی امانت ہے“، کفوی کا ہی قول ہے: ”ہر وہ چیز جس کے سلسلے میں کسی پر اطمینان کیا جائے وہ خواہ مال ہو یا کوئی قابل احترام چیز یا راز امانت میں داخل ہے“۔

16.2.6 امانت کی مختلف شکلیں

کسی نے کسی کو کوئی چیز رکھنے کو دی یا سفر میں گواہ اور قرض کو لکھنے والا کوئی نہ ملا تو اس سے گروی رکھ کر اس سے قرض لیا یہ بھی امانت ہے، قرآن کا حکم ہے:

”توجو امین بنایا گیا اسے چاہئے کہ امانت ادا کرلے اور اپنے پروردگار اللہ سے ڈرے“(البقرۃ:283)

یعنی لے کر مکر نہ جائے، یا دینے میں حیلے حوالے نہ کرے، یا اس میں بلا اجازت کوئی تصرف نہ کرے، جن مسلمانوں کو جنت میں عزت کی جگہ دی جانے والی ہے، اُن میں وہ بھی داخل ہیں جو امانتوں کو ادا کرتے ہیں، اور وہ مسلمان جن کو اللہ تعالیٰ نے فلاح پانے کی خوش خبری سنائی ہے، دونوں میں امانت داروں کو شامل فرمایا ہے، فرمایا:

”اور جو اپنی امانتوں اور اپنے قول وقرار کا خیال کرتے ہیں“(المؤمنون:18، المعارج:32)

کسی ملازمت اور نوکری کو اس کی شرطوں کی رعایت کے ساتھ انجام دینا بھی امانت ہے، جس کام کے لئے کسی کو رکھا جائے اسے چاہئے کہ پوری دیانت داری سے اس کو ادا کرے، اب ایک شخص جو چھ گھنٹے کام کرنے کا پابند بنایا گیا ہے وہ ایک دو گھنٹہ چھپے چوری بیکار بیٹھا رہے، یا اس کام کی اہلیت نہ رکھتا ہو اور خود کو غلط طور پر اس کا اہل ثابت کرکے وہ کام حاصل کرلے تو چونکہ وہ حقیقت میں اس کی اہلیت نہیں رکھتا امانت کے خلاف ہے، حضرت موسی علیہ السلام نے مدین کے سفر میں دو لڑکیوں کی بکریوں کے پینے کے لئے پانی بھر دیا، اور اس کی کوئی مزدوری نہیں مانگی، ان لڑکیوں میں سے ایک نے واپس جاکر اپنے بزرگ باپ سے ان کی تعریف کی اور سفارش کی کہ ان کو نوکر رکھ لیجئے، سب سے اچھا نوکر جس کو آپ رکھنا چاہیں وہ ہے جو طاقتور اور امانت دار ہو۔ (القصص:26) اس آیت میں سب سے بہتر ملازم کی پہچان یہ بتائی گئی ہے کہ جس کام کے لئے اس کو رکھا جائے اس میں اس کی پوری اہلیت اور طاقت ہو اور اس کام کو وہ پوری امانت سے ادا کرے۔

جب کسی سے کوئی مشورہ لیا جائے تو اس کو چاہئے کہ اپنی رائے ایمانداری سے دے، ایک مرتبہ ایک صحابی نے حضورا سے مشورہ کیا تو آپ انے فرمایا:

”جس سے مشورہ کیا جائے اس کو امانت سپرد کی جاتی ہے (ترمذی: باب أن المستشار مؤتمن)

ایک حدیث میں ہے:

” جس نے اپنے بھائی کو یہ جانتے ہوئے کسی بات کا مشورہ دیا کہ اس کا فائدہ دوسری بات میں ہے تو اس نے خیانت کی“(ابوداؤد:

باب في نقل الحديث، حديث نمبر:4869)

اسلام میں مجلسوں کو بھی امانت کی حفاظت عطا کی گئی ہے، چونکہ مجلس کی بات دوسری جگہ پہنچ کر بسا اوقات فتنہ کا سبب بنتی ہے، ہاں اگر اس سے کسی فتنہ کے روکنے کا کام لیا جائے تو پھر اس بات کو عام کرنے کی اجازت ہے، حضورؐ نے فرمایا:

” مجلسیں امانت کے ساتھ ہوں، مگر تین موقعوں پر، کہیں کسی نے ناحق قتل کی، یا کسی کی آبروریزی کی، یا کسی کا مال ناجائز طور سے لے لینے کی سازش ہو“(ابوداؤد)

تو متعلقہ لوگوں کو اس سے آگاہ کردینا چاہئے۔

کسی کا راز افشا کرنا بھی امانت کے خلاف ہے، بلکہ میاں بیوی کے درمیان پردہ کی جو باتیں ہوتی ہیں، وہ بھی ایسے راز ہیں جن کا عام طور سے افشا کرنا بے شرمی کے علاوہ امانت کے خلاف بھی ہے (ابوداؤد، کتاب الأدب: باب مایکرہ من ذکر الرجل مایکون من إصابة أہلہ، حدیث نمبر:2174) راز کے یہی معنی ہیں کہ جس کو کہنے والا راز کہہ کر بتائے؛ بلکہ وہ بھی راز ہے جس سے وہ ہمارے سوا دوسرے کو آگاہ کرنا نہیں چاہتا، حضورا نے فرمایا:

”جب کوئی شخص کسی سے بات کرے اور وہ احتیاطاً ادھر ادھر دیکھے (کہ کوئی سن تو نہیں رہا ہے) تو وہ بات بھی امانت ہوتی ہے“ (ابوداؤد: باب في نقل الحديث، حديث نمبر:4868)

مرد جب کسی عورت کو اپنی زوجیت میں لیتا ہے تو خدا کی مقرر کی ہوئی شرطوں کے مطابق لیتا ہے؛ لیکن اگر کوئی مرد کسی عورت کو اپنی زوجیت میں لے کر اس کے حقوق ادا کرنے میں کمی کرتا ہے یا اس کے حقوق کو بالکل نظر انداز کردیتا ہے تو وہ گویا اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی امانت میں خیانت کرتا ہے، حضورؐ نے حجۃ الوداع کے مشہور خطبہ میں فرمایا:

”عورتوں کے سلسلہ میں خدا سے ڈرو“ اور فرمایا: ”کیوں کہ تم نے ان کو اللہ کی امانت اور عہد کے ساتھ اپنی زوجیت میں لیا ہے“ (ابوداؤد: باب في صفة حجة النبيا، حديث نمبر:1905)۔

سچائی اور امانت سے متعلق ان تفصیلات سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلام نے سچائی اور امانت کا کتنا وسیع تصور دیا ہے، اور جھوٹ اور خیانت کی کیسی حوصلہ شکنی کی ہے؛ بلکہ حضورؐ نے یہاں تک فرمایا:

”جس میں امانت نہیں اس میں ایمان نہیں“ (مصنف ابن أبي شيبة: باب ما قالوا في صفة الإيمان، حديث نمبر:30320)

16.3 نصح وخیر خواہی

عربی میں خیر خواہی کے لئے ”النصحیۃ“ اور ”النصح“ کے الفاظ استعمال ہوتے ہیں، نصیحت ”غش“ ’(دھوکہ) کی ضد ہے، اس میں خلوص اور سچائی کا مفہوم پوشیدہ ہے، اسی سے ”توبۃ نصوح“ بنا ہے یعنی ایسی توبہ جو بالکل خالص اور سچی ہو، جس میں کوئی کمی اور کمزوری نہ ہو، نصیحت میں ہر وہ قول وفعل داخل ہے جس سے کسی کا فائدہ مقصود ہو، جرجانی کے نزدیک ہر قسم کی بھلائی کی دعوت اور فساد سے روکنا نصیحت ہے۔

نصح وخیر خواہی افراد اور قوم دونوں کی زندگی میں ایک اہم کردار ادا کرتی ہے، نصیحت امت کی عمارت کی بنیاد ہے، قرآن وحدیث میں نصح وخیر خواہی کا تاکیدی حکم آیا ہے، لیکن اس سلسلہ میں سب سے جامع حدیث حضرت تمیم داری رضی اللہ عنہ کی ہے کہ حضورؐ نے فرمایا:

”دین خیر خواہی کا نام ہے“، یہ بات آپؐ نے تین مرتبہ ارشاد فرمائی، ہم نے عرض کیا: یارسول اللہ! خیر خواہی کس کے لئے ہو؟ آپؐ نے فرمایا: اللہ کے لئے، اس کی کتاب کے لئے، اسکے رسول کے لئے، مسلمانوں کے اماموں کے لئے اور عام مسلمانوں کے لئے“ (مسلم: باب بیان أن الدین النصیحۃ، حدیث نمبر:55)

یہ حدیث وضاحت کر رہی ہے کہ دین کی بنیاد اور اس کا لب لباب نصح وخیر خواہی ہے، یہ باقی تو امت میں دین باقی اور اگر یہ مفقود ہو تو زندگی کے تمام شعبوں میں خلل پیدا ہو جائے گا۔ انبیاء کرام کا معاملہ اپنی قوموں کے ساتھ نصح وخیر خواہی پر مبنی ہوتا تھا، حضرت نوح علیہ السلام نے اپنی قوم سے فرمایا:

”تمہیں اپنے رب کے پیغامات پہنچاتا ہوں، تمہارا خیر خواہ ہوں اور مجھے اللہ کی طرف سے وہ کچھ معلوم ہے جو تمہیں معلوم نہیں ہے“(الأعراف:62)

نصح وخیر خواہی کی قسمیں

بنیادی طور پر نصح وخیر خواہی کی پانچ قسمیں ہیں جیسا کہ اوپر ذکر کی گئی حدیث میں آپ نے دیکھا۔

اللہ کے حق میں خیر خواہی یہ ہے کہ اللہ پر ایمان لایا جائے، اس کی تصدیق کی جائے، اس کی تمام صفات کمال وجلال کا اعتراف کیا جائے، ظاہر وباطن دونوں اعتبار سے اس کی بندگی کا حق ادا کیا جائے، انسان اپنی زندگی میں ہر وقت اس کی طرف رجوع ہو، توبہ واستغفار کا اہتمام کرتا ہو، چونکہ اس سے نافرمانی ہوتی رہتی ہے اور نافرمانی کی تلافی توبہ واستغفار سے ہی ہوتی ہے، توبہ کے بارے میں قرآنی حکم یہ ہے :

اللہ کی کتاب ”قرآن مجید“ کے ساتھ خیر خواہی یہ ہے کہ اس پر ایمان لایا جائے، اس میں غور وفکر اور تدبر سے کام لیا جائے، اس کے الفاظ ومعانی کو سیکھا جائے، اس کے احکامات وتعلیمات پر خود بھی عمل کیا جائے اور دوسروں کو بھی ان کی تعلیم دی جائے اور انہیں کے مطابق اپنے آپسی معاملہ میں فیصلہ کیا جائے۔

اللہ کے رسول کے ساتھ خیر خواہی یہ ہے کہ ان پر ایمان لایا جائے، ان سے محبت کی جائے، اور محبت میں ان کو اپنی جان، اپنے مال اور اپنے بال بچوں پر مقدم رکھا جائے، حضورؐ نے فرمایا:

”تم میں کوئی اس وقت تک مسلمان نہیں ہو سکتا جب کہ میں اس کے نزدیک اس کے باپ، اس کے بیٹے اور تمام لوگوں سے زیادہ محبوب نہ ہو جاؤں“(بخاری: باب حب الرسول من الإیمان، حدیث نمبر:15)

ان کی اطاعت کی جائے، دین کے اصول وفروع میں ان کی اتباع کی جائے، ان کی سنتوں کا احترام کیا جائے، اللہ کے علاوہ ہر ایک کے قول پر ان کے قول کو ترجیح دی جائے، دل وجان سے ان کی توقیر وتعظیم کی جائے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

”اے نبی! ہم نے تم کو شہادت دینے والا، بشارت دینے والا اور خبر دار کر دینے والا بنا کر بھیجا ہے؛ تا کہ اے لوگو! تم اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لاؤ، اور اس کا ساتھ دو، اس کی تعظیم و توقیر کرو“(الفتح:8)

آپؐ کے ساتھ خیر خواہی کا تقاضا یہ بھی ہے کہ آپؐ کی دعوت کو عام کیا جائے، آپؐ کے دوستوں سے محبت اور آپؐ کے دشمنوں سے دشمنی اور نفرت رکھی جائے، آپؐ کی عزت و کرامت کا دفاع کیا جائے، آل بیت اور صحابہ کرامؓ سے محبت رکھی جائے، آپؐ پر درود وسلام کا اہتمام کیا جائے۔

اس آیت میں ان تینوں قسم کی خیر خواہی کا ذکر آگیا ہے:

”ضعیف اور بیمار لوگ اور وہ لوگ جو شرکتِ جہاد کے لیے راہ نہیں پاتے، اگر پیچھے رہ جائیں تو کوئی حرج نہیں جبکہ وہ خلوصِ دل کے ساتھ اللہ اور اس کے رسول کے وفادار ہوں۔ ایسے محسنین پر اعتراض کی کوئی گنجائش نہیں ہے اور اللہ در گزر کرنے والا اور رحم فرمانے والا ہے“(التوبۃ:91)

ائمہ مسلمین سے مراد مسلم ریاست کے امراء اور علماء دونوں ہیں، ان کے ساتھ خیر خواہی یہ ہے کہ ان کی بات مانی جائے اور ان کی اطاعت کی جائے، حضورا نے کئی احادیث میں سمع وطاعت کی تعلیم دی ہے اور اس کی تاکید فرمائی ہے، ہاں اس کے لئے یہ شرط ضرور رکھی ہے کہ ”إنما الطاعة في المعروف “(بخاری: حدیث نمبر:7145)اطاعت ایسی چیزوں میں ہوگی جو اللہ کے حکموں کے مطابق ہو، اگر حاکم کے کسی حکم سے اللہ کی نافرمانی ہو رہی ہو تو پھر اس کی بات نہیں مانی جائے گی، یہ اللہ کے ساتھ نصح و خیر خواہی ہوگی۔

اسلام میں عام مسلمانوں کے ساتھ خیر خواہی کی بھی خصوصی تاکید کی گئی ہے، جیسا کہ اوپر حدیث میں آیا ہے، ایک دوسری حدیث میں حضرت جریر بن عبد اللہ بجلی ص فرماتے ہیں: ”میں نے رسول اللہؐ سے نماز قائم کرنے، زکوۃ دینے اور ہر مسلمان کے ساتھ خیر خواہی کرنے پر بیعت کی“(بخاری:)

اس سے نصح و خیر خوہی کی اہمیت معلوم ہوتی ہے کہ نماز وزکوۃ کے ساتھ ساتھ اس پر بھی بیعت ہوتی تھی، ایک حدیث میں مسلمانوں کے دوسرے مسلمانوں پر چھ حقوق بتائے گئے ہیں، انہیں میں ایک حق یہ بھی ہے کہ:

”اگر وہ تمہاری خیر خواہی کا محتاج ہو تو تم اس کے ساتھ خیر خواہی کا معاملہ کرو“(مسلم: باب من حق المسلم للمسلم رد السلام، حدیث نمبر:2162)

عام مسلمانوں کے ساتھ خیر خواہی یہ ہے کہ ان کے ساتھ حسن سلوک کیا جائے، جو کچھ اپنے لئے پسند کیا جائے ان کے لئے پسند کیا جائے، ان کے حقوق کا خیال رکھا جائے، کار خیر میں ان کا تعاون کیا جائے، ان کو اذیت دینے سے بچا جائے، ان کے لئے دعائیں کی جائیں اور ان کو حق و صبر کی تلقین کی جائے۔

خیر خواہی کی دیگر قسمیں

قرآن مجید میں انبیاء کرام کی اپنی قوم کے ساتھ جس نصح و خیر خواہی کا اوپر ذکر آیا، ظاہر ہے اس میں تمام انسانوں کی بھلائی شامل

ہوتی تھی، ایک حدیث کے اندر نصیحت کے لفظ سے مذکورہ پانچ قسموں کا ذکر آیا ہے؛ لیکن اسلام نے حقوق کی ادائیگی اور حسن اخلاق کی تعلیم دے کر اس خیر خواہی کا دائرہ بہت وسیع کر دیا ہے، جب انسان کا تعلق دنیا کی ہر چیز سے ہے تو ظاہر ہے کہ اس کی خیر خواہی بھی ہر شے کے سا-تھ ہونی چاہئے، جمادات سے بھی کہ ان کو بے موقع صرف نہ کیا جائے، نباتات سے بھی کہ ان کو نشو و نما کا موقع دیا جائے، حیوانات سے بھی کہ ان کو بے سبب تکلیف نہ دی جائے، اور ان کے آرام کا خیال رکھا جائے اور عام انسانوں سے بھی کہ ان کی ہر ضرورت میں مدد کی جائے اور ان کے فریضۂ محبت کو ادا کیا جائے، اور خود انسان کے لئے اپنے ساتھ بھی خیر خواہی ضروری ہے کہ اس کا ہر عضو جس غرض کے لئے پیدا کیا گیا ہے اس سے مناسب طور پر کام لیا جائے، اپنی صحت اور صحت عامہ کی حفاظت میں بحیثیت شہری حکومت کے ساتھ خیر خواہی کرے اور اس میں ہر وہ چیز داخل ہے جس سے خیر عام ہو اور شر کا خاتمہ ہو۔

16.4 خدمت خلق

16.4.1 خدمت خلق کی اہمیت

خدمت سے انسان کو راحت پہنچتی ہے، اس کے کام آسان ہوتے ہیں اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اس سے اللہ تعالیٰ کی رضا حاصل ہوتی ہے، خدمت کی بعض قسمیں تو وہ ہیں جن کے ذریعہ ہم اپنے ذمہ واجب حقوق ادا کرتے ہیں اور بعض وہ خدمات ہیں جو ہم رضاکارانہ طور پر انجام دیتے ہیں، خدمت خلق کا دائرہ بہت وسیع ہے، افراد کی خدمت بھی خدمت خلق ہے، اور عوامی اور رفاہی خدمات بھی خدمت خلق میں شامل ہیں، جو سینکڑوں لوگوں کو فائدہ پہنچاتی ہیں اور ان کا فیض تادیر قائم رہتا ہے۔

خدمت خلق بھی اسلام کی اخلاقی تعلیمات کا حصہ ہے، اور معاشرہ میں زندگی گذارنے کا ایک فطری تقاضہ بھی ہے، اللہ تعالیٰ نے کمزور کو طاقتور کی، غریب کو امیر کی اور جاہل کو عالم کی خدمت کا محتاج بنایا ہے؛ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ یہ طاقتور، امیر یا عالم کمزوروں، غریبوں اور بے پڑھے لکھے لوگوں کی خدمات سے بے نیاز ہیں، زندگی میں ہر ایک کی ضرورت اللہ تعالیٰ نے دوسروں سے مربوط کر دی ہے اور کامیاب انسان وہ ہے جو دوسروں کی ضرورت کے وقت ان کی خدمت کے لئے ایسا ہی بے قرار ہو جائے جس طرح اس وقت ہوتا ہے جب کسی پریشانی میں دوسروں کی خدمت کا محتاج ہوتا ہے۔

خدمت خلق سے حقوق العباد کی ادائیگی اور ان کی راحت رسانی کا کام تو ہوتا ہی ہے، اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کا سامان بھی ہوتا ہے، اور اس طرح خدمت عبادت بن جاتی ہے، ایک حدیث سے یہاں تک معلوم ہوتا ہے کہ خدمت خلق خود اللہ تعالیٰ کی خدمت ہے، رسول اکرم ا نے فرمایا:

” قیامت کے دن اللہ تعالیٰ انسان سے کہے گا: اے ابن آدم! میں بیمار پڑا رہا؛ لیکن تو نے میری عیادت نہیں کی، انسان گھبرا کر عرض کرے گا، اے میرے رب! تو سارے جہاں کا پرودگار، تو کب بیمار تھا اور میں تیری عیادت کیسے کرتا؟ اللہ تعالیٰ فرمائے گا: کیا تجھے نہیں معلوم تھا کہ میرا فلاں بندہ بیمار ہے؛ لیکن اس کے باوجود تو اس کی عیادت کے لئے نہیں گیا، اگر تو اسکے پاس جاتا تو مجھے وہاں پاتا، پھر اللہ

تعالیٰ فرمائے گا: اے ابن آدم! میں نے تجھ سے کھانا مانگا؛ لیکن تو نے مجھے کھانا نہیں دیا، انسان عرض کرے گا: اے رب العالمین! تو کب بھوکا تھا اور میں تجھے کیسے کھانا کھلاتا؟ اللہ تعالیٰ فرمائے گا: تجھے یاد نہیں کہ میرے فلاں بندے نے تجھ سے کھانا طلب کیا تھا؛ لیکن تو نے اسے کھانا نہیں کھلایا، اگر تو نے اس کا سوال پورا کیا ہوتا تو آج اس کا ثواب یہاں پاتا، اسی طرح عرض کرے گا: اے دوجہاں کے پرودگار! تو کب پیاسا تھا؟ اور میں تجھے کیسے پلاتا؟ اللہ تعالیٰ فرمائے گا: میرے فلاں بندے نے تجھ سے پانی طلب کیا تھا؛ لیکن تو نے اس کی پیاس بجھانے سے انکار کر دیا تھا، اگر تو نے اس کی پیاس بجھائی ہوتی، آج اس کا ثواب یہاں پاتا“ (مسلم: باب فضل عیادۃ المریض، حدیث نمبر: 2569)

اور کچھ سعادت مند وہ ہوتے ہیں جن کو اللہ تعالیٰ خدمت کے لئے منتخب فرماتا ہے، جب تک ان کی خدمت جاری رہتی ہے، اللہ کا فیضان جاری رہتا ہے، اور جب وہ خدمت خلق چھوڑ دیتے ہیں تو اللہ تعالیٰ ان کو نعمتوں سے محروم کر کے دوسروں کو یہ موقع فراہم کرتا ہے اور ان کے لئے اسباب مہیا فرماتا ہے، حضورؐ نے فرمایا:

”بیشک اللہ کے کچھ بندے ایسے ہیں جن کو بندوں کے فائدے کے لئے خاص طور سے اللہ تعالیٰ نے نعمتیں دی ہیں، جب تک وہ ان کو خرچ کرتے رہتے ہیں اللہ تعالیٰ ان میں ان نعمتوں کو باقی رکھتا ہے، جب وہ بخشش روک دیتے ہیں تو اللہ تعالیٰ ان سے نعمتوں کو چھین لیتا ہے اور دوسروں کو عطا کر دیتا ہے (المعجم الأوسط للطبراني، حدیث نمبر: 5162)

سورۂ دہر کی آیات 8 سے 22 تک ان لوگوں کے لئے اللہ کی رضا، جنت کی نعمتوں اور اس کی آسائشوں کا تذکرہ ہے جو مسکینوں، یتیموں اور قیدیوں کو کھانا کھلاتے ہیں۔

خدمت خلق کے بہت سے راستے ہیں، کسی کو ذاتی طور پر مادی منفعت پہنچانا ہی خدمت نہیں ہے، اپنے علم و تجربہ سے کسی کو فائدہ پہنچانا، کسی کو اچھا مشورہ دینا، کسی کی دینی رہنمائی کرنا، کسی راہ گیر کو راستہ بتانا اور کسی نابینا کی دستگیری کرنا اور س کے سڑک عبور کرنے میں مدد دینا، عوامی خدمات کے کام مثلاً مسجد اور مدرسہ تعمیر کرنا، راستہ کی مرمت، پانی کے ذرائع کا انتظام، بجلی کی فراہمی یہ سب خدمت خلق میں شامل ہیں۔

اس طرح ہم یہاں اس کی دو قسمیں کرتے ہیں، فردکی خدمت، عوامی اور اجتماعی خدمت، حضورؐ نے فرمایا:

”بھلا ہو اس شخص کا جس کو اللہ تعالیٰ نے خیر کا دروازہ کھولنے اور شر کا دروازہ بند کرنے کا ذریعہ بنایا ہے، اور برا ہو اس شخص کا جس کو اللہ نے شر کا دروازہ کھولنے اور خیر کا دروازہ بند کرنے کا ذریعہ بنایا ہے“ (ابن ماجہ: باب من کان مفتاح للخیر، حدیث نمبر: 238)

16.4.2 فرد کی خدمت

انفرادی پیمانہ پر دیکھا جائے تو والدین، اولاد، رشتہ داروں اور پڑوسیوں وغیرہ کے حقوق کی بحسن خوبی ادائیگی اور ان کے حق سے بڑھ کر ان کا خیال بھی خدمت خلق میں داخل ہے اور مانگنے والوں کو دینا بھی خدمت خلق ہے؛ لیکن کمزوروں کی دیکھ بھال اور ان کے لئے تگ و دو، ڈھونڈ کر ان کی مدد اور پھر مسلسل ان کے لئے کوشش اور محنت خدمت خلق کا اعلی درجہ ہے، حضورؐ نے فرمایا:

”بیواؤں اور مسکینوں کے لئے سعی کرنے والا اللہ کی راہ میں جہاد کرنے والے یا رات میں قیام کرنے والے، دن میں روزہ رکھنے

والے کے مانند ہے“(بخاری: باب فضل النفقۃ علی الاہل، حدیث نمبر: 5353)

امام نوویؒ فرماتے ہیں: سعی کرنے والے سے مراد وہ شخص ہے جو ان کی معاش کے لئے دوڑ دھوپ کرے اور ان کی ضروریات زندگی پوری کرنے کے لئے محنت ومشقت کرے۔

انسانوں میں ایک کمزور وجود یتیم کا بھی ہے، اس کے ساتھ حسن سلوک وقتی طور پر کرنا بھی خدمت خلق ہے؛ لیکن اس کے وسیع تقاضے اسی وقت پورے ہوں گے جب کہ ایک مدت تک اس کے ساتھ حسن سلوک کیا جائے، حضورا نے ارشاد فرمایا:

”یتیم کی کفالت کرنے والا چاہے وہ اس کا (رشتہ دار ہو) یا کسی دوسرے کا اور میں وہ جنت میں ان دو انگلیوں کی طرح ہوں گے“، امام مالک نے شہادت کی انگلی اور بیچ کی انگلی سے اشارہ کر کے بتایا“(مسلم: باب الإحسان إلی الأرملۃ، حدیث نمبر: 2983)

اس حدیث میں کفالت کا لفظ بڑا اہم ہے، اس میں اس کی پرورش بھی داخل ہے اور تعلیم وتربیت بھی، اور معاشی انتظام بھی، امام نوویؒ نے لکھا ہے: یہ فضیلت اس شخص کو بھی حاصل ہوگی جو یتیم کی دیکھ بھال خود یتیم کے مال سے ہی کرے۔

عادت کے مطابق خدمت کرنا اتنا مشکل نہیں ہوتا؛ لیکن اچانک بغیر کسی تیاری کے کوئی تقاضا آجائے تو اس وقت انسان کی سخاوت اور ایثار کا امتحان ہوتا ہے، ایک شخص رسول اللہؐ کے پاس آیا اور کہا: یا رسول اللہ! مجھے بھوک لگی ہے، حضورؐ نے ازواج مطہرات کو خبر بھجوائی؛ لیکن ان کے یہاں کھانے کی کوئی چیز موجود نہ تھی، تو حضورؐ نے اعلان فرمایا: ”ہے کوئی جو آج رات اس کی ضیافت کرے، اللہ اس پر رحم فرمائے، ایک انصاری صحابی کھڑے ہوئے، انہوں نے کہا: میں ہوں یا رسول اللہ! وہ اپنے گھر گئے اور اپنی بیوی سے کہا: اللہ کے رسول کے مہمان آئے ہیں، ان سے بچا کر کچھ نہ رکھو، انہوں نے کہا: بخدا صرف بچوں کا کھانا بچا ہے، فرمایا: جب بچے رات کا کھانا مانگیں تو ان کو سلا دینا، اور آکر چراغ بجھا دینا، آج رات ہم بھوکے رہیں گے، ان کی بیوی نے ایسا ہی کیا، دوسرے دن صبح یہ حضورؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے، تو آپؐ نے فرمایا: ”اللہ تعالیٰ کو فلاں میاں بیوی کے کارنامہ پر تعجب ہوا یا ہنسی آئی، اور اللہ تعالی نے یہ آیت نازل فرمائی:

”وَيُؤْثِرُوْنَ عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ“(الحشر: 9)

(اور وہ اپنے اوپر دوسروں کو ترجیح دیتے ہیں گرچہ وہ خود تنگی میں ہوں)

ایک روایت میں ہے کہ یہ صحابی حضرت ابو طلحہ رضی اللہ عنہ ہیں کہ جب یہ آیت نازل ہوئی

”لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰى تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ“(آل عمران: 92)

(تم نیکی کو نہیں پہنچ سکتے جب تک کہ اپنی وہ چیزیں (خدا کی راہ میں) خرچ نہ کرو جنہیں تم عزیز رکھتے ہو)

تو عرض کیا: یا رسول اللہ! اللہ تعالی فرماتا ہے کہ اپنا پسندیدہ مال خرچ کرو، میرا پسندیدہ مال میرا باغ ”بیر حاء“ ہے، یہ اللہ کے لئے صدقہ ہے، آپ جہاں چاہیں اسے صرف کر دیں، آپؐ نے فرمایا: ”یہ نفع بخش مال ہے، اسے اپنے رشتہ داروں پر صرف کریں“ انہوں نے کہا: یا رسول اللہ! یہ آپ انہیں دے دیں، آپؐ نے حضرت ابو طلحہ کے رشتہ داروں وچچازاد بھائیوں میں تقسیم کر دیا“(بخاری: باب الزکاۃ علی الأقارب، حدیث نمبر: 1461)

16.4.3 عوامی خدمات

خدمت کی ضرورت جس طرح ایک فرد کو ہو سکتی ہے، اس جیسے بہت سے انسانوں کو ہو سکتی ہے، اس لئے اسلام نے معاشرتی خدمات کو بھی خصوصی اہمیت دی ہے، آپؐ نے ارشاد فرمایا:

”مومن کے مرنے کے بعد بھی اس کے جن اعمال اور نیکیوں کا ثواب اسے پہنچتا رہتا ہے ان میں یہ چیزیں بھی داخل ہیں، وہ علم جس کی اس نے تعلیم دی اور پھیلایا، نیک اولاد جو اس نے چھوڑی (کیوں کہ اس کو نیکی کی راہ پر لگانے میں اس کی کوششوں کا بھی دخل تھا)، قرآن شریف جس کا اس نے اپنے بعد کسی کو وارث بنایا، جو مسجد اس نے بنوائی یا مسافروں کے لئے کوئی مکان جو اس نے تعمیر کرایا، یا نہر جو اس نے کھدوائی یا وہ صدقہ جو اس نے اپنے مال سے صحت کی حالت میں اپنی زندگی میں نکالا، اس کا ثواب اسے اس کے مرنے کے بعد بھی ملے گا“ (ابن ماجہ: باب ثواب معلم الناس الخیر، حدیث نمبر: 242)

اس حدیث میں رفاہ عام کے بعض خاص کاموں کا ذکر ہے، اور انہیں صدقات جاریہ قرار دیا گیا ہے، ان میں مسافروں کے لئے مکان اور سرائے کی تعمیر بھی ہے، ایک حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ اس طرح کے کاموں میں پیسہ صرف کرنا بہترین صدقہ ہے، حضورؐ نے فرمایا:

”صدقات میں بہتر صدقہ یہ ہے کہ اللہ کے راستہ میں خیمہ کا سایہ فراہم کیا جائے“ (ترمذی: باب ما جاء في فضل الخدمة في سبيل الله، حدیث نمبر: 1627)

پانی زندگی بنیادی ضرورت ہے، آج کے ترقی یافتہ دور میں ضرورت کے مطابق صاف پانی کی فراہمی بڑا مسئلہ ہے، اسلام نے اس کی طرف جس طرح توجہ دلائی ہے اس کا اندازہ اوپر کی اس روایت سے ہو سکتا ہے جس میں بندگان خدا کے لئے نہر کی تعمیر کو صدقۂ جاریہ کہا گیا ہے۔

حضرت سعد بن عبادہؓ کی والدہ کا انتقال ہوا تو انہوں نے چاہا کہ ان کی طرف سے صدقہ وخیرات کریں، رسول اللہؐ سے دریافت کیا کہ کونسا صدقہ سب سے اچھا ہے؟ آپؐ نے فرمایا: ”پانی“؛ چنانچہ انہوں نے اپنی ماں کے نام سے کنواں کھدوایا“ (ابوداؤد: باب فی فضل سقی المائ، حدیث نمبر: 1681)

بنجر زمینوں کو قابل کاشت بنانا اور اس میں مدد دینا بھی ایک رفاہی خدمت ہے، اس سے مجموعی طور پر پوری قوم اور ملک کو فائدہ پہنچتا ہے، حکومت خود بھی غیر آباد زمینوں کو آباد کر کے اس کی آمدنی فلاح وبہبود کے کاموں میں لگا سکتی ہے، یہ بھی ممکن ہے کہ جو لوگ اسے آباد کرنا چاہیں انہیں اس کی اجازت دی جائے اور آسانیاں فراہم کی جائیں، اسلام نے اسے کار ثواب بتایا ہے، حضورا نے فرمایا:

”جس نے کسی مردہ زمین کو زندہ کیا اس کو اس کا اجر ملے گا، اس سے ضرورت مند مخلوق (انسان، جانور، پرندے وغیرہ) جو کچھ کھائے وہ سب اس کی طرف سے صدقہ ہے“ (جامع معمر بن راشد: باب ما أصيب من أرض الرجل، حدیث نمبر: 19689) (اس کا اجر ملے گا)۔

غذا اور صحت و تندرستی کے نقطۂ نظر سے شجر کاری کی اہمیت بھی واضح ہے، ان سے صاف ستھری اور تازہ ہوا ملتی ہے، وہ ٹھنڈا اور فرحت بخش سایہ فراہم کرتے ہیں، بہت سے درختوں کے پھلوں اور پتوں میں انسانوں اور جانوروں کی غذا اور علاج ہے، زمین کی آبادکاری میں درخت لگانا اور باغات کا تیار کرنا بھی آتا ہے، اسلام نے اس کی خصوصی فضیلت بیان کی ہے، حضورؐ نے فرمایا:

”اگر کوئی شخص درخت لگائے اور اس کے پھل سے آدمی یا اللہ کی کوئی مخلوق فائدہ اٹھائے تو یہ اس کے حق میں ایک صدقہ ہے“(مسند احمد، حدیث نمبر:27506)

مسجد اصلاً اللہ تعالیٰ کی عبادت کے لئے بنائی جاتی ہیں؛ لیکن دور اول میں مساجد عبادت کے علاوہ مسلمانوں کے تعلیمی، سماجی اور سیاسی مراکز کی بھی حیثیت رکھتی تھیں، حضورؐ نے فرمایا:

”جس نے کوئی مسجد بنائی تو اللہ تعالیٰ اس کے لئے اسی طرح کا گھر جنت میں بنائے گا“(ابن ماجہ: باب من بنی للہ مسجدا، حدیث نمبر:736)

اسلام میں وقف کو بھی غیر معمولی اہمیت دی گئی ہے، اس سے اللہ کی عبادت کے لئے مسجد اور عید گاہیں، تربیت و تعلیم کے لئے مدرسے اور جامعات، تدفین کے لئے قبرستان بنائے جاسکتے ہیں اور اس سے دیگر رفاہی کام بھی کر سکتے ہیں۔

مسجد نبوی کی زمین آپ انے دونوجوانوں سہل اور سہیل سے لے کر مسجد کے لئے وقف کی، حضرت عثمانؓ نے آپؐ کے اشارے پر چار ہزار دینار میں ایک کنواں ”بئر رومہ“ اس کے یہودی مالک سے خرید کر وقف کیا۔

شریعت میں رفاہی کاموں کے لئے وقف خدمت خلق کا بہت نفع بخش اور دیرپا ذریعہ ہے، اس کی اصل محفوظ رہتی ہے، اور اس کی منفعت ان لوگوں کے کام آتی رہتی ہے، اس طرح اسلام نے بڑے پیمانے پر خدمت خلق کی تاکید کی ہے اور اس کے اصول بتائے ہیں، جن کے لئے وہ وقف کیا گیا ہو۔

16.5 اکتسابی نتائج

اس اکائی میں آپ نے درج ذیل نکات سیکھے:

- اسلام نے سچائی اور امانت کا وسیع تصور دیا ہے، سچائی کا تعلق صرف زبان سے نہیں، دل اور عمل سے بھی ہے، دل کی سچائی کو ”اخلاص“ کہتے ہیں اور عمل کی سچائی کو ”عمل صالح“، اسی طرح امانت کا تصور ہے، کسی کے پاس کوئی چیز رکھی جائے، وہ اس کی اپنے سامان کی طرح حفاظت کرے اور ہو بہو اس کو مالک کے حوالہ کردے، یہ بھی امانت ہے؛ لیکن صرف یہی امانت نہیں، ملازمت کو اس کی شرطوں کے ساتھ انجام دینا بھی امانت ہے، کسی کو صحیح مشورہ دینا بھی امانت ہے، راز کو محفوظ رکھنا بھی امانت ہے، میاں بیوی کے تعلقات بھی امانت میں داخل ہیں۔
- اسلام میں نصح و خیر خواہی سے مراد ہر وہ قول و فعل ہے جس سے کسی کا فائدہ مقصود ہو، اسلام نے اللہ تعالیٰ، اس کی کتاب، اس کے رسول، ائمہ مسلمین اور عام مسلمانوں کے ساتھ خصوصی خیر خواہی کی تعلیم دی ہے اور بالعموم پوری انسانیت کے ساتھ خیر خواہی

اور ہمدردی کی تاکید کی ہے، اس کے علاوہ قرآن وحدیث میں اللہ کی بنائی ہوئی ہر چیز کے ساتھ مختلف انداز میں نصح وخیر خواہی کی ترغیب دی گئی ہے، اور کہیں اس کو تاکیدی حکم کے طور پر بیان کیا گیا ہے۔

- اسلام نے خدمت خلق کا بھی جامع تصور پیش کیا ہے، انفرادی پیمانہ پر دیکھا جائے تو والدین، اولاد، رشتہ داروں اور پڑوسیوں وغیرہ کے حقوق کی اچھی طرح ادائیگی بھی خدمت خلق میں داخل ہے؛ لیکن کمزوروں کی دیکھ بھال اور ان کے لئے تگ ودو، ڈھونڈ کر ان کی مدد خدمت خلق کا اعلیٰ درجہ ہے، اسلام نے معاشرتی خدمات کو بھی خصوصی اہمیت دی ہے؛ اس لئے اسلام میں وقف کی فضیلت بیان کی گئی ہے اور اس کی ترغیب دی گئی ہے، مسجدوں، مدرسوں اور قبرستانوں کی تعمیر بھی اس اعتبار سے خدمت خلق ہے کہ ان سے اجتماعی فائدہ مربوط ہے، سرائے خانہ کی تعمیر، خیموں کے سائے فراہم کرنا، صاف پانی کی فراہمی کے لئے آبی وسائل کا انتظام، بنجر زمین کو قابل کاشت بنانا اور خلق خدا کے فائدہ کے لئے شجر کاری یہ ساری چیزیں خدمت کی مختلف شکلیں ہیں۔

16.6 کلیدی الفاظ

ناگزیر : ضروری۔

لبیک کہنا : فوراً قبول کرنا۔

متاع گمشدہ : کھوئی ہوئی چیز ۔

بہ نفس نفیس : اپنی ذات سے۔

خندق : کھائی، گڑھا۔

حَواری : حضرت عیسیٰں کے اصحاب۔

جاں بازی : دلیری، بہادری۔

مفقود : کھویا ہوا، غائب۔

رفاہ عام : عام لوگوں کی بھلائی۔

16.7 نمونہ امتحانی سوالات

16.7.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات

1. کسی کے پاس کوئی چیز حفاظت کے لیے رکھی ہو اور وہ اس کو اسی طرح واپس کر دے تو اسلامی تصور کے مطابق کیا ہے؟

(a). امانت (b). خیانت (c). غبن (d). بددیانتی

2. خدمت خلق کس تعلیمات کا حصہ ہے؟

(a). حقوق اللہ (b). اخلاقی تعلیمات (c). سب غلط

3. ''بئر رومہ'' کو کس صحابی رسول نے خرید کر وقف کیا؟

(a). حضرت عثمانؓ (b). حضرت علیؓ (c). حضرت ابو بکرؓ (d). سب صحیح

4. اسلامی تعلیمات کی روشنی میں کیا مسلمان جھوٹا ہو سکتا ہے؟

(a). ہاں (b). نہیں (c). دونوں صحیح (d). دونوں غلط

5. رفاہ عام سے کیا مراد ہے؟

(a). لوگوں کی بھلائی (b). لوگوں کا نقصان (c). خرابی (d). رائیگاں

16.7.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات

1. اسلام میں سچائی کے تصور پر روشنی ڈالیے۔
2. زبان کی سچائی کا مطلب واضح کیجیے۔
3. دل کی سچائی کی اہمیت بیان کیجیے۔
4. عوامی خدمات پر روشنی ڈالیے۔
5. فرد کی خدمت سے آپ کیا سمجھتے ہیں؟ واضح کیجیے۔

16.7.3 طویل جوابات کے حامل سوالات

1. اسلام میں امانت کے وسیع تصور پر تفصیلی مضمون لکھیے۔
2. نصح و خیر خواہی اور اس کی قسموں کو بیان کیجیے۔
3. خدمت خلق اور اس کی اہمیت پر مضمون قلم بند کیجیے۔

16.8 تجویز کردہ اکتسابی مواد

1. سیرۃ النبی جلد ششم (اردو) : علامہ سید سلیمان ندوی
2. دین رحمت (اردو) : مولانا شاہ معین الدین ندوی
3. اسلام میں خدمت خلق کا تصور : مولانا سید جلال الدین عمری
4. امانت کا قرآنی تصور : مولانا سید سلمان الحسینی ندوی

ایم۔اے، اسلامک اسٹڈیز

بارہواں پرچہ (اسلامی عقائد، عبادات اور معاملات)

جملہ نمبرات:70 **وقت:3 گھنٹے**

ہدایات:

1. حصہ اول میں 10 لازمی سوال ہیں جو کہ معروضی سوالات / خالی جگہ کو پر کرنا / مختصر جوابات والے سوالات ہیں۔ ہر سوال کا جواب لازمی ہے۔ ہر سوال کے لیے ایک نمبر مختص ہے۔ 10x1=10

i. آخری آسمانی کتاب کون سی ہے؟

(a). قرآن مجید (b). توریت (c). زبور (d). انجیل

ii. آخرت کے عقیدے کا تصور کس بنیاد پر قائم ہے؟

(a). جواب دہی (b). اندازہ کرنا (c). فیصلہ کرنا (d). سب صحیح

iii. مخلوقات کو روزی پہنچانے کے کام پر کون مامور ہے؟

(a). حضرت میکائیلؑ (b). حضرت جبریلؑ (c). حضرت اسرافیلؑ (d). حضرت عزرائیلؑ

iv. رمضان المبارک کا مہینہ ہجری کلینڈر کے حساب سے کون سا ہے۔

(a). نواں مہینہ (b). تیسرا مہینہ (c). پانچواں مہینہ (d). سب غلط

v. قرآن مجید کی رو سے مصارف زکوۃ کتنے ہیں؟

(a). پانچ (b). سات (c). آٹھ (d). تین

vi. عرفات کا میدان مکہ سے کتنی دوری پر واقع ہے۔

(a). بارہ میل (b). پانچ میل (c). نو میل (d). سات میل

vii. نیک سلوک کا سب سے زیادہ حق دار کون ہے۔

(a). ماں (b). دادا (c). چچا (d). پڑوسی

viii. قرآن کی کون سی سورت جانوروں کے نام پر ہیں؟

(a). بقرہ (b). انعام (c). فیل (d). سب صحیح

ix. حلف الفضول نامی معاہدے کو قائم کرنے کا مقصد کیا تھا؟

(a). انصاف (b). ظلم (c). ناانصافی (d). حق تلفی

x. اسلامی نقطہ نظر سے دنیا کون سی جگہ ہیں؟

(a). دارالامتحان (b). جنت (c). اچھی جگہ (d). سب صحیح

(ب) حصہ دوم آٹھ سوالات پر مشتمل ہے اور پانچ سوالات کے جوابات دینے ہیں ہر سوال کا جواب تقریبا دو سو لفظوں پر مشتمل ہو گا۔ ہر سوال کے لیے 6 نمبر مختص ہیں۔

6x1=6

2. توحید کے دلائل قرآن مجید کی روشنی میں لکھیے۔

3. رسالت محمدیؐ پر ایمان کے تقاضوں پر روشنی ڈالیے۔

4. حساب کتاب اور جزاوسزا کے متعلق اپنی معلومات قلم بند کیجیے۔

5. نماز کے مصالح وفوائد پر مضمون لکھیے۔

6. اعتکاف کی قسمیں اور اس کے طریق کار پر نوٹ لکھیے۔

7. حج کے سماجی مصالح اور فوائد پر روشنی ڈالیے۔

8. دعاء کے آداب کیا ہیں؟ مختصر نوٹ لکھیے۔

9. اسلام میں امانت کے وسیع تصور پر تفصیلی مضمون لکھیے۔

(ج) حصہ سوم میں پانچ سوالات ہیں۔ ان میں سے طالب علم کو کوئی تین سوالوں کے جواب دینے ہیں۔ ہر سوال کا جواب تقریبا 500 لفظوں پر مشتمل ہو گا۔ ہر سوال کے لیے 10 نمبر مختص ہیں۔

10. توحید کے معنی و مفہوم پر تفصیلی مضمون لکھیے۔

11. قرآن مجید اور دوسری آسمانی کتابوں کی حیثیت میں فرق بیان کیجیے۔

12. نماز کے لیے طہارت کی اہمیت پر تفصیلی مضمون تحریر کیجیے۔

13. مصارف زکوۃ اور ان کی قسموں پر بحث کیجیے۔

14. والدین کے ساتھ حسن سلوک اور ان کی خدمت کے بارے میں دلائل کے ساتھ لکھیے۔